واجدہ تبسّم

ریلوے بلاک ۱۳۱ فلیٹ نمبر ۱۰
سانتا کروز ویسٹ بمبئی ۵۸

ہوتا یوں ہے کہ جب ایک کتاب چھپنے لگتی ہے تو لکھنے والا (یا لکھنے والی) اپنی موافقت یا مخالفت میں پہلے ہی کچھ لکھ دیتا ہے اور یوں افسانوں، کہانیوں یا ناول سے پہلے رائٹر کی "عرضداشت" چھپ جاتی ہے۔

میری اس کتاب "شہر ممنوع" کے ساتھ قصہ ہی دوسرا ہو گیا۔ میری کتاب چھپ کر آئی، میں نے اسے دیکھا اور پھاڑنے بیٹھ گئی۔ میرے میاں نے بجد منایا کہ خدا کے لئے ایسی حرکت نہ کرو۔ لیکن میں کسی صورت اپنا ہارٹ فیل کروانے پر تیار نہ تھی۔ سارا جھگڑا یہ ہے کہ میرے پبلیشر (اب نام لے کر بیچاروں کو کیا شرمندہ کروں۔) جنھوں نے "شہر ممنوع" کا یہ تیسرا ایڈیشن چھپوایا ہے۔ شائد یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ دنیا میں بس ایک کتاب چھپوا دینا ہی

سب کچھ ہے ۔ اتنی بکواس کتاب چھپی ہے کہ دیکھ جی چاہا جلا دوں۔ کتابت کی غلطیوں سے لے کر چھپائی، کاغذ، ہر ہر چیز اپنی مثال آپ اسی کتاب کا پہلا ایڈیشن لاہور کے نیا ادارہ نے چھاپا تھا، اور ایسا خوبصورت کہ اسے طباعت اور اس کے ظاہری حسن پر انعام تک ملا۔ یہاں یہ حال کہ کتاب چھونے تک کو جی نہ چاہے۔

میں ابھی حال ہی میں امریکہ اور کنیڈا گئی تھی وہاں دکانیں دیکھیں ایسی کہ آنکھیں کھلی کی کھلی رہ جائیں ۔۔۔ ان میں سرفہرست کتابوں کی دکانیں ہیں ۔۔۔ اس قدر خوبصورت اور نفیس کتابیں کہ رشک آجائے۔ پتہ چلا کہ وہاں کتابوں کی چھپائی کا معیار ہی یہ ہے۔ یہ نہیں کہ بڑا رائٹر ہو تو ہی اس کی کتاب خوبصورت چھپے بس رائٹر ہو ۔۔۔ رائٹر کی وہاں بھی بیحد عزت اور قدر ہے۔ (یہاں عام لوگوں کی طرح مجھے یہ رونا نہیں رونا ہے کہ اپنے ہندستان میں لکھنے والوں کی قدر و منزلت کہاں ؟ خدا کے فضل سے مجھے میرے پڑھنے والوں نے بے حساب چاہا ہے۔ بیحد قدر اور چاہت ملی ہے) لیکن ایک چیز یہاں سے بہت بڑھ کر ہے وہاں رائٹر کو EXPLOIT نہیں کیا جاتا۔ گھٹیا سے گھٹیا پبلیشر بھی کتاب کو اس قدر معیاری طور سے چھاپے گا کہ طبیعت خوش ہو جائے ۔۔۔ پتہ نہیں اسمیں ہم لکھنے والے خود

قصوروار ہیں یا واقعی پبلشر زیادتی کر جاتے ہیں ۔ (میں تو خود کو ہی قصوروار ٹھہراؤں گی ـــ۔ اگر میں ہی اپنی کتاب چھاپنے کے لئے اجازت نہ دیتی تو پبلشر صاحب مجھے پھانسی تو نہیں دینے چلے تھے۔)
اب میری پریشانی یہ ہے کہ اس بدقطع کتاب کو کون پڑھے گا اور کیسے پڑھے گا ـــ "کون پڑھے گا"؟ یہ تو میں کہہ سکتی ہوں کہ سینکڑوں لوگ پڑھ لیں گے۔ میرے مجموعوں کے بارے میں کئی لوگ پوچھ چکے اور کتاب کے لئے لکھ چکے ہیں ۔ وہ بارہ روپے کو MIND نہیں کریں گے۔ لیکن کیا یہ زیادتی نہیں ہے کہ اتنی آس سے پڑھنے والا کتاب کھولے اور اسے ابکائی آجائے۔
اب میری سمجھ میں نہیں آرہا ہے کہ میں کروں تو کیا کروں ؟ بس اتنا وعدہ کر سکتی ہوں کہ آئندہ آپ کو میری اتنی خوبصورت کتابیں پڑھنے کو ملیں گی (انشاءاللہ) کہ آپ اس بدصورتی کو بھول جائیں گے۔
۔ ۔ میں نے اس کتاب کے شروع کے چند صفحات تو واقعی ۔ چھپنکے ہیں ـــ خدا کرے یہ کتاب کسی طور آپ کے گلے ۔ جائے ۔ اور میرے میاں کی محنت اور پیسہ جیز ہو جائے ـــ کیونکہ پہلے والے پبلیشر سے انھوں نے ساری کتابیں

خود خریدلی ہیں اور انھیں سجا سنوار کر پھر سے نیا کیا ہے۔
حالانکہ اپنے حسابوں تو وہ بہت سنوار رہے ہیں لیکن میں پھر بھی مطمئن نہیں اس لیئے کہ اب کہانی لکھتے ہوئے میں جس قدر نفاست پسند، حساس اور مغرور ہو جاتی ہوں اس کا کوئی اندازہ لگا ہی نہیں سکتا کہ شہر بھر میں ملنے والا سب سے قیمتی پیڈ مجھے کہانی لکھنے کے لیئے چاہیئے۔ اسی حساب سے قلم ۔ سیاہی ۔ پھر میں لکھتی ہوں تو یوں کہ ایک غلطی نہیں ۔ نہ کانٹ نہ چھانٹ ۔۔۔ تو آپ ہی بتایئے کہ یہ کتاب بھلا مجھے کیا بھائے گی ۔۔۔؟ حقیقت تو یہ ہے کہ اشفاق خود بھی مطمئن نہیں ۔ اور یہ معذرت دراصل اسی لئے میں کر بھی رہی ہوں کہ اگر آپ بھی مطمئن نہ ہوں تو کم سے کم میری مجبوری تو جان لیں۔

واجدہ تبسم ۱۵ راگست ۱۹۷۲ء
بمبئی

واجدہ تبسم

قیمت ۱۲ روپے

ناشر: اورسیز بک سینٹر - بمبئی ۵۸

ایک بات

"میری کہانی" لکھنے سے قبل میری آنکھوں کے سامنے داغ
کا یہ مصرعہ تھا "شرکتِ غم بھی نہیں چاہتی غیرت میری"!
میں نے بہت سوچا۔ بہت سوچا کہ مجھے اپنے حالاتِ زندگی کہنے
چاہئیں یا نہیں۔؟ کیا اس طرح کچھ لکھ دینے کا امکان پیدا ہوتا
ہے۔؟ یا کچھ ملتا بھی ہے۔؟ کچھ بھی ہو۔ میں نے سوچا۔ "کچھ نہ کچھ
تو لکھنا ہی ہے اب۔" اور جہاں تک "شرکتِ غم" کا سوال ہے،
میں نے اپنے دکھڑے اس لئے نہیں روئے کہ کسی کو اپنے غم میں شریک کروں کیونکہ
اب تو غم صرف ماضی بن گیا ہے۔ اور مجھے تو اس غم کی روداد بس
یوں سنانی تھی کہ آپ نے مجھ سے میری افسانہ نگاری کے بارے
میں پوچھا تھا۔ اسی لئے میں اپنے یہ مختصر سے حالاتِ زندگی سنا کر
ذرا بھی شرمندہ نہیں ہوں۔

واجدہ تبسم
۲۹ دسمبر ۱۹۵۹ء، حیدرآباد دکن

میری کہانی

مجھے افسانے لکھتے ہوئے چار سال ہو چکے ہیں۔ میں یہ نہیں کہوں گی کہ میری چار برسوں کی محنت آپ کے سامنے ہے۔ کیونکہ جہاں تک محنت کا سوال ہے، میں نے افسانے لکھنے میں کوئی محنت نہیں کی۔ میں نے تو افسانہ نگاری یوں شروع کی کہ محنت یا کاوش کا کوئی سوال ہی نہ اٹھا۔ مجھے ایک طرح سے اپنی افسانہ نگاری کا ممنون ہونا چاہیئے کہ اس کی وجہ سے میرے دل کا بوجھ ہلکا ہوا۔ میں آپ سے بتاؤں، اگر میں افسانے نہ لکھتی تو یقیناً ایک نہ ایک دن میرا دل پھٹ جاتا۔ لیکن ہوا یوں کہ میں افسانے لکھنے لگی اور دل میں چھپے ہوئے غم اور احساسات جب ایک ایک کر کے لفظوں کی صورت میں ڈھلنے لگے تو میں نے جانا کہ اب میں کبھی نہ مر سکوں گی۔ یہاں میرے ایسا کہنے سے آپ یہ ہرگز نہ سمجھیں کہ اس طرح "میں کبھی نہ مرسکوں گی" جیسے سیدھے سادے جملے میں بتانا چاہ رہی ہوں کہ "اب میں ایسی مانی ہوئی فنکار ہو گئی ہوں کہ مرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں مر گئی تو کیا ہوا۔ میرا فن تو مجھے زندہ رکھے گا۔" جی نہیں، ایسی کوئی خوش فہمی مجھے اپنے متعلق نہیں ہے۔ اور خوش فہمی رہے بھی کیوں؟ ابھی میں نے لکھا ہی کیا ہے۔ ویسے جی چاہتا ضرور ہے کہ اتنی بڑی فنکار بن جاؤ

کہ میرا نام ہمیشہ زندہ رہے۔ دل میں لگن تو موجود ہے ہی۔ مگر اپنی افسانہ نگاری کا خیال آتا ہے تو یوں لگتا ہے کہ بال سے بندھی دو دھاری تلوار سینے پر لٹک رہی ہے۔ اب گری کہ اب گری۔ یہ چار سال اسی دھک دھکاہٹ میں گزرے ہیں۔ کیا پتہ یہ تلوار کب گر جائے اور یوں قصّہ پاک ہو جائے۔ کانٹوں بھری اس راہ پر چلتے ہوئے کئی بار میں نے یوں محسوس کیا ہے کہ ابھی ابھی گر پڑوں گی۔ مگر سخت جان ایسی تھی کہ کبھی نہ مر سکی۔ جی ہاں کہہ لیجیئے کہ "سچ مچ واجدہ تم بڑی بزدل لڑکی ہو۔" لیکن آپ کے کہہ دینے سے کیا ہوگا۔ ساحل سے کبھی اندازۂ طوفاں لگایا جا سکا ہے۔ آپ نے مجھے بزدل کہہ دیا۔ اور میں نے مان بھی لیا۔ لیکن اس ایک لفظ 'بزدل' کے پیچھے جو ایک لمبی چوڑی داستان چھپی ہے۔ اسے سنکر آپ کیا فیصلہ کریں گے۔؟

ان چار سالوں میں کئی کئی بار مجھ سے میرے حالاتِ زندگی جاننے کی فرمائش کی گئی۔ اس جذبے کی تلاش اور جستجو کی گئی جو میری افسانہ نگاری کا محرک بنا۔ ہمیشہ نوٹالتی گئی۔ سوچتی ہوں آج موقع آیا ہے تو کہتی ہی چلوں۔ پھر آپ میں سے جو مجھے بزدل کہہ رہے ہیں خود ہی فیصلہ کریں گے کہ حق پر کون تھا۔ لیکن اب جب کہ اپنے حالاتِ زندگی اور افسانہ نگاری کے بارے میں "کچھ" لکھنے بیٹھی ہوں تو بری طرح ہنسی آ رہی ہے۔ مجھ ایسی لڑکی کے حالاتِ زندگی۔ اور پھر افسانہ نگاری۔ ؟ حالاتِ زندگی ہی تو کمبخت ایسے تھے جنہوں نے افسانہ نگاری پر مجبور کر دیا۔

مگر اب خیال آتا ہے کہ اس طرح تو وہ راز بھی کھول دینے پڑینگے جو دل بن کر سینے میں دھڑک رہے ہیں، آنسو بن کر آنکھوں میں مچلتے رہے ہیں۔ اور مسکراہٹ بن کر ہونٹوں پر بکھر بکھر گئے ہیں۔ مگر آپ ہیں کہ آج ان آنسوؤں اور مسکراہٹوں کا حساب لے کر ہی رہیں گے۔

اپنی چھپا چھو کو کوئی گوالن کھٹا نہیں کہتی۔ مگر میں وہ بے رحم لقاد ہوں جو کبھی جانب داری سے کام نہیں لیتا۔ پھر میں آپ کے سامنے یہ کیوں کہوں کہ میرا ماحول میرے لئے بڑا ساز گار تھا۔؟ اگر میں یہ جھوٹ کہہ بھی دوں تو میری کہانیاں چغلی کھا دیں گی۔ پھر میں سچائی سے کام کیوں نہ لوں۔؟

میرا گھرانا سیّدوں کا وہ گھرانا تھا۔ (جی ہاں صیغۂ ماضی۔ کیونکہ اب تو ہم نے بقول کسے "فارورڈ" ہو کر بزرگوں کی ناک کاٹ ڈالی ہے) جہاں پردے کی سخت قید و بند تھی اور لڑکیوں کی کسی قسم کی آزادی کا تصور ہی ناممکن تھا۔ حد یہ ہے کہ میرے بابا نے ہم بہنوں کو اسی لئے اسکول میں داخل نہ کروایا کہ "لڑکیاں اسکولوں میں پڑھ لکھ کر آوارہ ہو جاتی ہیں۔" تین سال کی عمر میں جب ہمارے سروں سے ماں اور باپ دونوں کا سایہ اٹھ گیا تو پھر چچا نے نانی اماں سے بڑی منتیں کیں اور یوں ہمیں اسکول میں داخلہ مل گیا۔

بات یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی، کیونکہ اس طرح تو ہماری
نگرانی کی اور زیادہ ضرورت تھی۔ (کیا پتہ ہم کب پڑھ لکھ کر آوارہ
ہو جانے) اور وہ خوب ضرورت کی بھی جاتی تھی۔ ہماری بہنوں میں
جو بہن تیسرے نمبر پہ تھی، وہ بڑی ذہین اور ذرا خود سر قسم کی تھی۔
اسے جب اسکول میں داخل کروایا تھا اس وقت اس کی عمر صرف
تین سال تھی۔ ٹھیک سے بات کرنی بھی اسے نہ آتی تھی۔ مگر قصے
کہانیاں پڑھنے کا اسے وہ شوق تھا کہ پوچھئے نہیں۔ ظاہر ہے ابھی
الف بے بھی ٹھیک سے یاد نہ تھی تو پڑھنے کا سوال ہی کہاں پیدا
ہوتا تھا، مگر جوں جوں وہ پڑھنا سیکھتی گئی اس کا یہ شوق پختہ
ہوتا گیا۔

ان دنوں ہمارے ہاں بہت سارے رسالے آیا کرتے تھے۔
'شمع' سے لیکر 'جمالستان'، 'آریہ ورت'، اور 'کامیاب' تک۔ اور
اسی قسم کے اور کئی دوسرے پرچے۔ میں ہر پرچہ الف سے لے کر بے
تک چاٹ جایا کرتی۔ جنون یہیں پر ختم نہ تھا۔ گھر کا ماہانہ سودا سلف
جن کاغذوں میں، رسالوں کے پھٹے ہوئے صفحوں میں بند ہو کر آتا
تھا وہ میرے لئے سب سے بڑی دلچسپی تھے۔ میں وہ سارے
کاغذ سمیٹ کر کونے میں جا بیٹھتی اور ہر ادھورا اور مکمل
مضمون پڑھ ڈالتی۔ میرا دل چاہا کرتا ساری دنیا کا علم گھول
کر پی جاؤں۔ جی نہیں میں نے غلط کہا، یہ "علم" والی ترکیب تو میں

اب، یعنی ایم۔ اے ہوکر بگھار سکتی ہوں۔ ؛ ان دنوں میں جو تھی یا پانچویں میں پڑھتی تھی اور علم کا کوئی واضح تصور اپنے ذہن میں نہ رکھتی تھی۔ یوں کہیے ہر تحریر پڑھ جانے کی دل میں تمنا رکھتی تھی۔ چاہے وہ کیسی ہی گری پڑی کیوں نہ ہوتی۔

ابھی تک تو میں آپ کو صرف اپنے شوق کے بارے میں بتاتی آرہی ہوں، ابھی میں نے آپ کو اپنے "حالات" کے بارے میں کچھ نہیں بتایا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ میں ان دونوں چیزوں کو، یعنی حالات زندگی اور افسانہ نگاری کو، الگ الگ کر بھی نہیں سکتی۔ میرا دل چاہا کرتا کہ کبھی بازار جاؤں اور اچھی اچھی کہانیوں والی کتابیں خرید لاؤں مگر شاید آپ کو میں نے یہ نہیں بتایا ہے کہ پیسہ ان دنوں سورج ہوا کرتا تھا۔ ؛ دور سے جھلک دکھانے والا۔ جس کی کتنی ہی تمنا کریں ہاتھ نہیں آسکتا۔ بڑی عجیب بات تو یہ ہے جناب کہ دیکھتے ہوئے عجیب سا لگتا ہے) میری امی ایک نواب خاندان سے تھیں۔ ابا شہر کے سب سے بڑے وکیل تھے۔ مجھے نہیں پتہ۔ مگر میں بچپن سے سنتی آرہی ہوں کہ انہوں نے لاکھوں سے روپیہ کمایا۔ کمایا بھی اور گنوایا بھی۔ اور جب مرے ہیں اس وقت دفنانے کو بھی کچھ نہ تھا۔ امی کی بات نہ پوچھیے، وہ تو بڑی رئیس تھیں۔ جہیز میں ڈھیروں سونے کے علاوہ وہ پانچ گاؤں ساتھ لائی تھیں۔ نانی اماں آج بھی کہتی ہیں کہ " اگر میں نے اس سونے کا آدھوں آدھ بھی اٹھا کر رکھ دیا

ہوتا تو میری چاروں نواسیاں اور بہوئیں سونے میں پیلی رہتیں۔
(ہم آٹھ بہن بھائی ہیں) مگر نانی اماں نے تو ایک ملشے کا تار بھی اٹھا
کر نہ رکھا۔ یہ گھپلا بچپن تک تو کبھی میری سمجھ میں نہ آیا۔ مگر آج
تو ہر ہر بات آئینہ کی طرح روشن ہے۔ پہلے میری امّی مریں۔
(اس وقت میں ایک سال کی تھی) اس کے دو سال بعد میرے
ابّا بھی چل دیئے (اچھے لوگ تھے بے چارے، جو ہر فکر سے آزاد
ہو گئے) میں نے آپ سے ابھی بتایا ہے ناکہ میرے ابّا بہت فضول
خرچ تھے۔ اپنی کمائی تو گنوائی ہی گنوائی، امی کا جہیز بھی گنوایا۔
قرضوں کے ڈھیر لے رکھے تھے۔ جانے کتنا قرضہ تھا کہ ساری دولت
چپ چپاتے غائب ہو گئی۔ نانی اماں یوں نہ کرتیں تو جانے اس عزت
کا کیا حشر ہو جاتا جو برسوں سے "خاندانِ سادات" کے سر پہ
تاج بن کر جگمگاتی رہی تھی۔ میں نے آپ سے کہا تا کہ کیا مرے
تو کفن بھی دوسروں سے لے پہنایا۔ جب یہ صورت حال نظر آئی
تو ظاہر ہے سب رشتے دار سناٹے میں آ گئے۔ اور ایک ایک کر
کے کھسکنے لگے (رشتہ دار تک بھول نہ جڑھائیں۔ میں تو صرف
اپنی کہانی سنا رہی ہوں) جب گھر خالی رہ گیا تو صرف ہم چار
بہنیں اور چار بھائی تھے جنہیں سوائے نانی اماں کے اور
کسی کا آسرا اور سہارا نہ تھا۔
نانی اماں کا یہ حال تھا کہ وہ اپنے گھر میں دو پیوں پر چلتی تھیں۔

(یہ مبالغہ نہیں، افسانوی تراش نہیں، حقیقت ہے!) بے حساب تھیلیوں میں بے حساب روپیے ہوتے اور انہیں جگہ نہ ہونے کے کارن کوٹھری میں اناج کے بوروں کی طرح اوپر تلے ٹھونس دیا جاتا۔ اب وہی نانی اماں رہے سہے زیور کو توڑ توڑ کر ہماری تعلیم تربیت کر رہی تھیں۔ گاؤں سے زمینوں کا پیسہ کبھی آجاتا تھا۔ اور یوں زندگی گزر رہی تھی۔ بڑی بے رنگی اور بے دلی سے عموماً ہم لوگ جوار کی روٹی اور دال کھاتے تھے اور اپنے اپنے لئے لڑکائے انگریزی پڑھنے اسکول میں جاتے تھے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کیمپ والی سیمنٹ روڈ پر سے جب ہم مڑتے تھے تو لال گرجا کے پاس ایک بہت اونچا بنگلہ تھا۔ بنگلے کے پھاٹک پر ہری بھری بیل جھومتی تھی جس میں سرخ رنگ کے پھولوں کے بے حساب گچھے لٹک رہے ہوتے۔ رنگ برنگے پھولوں کے گملوں کی دو رویہ قطار دور تک چل کر پھاٹک سے مل جاتی۔ پورٹیکو میں گہرے نیلے رنگ کی لمبی سی کار کھڑی ہوا کرتی اور عین ہمارے وہاں سے گزرنے کے ٹائم تین چار بچے، ہنستے، اچھلتے پردے جھلاتے ڈرائنگ روم سے باہر آتے اور قہقہے لگاتے ہوئے کار میں چڑھ جاتے۔ ان کے پیچھے پیچھے ان کی آیا۔ ساروں کے بستے سمیٹے، فرسٹ سیٹ میں بیٹھ جاتی اور کار زوں زوں کرتی یہ جا وہ جا۔ سڑک پر ہلکی سی گرد اڑتی اور وہ خاک ہمارے حلق میں پہنچتی۔ میرے بستے کا بوجھ میری جان لے ڈالتا اور سیمنٹ روڈ پر چلتے چلتے میں سوچنے لگتی کہ مروں گی تو اپنی قبر پہ کیسا کتبہ لگواؤں گی۔

"یہاں وہ دل دفن ہے جو زندگی بھر خوشی کے لئے روتا رہا"

تو جناب میں آپ سے بتا رہی تھی کہ صورتِ حال یہ تھی تو کتابوں کے لئے روپے کہاں سے آتے؟ نانی اماں بے چاری کا تو ناطقہ بند تھا۔ کبھی نہ کبھی ایک آدھ بہن بھائی اڑ جاتا۔

"میں تو انڈا کھاؤں گا۔"

"اوں اوں — میں تو گھی شکر کھاؤں گی۔"

نانی اماں کہتیں "گھی شکر! یہ کون بڑی بات ہے۔ اگر بچو میں تو گھی شکر چوہے سے مانگ کر لایا کرتی ہوں۔ اور اس چوہے کو بچے بہت ناپسند ہیں۔ بس تم اوپر چلے جاؤ۔ یا پھر اپنی آنکھیں بند کر لو۔" ہم اپنی آنکھیں بند کر لیتے اور تھوڑی دیر میں ہمارے سامنے سچ مچ رکابی میں گھی شکر موجود۔ اگر ہم میں سے کبھی کسی نے گھی کھایا ہو تو اصلیت بھانپ جاتا۔ مگر ہم تو سچ مچ ہی بچے تھے پتہ نہیں کیسے۔ بہت دنوں بعد، ایک دن یہ بھید کھل گیا کہ وہ چوہے ماموں بے [illegible] کم بخت ہمیشہ گھی کی بجائے پانی کھلاتے رہے۔ پتہ نہیں کتنا پانی اور شکر یہ گھی شکر کے دھوکے میں کھاتے رہے۔

میں تو کبھی ایک پیسے کی کتاب بھی اپنے لئے نہ خرید سکی۔!! کبھی نانی اماں سے کہا بھی تو انہوں نے بڑی صفائی سے ٹال دیا۔ "اچھی بیٹیاں کتابیں نہیں پڑھا کرتیں۔" اور یوں بھی ان کی تنبیہہ ہماری ہی رہتی تھی کہ الا بلا نہ پڑھا کرو۔ لیکن یہ نوبت ہی ابھی [illegible] نہ بنی تھی کہ ایک حادثہ ہو گیا۔ ہماری ماما غائب ہو گئی۔ کھانا پکانے کی سخت مشکل جا رہی تھی۔ نانی اماں ہر کسی سے کہا کرتیں کہ "ایک ماما لا دو۔ مجھ سے تو اتنے سارے بچوں کی دیکھ بھال ہی نہیں ہوتی، کھانا کیسے پکاؤں۔؟"

مامائیں لائی جاتیں اور کسی نہ کسی وجہ سے رجکٹ کر دی جاتیں
ایک دن مغرب کے بعد نانی اماں صحن میں بیٹھی کی بھاجی توڑتی بیٹھی تھیں
بھیا لوگ تخت پر ہوم ورک کرنے بیٹھے تھے۔ بہنیں پڑھ رہی تھیں۔
اور میں شطرنجی پر سر نہوڑائے، پنسل منہ میں دبائے بہت انہماک سے
بیٹھی حساب حل کر رہی تھی۔ اسی دم کسی نے ایک ماما کو باہر سے
بھجوایا۔ نانی اماں حسبِ معمول جرح میں مشغول ہو گئیں۔ میں نے یونہی
ایک بار سر اٹھا کر دیکھا، ماما کی گود میں ڈیڑھ دو برس کا بچہ بھی لٹکا ہوا تھا۔
میں پھر کاپی پر جھک گئی۔

نانی اماں نے اِدھر اُدھر کے مختلف سوالوں کے بعد پوچھا۔

"تمہارا مرد کیا کام کرتا ہے۔"

"مرد تو چار سال ہوئے مر گیا۔"

میں نے لیمپ کی روشنی سے نگاہیں ہٹا کر ماما کو دیکھا۔ کاپی بند کی
پنسل نیچے رکھی اور برآمدے میں آ کر بڑے معتبر انداز میں بولی۔

"کیوں جی! تمہارا مرد تو مر گیا، پھر یہ بچہ کہاں سے آیا۔؟" (میری
عمر اس وقت آٹھ یا نو سال رہی ہوگی۔)

پتہ نہیں اس سوال میں کون سے دھماکے کا اثر تھا کہ نانی اماں اکدم
بھونچک رہ گئیں۔ پہلے تو انہوں نے دیدے پٹ پٹا کر اپنے نواسوں کو
دیکھا، پھر اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں، پھر چلا کر کہا۔ "اور پڑھنے بد
اسے رسالے۔"

میں اکدم چکرا گئی۔ اپنے سوال کی نوعیت پہ غور کیا تو کوئی برائی
اس میں نظر نہ آئی۔ میں ابھی سراسیمہ سی کھڑی تھی کہ نانی اماں گرجیں۔

"آج سے میرے ہاتھ میں کوئی رسالہ دیکھوں۔"
میری سمجھ میں خاک بھی نہ آیا کہ مجھے اتنی بڑی سزا کیوں ملی۔ نانی اماں سمجھانے لگیں اور میں بہت ڈرنے لگی۔ میرے ایک بڑے بھیا ہمیشہ میری سائڈ میں رہتے تھے۔ اگر کبھی نانی اماں پڑھنے کو منع کرتیں تو ہمیشہ کہا کرتے۔
"نانی اماں اسے پڑھنے سے نہ روکئے۔ بہت ذہین ہے۔ آگے چل کر یہ خود بھی کہانیاں لکھنے لگی۔" اب نانی اماں انہی کے پیچھے پڑ گئیں کہ ابھی سے یہ حال ہے تو آگے جا کر کیا ہوگا۔ شاید وہ بھی لاجواب ہو گئے مگر میں رات گئے تک بستر میں جاگتی رہی اور تمام رات لیٹی رہی۔ میری سمجھ میں پھر بھی نہ آیا کہ میں نے ایک جملہ میں کون سا گناہ کر ڈالا تھا۔ (اب سوچتی ہوں تو ہنسی آتی ہے۔ بچپن میں ہم کس قدر بے باک ہوتے ہیں!)
اس دن سے خوشیوں کے دروازے مجھ پر بند ہو گئے۔ اور میری خوشیاں ہی کیا تھیں؟ پڑھنا — پڑھنا — بس پڑھنا — اب یوں ہونے لگا کہ جہاں میں نظروں سے ذرا اوجھل ہوئی نانی اماں نے پکارنا شروع کیا۔
"وہ بدذات کدھر ہے؟ کہاں غائب ہو گئی۔"
میں نے ابھی آپ سے بتایا تھا کہ میں ان دنوں بہت سوچتی تھی کہ اپنی قبر پر کیا کتبہ لگواؤں گی۔
"یہاں وہ پھول دفن ہے جو کھلنے سے پہلے ہی بہار میں مرجھا گیا۔"
میں بچپن ہی سے غیر معمولی حساس ہوں۔ جس بات کو آپ بھول کر بھی اہمیت نہ دیں، میں اسی بات پر گھنٹوں روتی ہوں۔ آج بھی میری یہی فطرت اور عادت ہے۔ اس دلِ حساس نے مجھے اتنا رلایا ہے مگر

پھر بھی مجھے اپنی فطرت کا یہ پہلو پسند ہے۔ میں جانتی ہوں اس کے بارے ہوں (ایک دن میں یونہی غلطی سے ایک چیونٹی کو مار بیٹھی۔ قصور میرا تھا بھی نہیں۔ وہ میرے پیر تلے آ گئی۔ بیٹھے بیٹھے میں نے یونہی پیر ہٹایا تو وہاں مری ہوئی چیونٹی پڑی تھی۔ اس حادثے نے مجھے تین دن تک ملول رکھا۔ پتہ نہیں اس کے کتنے بچے ہوں؟ اس کے منہ میں شکر کا دانہ بھی تو تھا۔ اب کون اس کی جگہ لے سکے گا۔۔)

اب مجھے اپنے سائے سے بھی ڈر ڈر کر چلنا پڑتا تھا۔ میں جہاں بھی تنہائی پاتی فوراً ادھر کا رخ کر لیتی۔ ہمارا گھر بہت بڑا تھا۔ تین منزلہ۔ ادھر ادھر بڑے بڑے آنگن۔ برآمدے۔ دالان۔ کافی جگہیں ایسی تھیں جہاں میں چوری چھپے پڑھ سکتی۔ مگر ان دنوں کے بعد مجھے بہت کم موقعے ملتے کہ میں نانی اماں کی نگاہوں سے غائب ہو سکتی۔ میرے ایک بھائی تھے۔ سگریٹ کے شوقین تھے۔ ان کا ڈھنگ بھی نرالا تھا۔ نانی اماں کے ڈر سے وہ اس طرح سگریٹ نوشی کرتے کہ خود کو رضائی میں بالکل چھپا لیتے اور اندر مزے سے سگریٹ دھونکتے رہتے۔ (ان کی اس چوری کا راز یوں کھلا تھا کہ مہربان نے ایک بار رضائی جلا ڈالی تھی۔۔) ایک دن میں نے غور سے انہیں دیکھا اور خود بھی اسی ترکیب پر عمل کرنے لگی۔ مگر ہوتا یوں تھا کہ اس طرح سر سے پیر تک خود کو ڈھانک لینے سے ایک تو دم گھٹنے لگتا تھا۔ دوسرے "کمرے" میں اندھیرا بہت ہو جاتا تھا اور الفاظ نظر نہ آتے تھے۔ میں نے اس کے لئے ٹارچ کا انتظام کیا تھا۔ مگر ایک بار یوں ہوا کہ رضائی نے بھانڈا پھوڑ دیا۔ رضائی میں جگہ جگہ سے روئی ہٹ گئی تھی اور یوں روشنی چھن چھن کر باہر جھانکنے لگی تو ۔۔۔ انجام

ظاہر ہے۔ مگر ایسی ویسی باتوں سے ہار جانا تو گویا میرے ذوق کی توہین تھی۔ میرا ذہن نت نئے طریقے ایجاد کر لیا کرتا تھا۔ پڑھائی کے سلسلے میں مجھے کبھی کسی اہتمام کی ضرورت نہ پڑی۔ ہمیشہ سے میرا اصول رہا ہے کہ امتحان سے چند دنوں پہلے ایک دو بار گہری توجہ سے پوری کتابیں دیکھ ڈالیں اور بس معاملہ ختم مگر میں گھر والوں پر یوں ظاہر کرتی تھی کہ جیسے میں بڑی ہی (Book worm) بڑی ہی پڑھاکو ہوں۔ جب دیکھو تب کتاب منہ سے لگی ہے۔ (یہ مدتوں کا راز ایک دن کھل ہی گیا) میں کرتی یہ تھی کہ کورس کی کتابوں یا کاپیوں میں اندر ناول اور رسالے رکھ رکھ کر پڑھا کرتی تھی۔ اگر کوئی دیکھتا تو یہی سمجھتا کہ میں بڑے انہماک سے امتحان کی تیاری میں مشغول ہوں، مگر میں تو دوسرے ہی امتحان کی تیاریاں کیا کرتی تھی۔ حد یہ ہے (ممکن ہے آپ میں سے بہت سے یقین کریں بھی ناں) کہ عین امتحان کے دنوں میں بھی ناول پڑھا کرتی۔ بدبختی نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ ایک دن ایک رسالہ کاپی میں چھپا کر پڑھ رہی تھی۔ کسی نے مجھے کوئی کام بتایا۔ میں نے یونہی رسالہ اور کاپی زمین پر رکھ دی اور باہر چلی گئی۔ کاپی پتلی تھی اچانک ہوا کے ایک تیز جھونکے سے اڑ کر دور جا پڑی اور رسالہ نمایاں ہو گیا۔ کسی مہربان سہیلی نے یہ واردات نانی اماں سے جا بتائی نانی اماں نے اتنا مارا کہ میرا بے ہوش ہونا باقی رہ گیا۔ یہی میری زندگی تھی۔ یہی میرے ذوق و شوق کا انعام۔!!

میں ان دنوں زندگی سے سخت بددل ہو رہی تھی۔ انہی دنوں مجھ پر ٹائیفائیڈ کا شدید حملہ ہوا۔

میرے بابا بہت ہی حسین و جمیل آدمی تھے۔ خاندان بھر میں تو ان سا کوئی تھا ہی نہیں۔ سڑک پر بھی نکل جاتے تو لوگ پلٹ پلٹ کر دیکھتے رہتے امی حسین نہیں تھیں۔ رنگ سانولا تھا، بال لمبے لمبے تھے۔ مگر ان کی آنکھیں غضب کی تھیں۔ اتنی روشن آنکھیں کہ آنکھوں کا اجالا، گالوں پر پڑتا تھا۔ میں نے تو انہیں اسی کو نہیں دیکھا، ان کی تصویر بھی نہیں ہے۔ ہاں کہنے والے کہتے ہیں کہ اتنی اچھی آنکھیں کسی کہانی کی خیالی ہیروئن کی ہو سکتی ہیں۔ ان دونوں کے میل سے جو بچے ہوئے وہ بھی کچھ کم نہیں تھے۔ مگر شاید میری بدنصیبی تھی کہ اپنے سب بہن بھائیوں میں معمولی میں تھی۔ اور مزید ستم یہ کہ بچپن ہی سے بیمار رہتی چلی آرہی تھی۔ تندرست اور نک سک سے درست بہن بھائیوں میں ایک میں ہی تھی جس کا رنگ سانولا تھا، جسم دبلا پتلا، کمر سے نیچے جاتے ہوئے بال اور بجھی بجھی آنکھیں۔ قد کی مناسبت سے بال بہت ہی لمبے نظر آتے۔ یوں سب لوگ مجھے چڑیل یا کالی بلی کہہ کہہ کر ستایا کرتے۔ میں شدید احساس کمتری میں مبتلا تھی۔ یہی وجہ تھی کہ ہم عمروں سے محبت نہ پاکر میں نے اپنی تنہائیوں کا ساتھی کتابوں کو بنایا تھا۔

(یہ بات تو مجھے بہت پہلے ہی کہہ دینی چاہیے تھی)

بیماری جمیل کر اٹھتی تو اور زیادہ چڑچڑی اور زود رنج ہوتی گئی۔ احساس دگنا ہو گیا۔ زندگی تلخ ہو گئی۔ میں آپ سے نہاؤں، ان دنوں کتابوں کا سہارا نہ ملا ہوتا تو آج میں یہ سب کچھ نہ لکھ رہی ہوتی۔

سب طرف سے ہار کر میں نے مطالعہ میں جی لگایا۔ اس طرح لامحالہ میں کلاس میں فرسٹ رہنے لگی۔ استانیاں بہت خوش رہتیں۔

میں نے انہی ذہانت سے ایک ناجائز فائدہ یہ اٹھایا کہ مس سے یہ پرمشن حاصل کر لی کہ میں لائبریری سے جتنی چاہوں اتنی کتابیں لے لیا کروں۔ میری زندگی ہمیشہ سے بے حد فاسٹ رہی ہے۔ دو تین سو صفحوں کی کتاب ایک ڈیڑھ گھنٹے میں ختم کر ڈالتی ہوں۔ مس کو اس پر کوئی اعتراض نہ تھا! اور یہ میری زندگی کی سب سے پہلی خوشی تھی۔ معصوم مسرت :

ہم لوگ چونکہ بہت غریب تھے اس لئے پیدل ہی اسکول جایا کرتے غریبی میں لوگ اپنے بچاؤ کے کیسے کیسے جواز ڈھونڈھ نکالتے ہیں۔ اگر کبھی ہم نے پیروں میں درد کی شکایت کی تو نانی اماں نے جھوٹ کہہ دیا۔

"پیدل چلنے سے صحت اچھی رہتی ہے۔"

کتابوں کا لالچ مجھے مارے ڈالتا۔ پاؤں پاؤں چلتے چلتے میرے چھوٹے چھوٹے پیر دکھ کر رہ جاتے۔ اس پر مزید کوشش یہ کہ جلد سے جلد اسکول پہنچ جاؤں، تاکہ خوب پڑھ سکوں۔ سیمنٹ روڈ والے بنگلے سے جب کار چکر کھاتی نکلتی تو دل کو پختہ یقین ہو جاتا کہ اللہ میاں چونکہ بوڑھے ہو چکے ہیں اس لئے انہیں اب دنیا کا انتظام چلانا نہیں سوجھتا۔ بہ تک یاد نہیں کہ کسے موٹر کی ضرورت ہے اور کسے نہیں۔ خوب ہیں اللہ میاں آپ بھی۔

میں تو بس یہی سوچتی ہوں کہ خداوندِ دو عالم نے میرے نصیب میں کتنی کم خوشیاں رکھی ہیں۔ کچھ ہی دنوں بعد ملک تقسیم ہو گیا۔ ۱۹۴۷ء کی آمد اور ہمارا وطن چھوڑ کر حیدرآباد آنا۔ یہ زندگی کا بڑا عجیب موڑ ہے۔ یہاں پہنچ کر تو زندگی کے ستم کچھ اور بھی سوا ہو گئے۔

اب ہم بہنوں نے مڈل اسکول پاس کر لیا تھا۔ بھیا لوگ کالجوں

کو جاتے تھے۔ اخراجات پہلے سے زیادہ تھے اور ذرائع آمدنی پہلے سے کہیں کم۔ میں بہت چھوٹی تھی اس وقت نانی اماں کے ہاتھوں میں سونے کی چوڑیوں کا بھرواں جوڑا تھا۔ ۶۰ تولے کا۔ ساٹھ تولے کی کوئی حقیقت نہیں۔ نانی اماں نے جب ضرورت پڑی ایک ایک چوڑی توڑ ڈالی مجھے یاد ہے ہر بار جب سرونٹ لے کر نانی اماں اندھیرے کمرے میں جایا کرتی تھیں تو ان کے چہرے پر کوئی تاثر نہ ہوتا تھا۔ مگر مجھے یوں لگتا تھا چوڑی کے ساتھ میرا دل بھی کٹ جائے گا۔ کتنی بار چوڑیاں ٹوٹیں۔ کتنی بار دل کٹا۔ مگر اب تو زیور بھی نہ تھا جس کو توڑ تاڑ کر اخراجات پورے کئے جاتے۔ لے دے کر گاؤں اور زمینات کی چند ہزار کی آمدنی رہ گئی تھی۔ جس سے سال بھر تک خرچ چلتا۔ زمینداری سسٹم لاگو ہوا تو وہ زمینات بھی حکومت کے بھاگ میں چلی گئیں ــــ!

(سنتے ہیں زیور سنگھار کے کام آتا ہے۔ ہمارا زیور تو سدا رہن رکھنے یا توڑ نے کے کام ہی آیا۔!)

پارٹیشن کے وقت میری عمر گیارہ بارہ سال تھی۔ امراؤتی سے حیدرآباد دکن تک کا سفر ہم نے تیرہ دن میں طے کیا۔ ان تیرہ دنوں میں میں نے تیرہ صدیوں کا تجربہ سمیٹا ہے۔ میں کس قدر بوڑھی ہوں۔ اس کا احساس سوائے میرے اور کس کو ہو سکتا ہے۔ حیدرآباد آ کر ہم نے جو مصیبتیں جھیلیں اس کا اندازہ آپ یوں لگائیے کہ اب تک جیسے ہم شاہی زندگی گذارتے آرہے تھے۔ مصیبتیں کیا ہوتی ہیں۔ اس کا پتہ یہاں آ کر چلا۔ ہمارے پاس کھانے کو اناج نہ تھا۔ پہننے کو کپڑے نہ تھے۔ رہنے کو مکان نہ تھا۔ پھر بھی ہم جی رہے تھے اور خوش تھے۔ کتابیں خریدنے کو پیسے

نہ ہوتے تھے۔ فیس کا وقت آتا تو ہم کلاسوں سے باہر کھڑے کر دیئے جاتے
ان دنوں میں نویں کلاس میں تھی کلاس کی سب سے ننھی طالبہ تھی اور
سب سے ذہین۔ سب سے غریب اور سب سے زیادہ بدنصیب۔ !!
حیدرآباد آکر سب سے بڑی بدنصیبی یہ رہی کہ میرا مطالعہ جیسے ختم
ہو کر رہ گیا۔ لائبریری میں اس قدر اچھی اچھی کتابیں تھیں !!
اے زر تو خدا نیست ولے۔
نویں کلاس میں ایک لڑکی تھی۔ اپنی آنکھوں لمبے بالوں، سانولی
رنگت اور میٹھی آواز کی وجہ سے کلاس بھر میں وہ "بنگالی مینا" کے نام
سے مشہور تھی۔ استانیاں پیار سے اسے "خوش آواز پرندہ" کہا کرتیں۔
تو سہیلیاں اسے "بلبل" یا "کوئل" کہہ کر پکارتیں۔
وہ خوش آواز پرندہ میں تھا! بلبلے اوروں سے اپنے بارے
میں بہت سنا تھا لیکن کبھی محسوس نہ کیا تھا۔ ایک دن میں اپنی کرسی
پر بیٹھی بے دلی سے کچھ گنگنا رہی تھی۔ میرے بازو والے ڈیسک پر ایک لڑکی
بیٹھی لائبریری سے لی ہوئی کتاب پڑھ رہی تھی۔ مجھے گنگناتا سن اس نے
کتاب بند کر دی اور کہا۔
"واحدہ ذرا زور سے تو بھی گاؤ۔"
میری نگاہ کتاب سے جا ٹکرائی۔ وہ منشی پریم چند کا ناول "گئودان"
تھا۔ میں نے ذرا جھجک کر کہا۔
"ایک شرط پر۔"
"کون سی شرط۔؟" وہ حیران ہو کر بولی۔
"میں تمہیں گا سناؤں گی اور تم بدلے کے طور پر مجھے یہ کتاب

پڑھنے کو دوں گی۔"

شرط ایسی کوئی کڑی نہ لگی اسے۔ میں نے اسے ایک فلمی گیت سنایا۔ نگری میری کب تک یونہی برباد رہے گی۔ اور پھر غالب کی وہ مشہور غزل ___ نسکیں کو ہم نہ روئیں جو...... کتاب میرے ہاتھوں میں تھی۔!

یہ سودا مجھے بہت سستا پڑا۔ کیونکہ اس طرح گانا سنا دینے سے میرا کچھ نہ بگڑتا تھا مگر مجھے بدلے میں کتابیں مل جایا کرتیں۔ پانچویں، چھٹی ساتویں، آٹھویں اور نویں کلاس کی تمام لڑکیوں سے یہی سودا نپٹنے لگا۔ جتنی کتابیں میں نے ان دنوں پڑھیں۔ ان کی تعداد بتانی مشکل ہے۔ دنیا اتنی وسیع ہے؛ کتنے ہی رائٹرز گذرے ہیں جنہوں نے کیا کچھ نہیں لکھا ہے؛ میں نے کیا پڑھا؛ کچھ نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔ مگر اپنے نامساعد حالات کے باوجود میں نے جتنا کچھ پڑھ لیا ہے اس پر فخر کرتی ہوں۔ (حالانکہ میں نے سمندر سے قطرہ بھی نہیں اٹھایا ہے۔)

پھر پولیس ایکشن ہوا۔ پھر سے شہر میں بھگدڑ مچی۔ ایک بھیا پاکستان چل دیئے۔ ایک آگے ہی وطن میں تعلیم پوری کرنے چلے گئے تھے نہ دماغی چین تھا، نہ جسمانی آرام۔ ہوا یہ کہ نتیجہ میں ہم بہنوں کو اسکول سے اٹھا لیا گیا۔

"کیا میں یونہی جاہل رہ جاؤں گی۔؟" یہ سوال رہ رہ کے میرے مجروح دل اور دماغ کو کچوکے دیتا۔ مجھے تو تعلیم حاصل کرنے کا بچپن ہی سے اتنا شوق تھا کہ جہاں دوسری بہنیں گڑیاں اور ہنڈ کلیا کھیلا کرتیں میں محلے کے بچوں کو لے کر اسکول لگایا کرتی۔ پھر اللہ میاں کا یہ ستم کیسا تھا۔ نانی اماں سمجھاتیں۔

"بیٹا تم لوگ نیک ہو۔ اللہ کے پیارے۔ اور اللہ انہی کو آزمائش میں ڈالتا ہے جو اسے پیارے ہوتے ہیں۔"

اللہ میاں سے اسی مارے بچپن سے ٹھنی رہی۔ نماز آج بھی پنج وقتہ پڑھتی ہوں۔ ہمیشہ نماز پڑھ کر یوں محسوس ہوا گویا اللہ پر احسان فرمایا ہے۔
"دیکھ لینا آپ تو ہمارے لئے کچھ نہیں کرتے مگر ہم آپ کے حضور سر جھکائے جاتے ہیں۔"

نانی اماں حج کر آئی ہیں۔ جب کبھی خدا کو برا کہا انہوں نے کان پکڑوا کر توبہ کروائی اور ہمارے گناہوں کی معافی خود مانگی۔ مگر اللہ میاں کو "نا انصاف" کا خطاب جو میں نے بچپن میں دیا تھا کبھی واپس نہ لیا۔

"بس فیس" میں دیر ہوئی تو اسکول کی بس آنی بند ہوئی۔ کلاس فیس میں دیر ہوئی تو پہلے کلاس باہر، پھر اسکول باہر۔ چلئے قصہ ختم۔ میٹرک، پھر ایف۔ اے، پھر بی۔ اے اور اب ایم۔ اے سب پرائیویٹ پڑھانے والا کوئی نہیں۔ کبھی ایک مہینے تک کے لئے کسی کی ٹیوشن نہ لی۔ جو پڑھا، دل سے پڑھا۔ امتحان دیا۔ پاس ہوئے اور خدا کا شکر بجا لائے۔

الف۔ اے کا امتحان جیسے دیا۔ دل ہی جانتا ہے۔ نہ کتابیں تھیں، نہ کھانے کو تھا۔ ان دنوں راشن سے چنے اور پکی ہوئی کھجوریں ملتی تھیں۔ جن کے پاس تھا وہ تو خرید کر بلیک سے اناج حاصل کر بھی لیتے۔ ہم جیسے کہاں سے لاتے۔ جس دن امتحان دینے چلی یہ حال تھا کہ پیٹ میں اناج کا دانہ تک نہ تھا۔ کتابیں بھی نہ مل سکی تھیں۔ معاشیات کا پرچہ جس طرح لکھا تھا آج تک یاد ہے۔ سوشیالوجی کا پرچہ بھی یونہی کیا۔

پورے پرچے میں اشعار، سرمایہ داری کو گالیاں۔ ایک آپا قریب سے گذریں اور سوشیالوجی کے پرچے میں شعر لکھا پایا تو جھک کر پڑھا۔ ہنس کر بولیں۔

"کمیونسٹ ہو گیا۔!"

میں جل کر بولی تھی۔ "تن پر کپڑے نہ ہوں، پیٹ میں روٹی نہ ہو اور کوئی کہے کہ میں ننگا ہوں۔ بھوکا ہوں اور آپ اسے کمیونزم کہتی ہیں تو بے شک میں کمیونسٹ ہوں۔"

نتیجہ آیا۔ آج تک حیرت ہوتی ہے میں پاس کیسے ہوئی۔!

وہ نام نہاد سورج، جس کے دم سے روشنی کا تصور قائم ہے کبھی میرے آسمان پر نہ چمکا۔ میں نے جب کبھی آنکھیں اٹھا کر آسمان کو دیکھا وہاں گھٹائیں تنی ہوئی دکھائی دیں۔ بی۔ اے کے وقت بھائیوں نے کہا۔ "اردو بھی کوئی لینے جیسی چیز ہے۔ اکنامکس Honors لو تاکہ کچھ قدر بھی رہے۔" بہکاوے میں آ گئی۔ جس وقت کو ایسچن پیپر بانٹنے کی بیل بجی اور پروفیسر نے کہا۔

"جس جس کا اکنامکس میں ہو کھڑی ہو جائیں۔" تو پورے ہال میں صرف ایک لڑکی کھڑی تھی۔ وہ بھی ایک پرائیویٹ کینڈیڈیٹ اور وہ میں تھی۔!

یہ میری زندگی کی پہلی شکست تھی۔ پہلی تعلیمی شکست۔ میں آج تک کبھی فیل نہ ہوئی تھی۔ بچپن سے اب تک ہمیشہ اونچے نمبرات لئے تھے۔ اتنا غم ہوا کہ آنکھ نم بھی نہ ہوئی۔ مگر اس میں کیا بری اپنی ذہانت کا قصور نہ تھا۔ مجھے تو ڈھنگ کی ایک کتاب بھی نہ مل سکی۔ پڑھنے والے

بھلے ہی یقین نہ کریں، مگر میں نے زندگی میں کون بات جھوٹ کی ہے۔ ؛ دوسری بار پھر بی۔ اے میں بیٹھی۔ پھر لڑھکی۔ میرے خدا! "مجھ میں بہت ہمت ہے کم از کم تعلیم تو ضرور پوری کروں گی اپنی۔" میں نے اپنے دل کو سنایا۔ ان دنوں کی بات بتاؤں، تن پر صرف ایک جوڑا ہوا کرتا تھا بھائیوں کی قمیص پتلون پہنا، میم صاحب بنی، وہ جوڑا دھوتی اور پھر امتحان دینے مزے سے دھلی دھلائی ساڑھی پہن کر جاتی۔ غریبی کے داغ کس نے دیکھے ہیں۔ ؟

اچھی طرح یاد ہے تیسرا پرچہ تھا۔ رات کو ہم لوگ بھوکے ہی سو گئے تھے۔ اچانک وطن سے بھائی آ ٹپکے۔ یہ بھائی بڑے ڈھیٹ واقع ہوئے ہیں۔ آتے ہی کہا۔

"بڑی بھوک لگ رہی ہے۔ کھانا لاؤ۔"

میں رضائی سے چہرہ باہر نکالے چھت کو دیکھتی پڑی تھی۔ ان کی بات سنکر بھا نے چہرہ بھی رضائی میں چھپا لیا۔ تھوڑی دیر تک تو وہ بیٹھے انتظار کرتے رہے، پھر جانے کیا سمجھ کر اٹھے اور باہر نکل گئے۔ باہر سے آئے تو ہاتھوں میں کیک، پیسٹریاں اور رسا ٹی اسنیکس کے پیکٹ تھے۔ میا نے آہٹ پاکر آنکھیں کھولیں۔ انہیں لدا پھندا دیکھا تو پھر سے سو گئی صبح میری آنکھیں خون رنگ تھیں۔ سب کہتے ہیں۔ میں اپنی ماں پر گئی ہوں۔ میرا رنگ سانولا ہے مگر اس صبح میں نے آئینہ دیکھا تو چہرہ زرد چاند سا ہو رہا تھا۔

میں نے امتحان دیا۔ نتیجہ آیا۔ پاس بھی ہو گئی۔ زندگی کی کہانی بڑی تمنا تھی کہ گریجویٹ ہو جاؤں۔ ہو بھی گئی۔ مگر دل کو جیسے گھن لگ گیا۔

زندگی سے دل بھر گیا۔ ہر وقت روتی رہتی۔ دو ایک بار خودکشی کی کوشش کی۔ ایک بار زہر کی بوتل منہ تک لے بھی گئی۔ مگر افروز (میری چھوٹی بہن میری دوست۔) نے دیکھ لیا۔ روتے روتے آنکھیں دھندلا گئیں۔ میرے انتہائی لمبے لمبے بال، جن کی وجہ سے میں بچپن میں چڑیل اور پھر بعد میں "لمبے بالوں والی واجدہ" کے نام سے مشہور تھی۔ جھڑ جھڑا کر ڈیڑھ ہاتھ کے رہ گئے۔ کھانسی رہنے لگی۔ اور روز بروز دن بدن گھٹنے لگا۔ نانی اماں ایک دن ڈاکٹر کے پاس لے گئیں۔ اس نے صاف کہہ دیا۔

"اگر بٹیا کے علاج پر توجہ نہ دی تو خطرہ ہے۔ یہ راستہ ایک تاریک گھاٹی میں جاکر ختم ہوتا ہے۔" نانی اماں سہم گئیں۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا۔ "مرغی کے چوزوں کا سوپ پلائیے۔ پھل دیجیے۔ دودھ پلائیے۔ اور۔ اور۔ اور۔" اب میں یہ آپ سے بتا رہی ہوں کہ ڈاکٹر نے ٹانک اور گولیاں لکھ کر دیں نہ لاکے پڑی رہیں، بیچ میں۔ ان دنوں ہمارے ہاں کبھی کبھار ہی کھانا پکتا تھا۔ پہلے یا بعد کا سوال ہی باقی نہ رہ جاتا تھا۔ وہ ٹانک اور گولیاں مدتوں پڑی رہیں۔ ابھی کچھ دنوں پہلے میں، افروز اور آپا مل کر گھر کی صفائی کر رہی تھیں تو میں نے وہ ٹانک، اور گولیاں پھینکی ہیں۔ (مگر ان یادوں اور آہوں کو نہ پھینک سکی جو اتنے ہی دنوں سے دل کو چھیدے ہوئے ہیں۔)

انہی دنوں دلی سے ایک ویکلی "آئینہ" شائع ہونے لگا۔ اس میں ایک مستقل عنوان ہوا کرتا تھا۔ "میری یادداشت سے۔" اس کے تحت کوئی ناقابلِ فراموش واقعہ اپنی یادداشت سے چن کر لکھنا پڑتا تھا۔

میں نے بیٹھے بیٹھے ایک دن یونہی وہ واقعہ لکھ ڈالا جو مجھے انٹر کا امتحان دیتے وقت پیش آیا تھا۔ اس دن مجھے ایسا سکون ملا جو میں کبھی لفظوں میں بیان نہ کرسکوں گی۔ اس احساس کو، اس کیفیت کو بیان کرنے کے لئے شاید مجھے نئے الفاظ وضع کرنے پڑیں گے۔ جو میرے اپنے بس کا روگ نہیں۔ اس رات جب وہ روداد لکھنے کے بعد میں اپنے بستر پہ لیٹی تھی تو مجھے یوں لگا تھا جیسے میں، جو ایک مدت سے کڑی دھوپ میں چلتی آرہی ہوں۔ آج ٹھنڈے سائے تلے آگئی ہوں۔!

یوں میری افسانہ نگاری کا آغاز ہوا۔

میرے اپنے ذاتی دکھ کے علاوہ بھی کئی واقعے اور حادثے ایسے تھے جنہوں نے میرے دل کو کرچی کرچی کر رکھا تھا۔ اب میں بڑے انہماک سے انہیں لفظوں کا روپ دیتی اور چھپوانے کو بھیج دیتی۔ ابھی میری چند کہانیاں ہی چھپی ہوں گی کہ اکدم سے جیسے تہلکہ مچ گیا۔ ادبی حلقوں کا ذکر میں یہاں نہیں کر رہی ہوں، اپنے خاندان والوں کی بات کر رہی ہوں۔ ممکن ہے آپ سوچیں کہ خاندان والے اب اتنی بھی اہمیت نہیں رکھتے جتنی گنا رہی ہوں۔ مگر یہ سوچئے! ہم آٹھ بہن بھائیوں کو نانی اماں نے پالا۔ اکیلی جان اور آٹھ وجود۔ ماں باپ مرے اس وقت سب سے بڑی اولاد دس برس کی تھی۔ اتنے سارے روتے بلبلاتے بچے، جن کی تعلیم تربیت، دکھ درد، اچھے برے میں بس نانی اماں ہی تھیں۔ کوئی کسی کا سنگی ساتھی نہیں ہوتا اس لئے میں خواہ مخواہ رشتے داروں، خاندان والوں کو یہ کہہ کر شرمندہ کیوں کروں کہ انہوں نے ہمارا ساتھ نہیں دیا۔؟ ہر انسان کی اپنی اپنی قسمت ہوتی ہے۔

اور اس کے اعمال اس کے اپنے ساتھ۔ کسی پر یہ فرض عائد نہیں ہوتا کہ کسی کا ساتھ دے، اس کی قسمت بنائے۔ مگر نانی اماں خاندان والوں سے یوں ڈرتی تھیں کہ اگر کل کلاں کو ہم جاہل رہ جاتے اور بری صحبت میں پڑ کر ناکارہ ہو جاتے تو یہی خاندان والے طعنے دیتے کہ۔ "دیکھا! ہے— کیسے اولاد کی تربیت کی ہے۔" اس ایک طعنے سے بچنے کے لئے نانی اماں نے کیا کیا جتن نہ کئے۔ (نانی اماں خدا نہ تھیں مگر میں نے انہیں سجدے کئے ہیں۔) تو جناب میں آپ سے بتا رہی تھی کہ اب ادھر ادھر جو دو چار میری کہانیاں چھپیں تو گویا زلزلہ ہی آ گیا۔

"واجدہ بیگم نے تو عصمت کو بھی مات دیدی۔"

"ارے یہ افسانے کہیں شریف بہو بیٹیوں کے پڑھنے کے لائق ہیں۔"

"اس کے افسانے تو شادی شدہ عورتیں بھی نہیں پڑھ سکتیں۔"

"دیکھنا ایک دن باپ کی ناک کٹوا کر رہے گی۔"

"میری بیٹی ایسے افسانے لکھتی تو اپنے ہاتھوں گلا گھونٹ دیتی۔"

یہ مقدمے دھیرے دھیرے نانی اماں کی عدالت میں آنے شروع ہوئے پہلے تو بات دبی دبی سی رہی پھر زور شور سے میرے خلاف محاذ بننے لگا۔ کسی سلسلے میں نانی اماں وطن گئیں، وہاں لوگوں نے خوب کان بھرے۔ واپس آئیں تو نانی اماں مجھ سے سخت برہم تھیں۔

انہی دنوں میری کہانی "تین جنازے" چھپ کر آئی تھی۔ نانی اماں پرچے کو آئیں اور ڈانٹ گئیں کہ "میں تو یہ کہانی ضرور سنوں گی۔ تجھ کو کیا لکھنی ہے۔" "کہانی آپ کے سامنے ہے، تنہا بیٹھ کر میں یہ کہانی سنا سکتی تھی۔ میرا قصور یہ تھا کہ میں نے اس سچی حقیقت کو کہانی کا روپ دیا۔

اب میرا کام یہ تو نہ تھا کہ کہانیاں سناتی پھرتی ۔ میرے نہ سنانے پر نانی اماں کو شبہ ہو گیا۔ بلکہ یقین ہو گیا کہ یقیناً "ایسی ویسی" کہانیاں یہ لکھتی ہے تب ہی تو سنا نہیں سکتی۔ میں نے گھبرا گھبرا کر اپنے ڈیفنس میں کچھ کہنے کی کوشش کی، مگر بے سود۔ اب جناب یہ مصیبت کہ جہاں میں نے قلم کاغذ ہاتھ میں لیا نانی اماں آموجود ہوئیں۔ "تو کیا لکھ رہی ہے بتا کیا لکھ رہی ہے۔؟" نانی اماں پڑھی لکھی نہیں ہیں مگر انہیں چلا دینا بڑا مشکل کام ہے۔ اگر میرے ہاتھوں میں لمبا چوڑا کاغذ ہے یا کاغذوں کا پلندہ ہے اور میں نے کہہ دیا کہ خط لکھ رہی ہوں تو وہ کبھی یقین نہ کریں گی۔

"خط اتنے بڑے بڑے لکھے جاتے ہیں۔؟ ضرور کہانی لکھ رہی ہے"

اب مصیبت یہ رہی کہ ایڈیٹر دہی کے جو خط آتے اور جاتے سب کچھ نانی اماں سنسر کرتیں۔

محترمی ایڈیٹر صاحب۔

آپ نے کہانی مانگی ہے۔ اس وقت تو نہیں ہے۔

جب لکھوں گی فوراً بھجوا دوں گی۔

"کیا لکھا ۔ جب لکھوں گی۔! مگر یہ کہنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔؟" پھر کسی نامراد، نکمے۔ بیوقوف ایڈیٹر کا خط آ گیا کہ کہانی مل گئی۔ ارے کمبخت مل گئی تو اطلاع دینا کوئی ضرور تھا یہ۔ اب نانی اماں سن رہی ہیں۔

"کہانی مل گئی۔ آپ نے کمال کر دیا ہے۔ وہ دن دور نہیں جب آپ آسمانِ ادب کا سورج بن کر چمکیں گی۔

"یہ کہانی کب بھجوائی تھی۔؟"

یہ کڑا محاسبہ۔ یکجا زندگی اجیرن ہو گئی۔ میں نے دل سے، حالات سے سمجھوتہ کر لیا۔ "اب سے کبھی کوئی چیز نہ لکھوں گی۔ کون یہ جوکھم مول لے۔ کوئی زندگی سی زندگی ہے۔!"

کئی دن گذر گئے، میں نے کچھ نہ لکھا۔ ایک دن ماموں تشریف لائے پامسٹری سے بڑا لگاؤ ہے انہیں۔ میرا ہاتھ دیکھا۔ پہلے تو خاصی بکواس فرماتے رہے۔ پھر سیریس ہو کر بولے۔

"ارے سچ ملکہ تیرے ہاتھوں میں ایک خاص بات ہے۔ تجھے ضرور شہرت ملے گی۔ اور بہت ساری۔"

میں نے آزردہ ہو کر اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔ "ماموں میرا دل نہ جلایئے ہاتھ آیا موقع تو کھو گیا۔ اب کون شہرت سکا سکتا ہے۔"

اس شام نانی اماں کہیں مہمان گئیں تو میں اپنی قسم بھول گئی اور ایک کہانی فوراً لکھ ڈالی۔ "آگ میں پھول۔" لفافے میں بند کر کے رکھ بھی لی۔ دوسرے دن چوری سے نوکر کے ہاتھ میں لفافہ دیا تو جانے کیسے نانی اماں کی نظر پڑ گئی۔

"یہ کیا ہے۔؟" وہ ڈپٹ کر بولیں۔

وہ جھوٹ کیوں بولتا۔؟ صاف کہہ گیا۔ "ملکو بی بی نے کھوٹ دیئے۔ بولے غپ چپ ڈال کر آجا۔"

اس کمبخت "غپ چپ" نے وہ آگ لگائی کہ پوچھئے نہیں۔ دوسرے ہی لمحے آنگن میں آگ اور پھول بکھرے نظر آرہے تھے۔ میرے خدا۔ میں سہم کر رہ گئی۔ بزدل لڑکی۔

پھر ایک سوجھی آئیں۔ میرا ذکر بیچ میں آیا۔ میرا نام زیر بحث آیا۔
"اچھا تو اسی کا نام واجدہ تبسم ہے۔"

ابو نے میرا نام واجدہ بیگم رکھا۔ امی کو جلنے مجھ میں کیا رایل ہونے کے آثار نظر آئے۔ کہا میں تو اپنی اس بیٹی کا نام ملکہ رکھوں گی۔ بچہ ماں کا زیادہ ہوتا ہے۔ باپ کا کم۔ امی کا رکھا نام چل نکلا۔ بگڑا تو کسی نے ملکہ کہنا شروع کیا کسی نے سلکو اور کسی نے ملکی۔ مگر جب اسکول میں داخلے کی نوبت آئی تو بیا. الانام لکھا یا گیا۔" واجدہ بیگم۔" مگر جب میں لے لکھنا شروع کیا تو خود کو واجدہ تبسم بنا لیا۔ صاف سیدھی بات ہے، زندگی نے مجھے غم ہی غم دیئے میں اپنی زندگی میں مسکراہٹیں بھر لینا چاہتی تھی: زور ہی کیا بھی۔ اس طرح خود میرے خاندان میں بھی پہلے پہل بہت کم لوگوں کو پتہ چلا کہ میرا ہی نام "واجدہ تبسم" ہے۔

باتوں باتوں میں "بتین شبانزے" کا ذکر آ گیا۔ کہنے لگیں۔ "یہ کہانی تم نے ہی لکھی ہے نا۔"

میں ڈر کر صاف جھوٹ بول گئی: جی نہیں وہ تو تکرتو خوری نے لکھی ہے، جس زمانے میں شاہزادیں وہ کہانی چھپی ایسے فکر صاحب ایڈٹ کیا کرتے تھے۔ گھبراہٹ میں جو منہ سے نکلا وہی کہہ گئی۔ "مگر کہانی پہ نام تو تمہارا دیا ہوا ہے۔"

اب کے میں بہت معتبرانداز سے جھوٹ نبھانے لگی۔ "دیکھئے نا دراصل ہوتا یوں ہے ...." میں نے اس قدر الٹ پلٹ باتیں کیں کہ بعد میں خود اپنی بے کسی پر مجھی کو رونا آ گیا۔ کتنی عجیب بات تھی کہ میں اپنی کہانی کو اپنی نہیں کہہ سکتی تھی۔ دل کا سارا غبار آنکھوں کے راستے نکل پڑا۔ جانے جانے جب وہ مجھانے

لگیں تو یہ بھی کہا۔ "دیکھو بیٹیا ہم تمہارے ہی بھلے کی کہتے ہیں۔ تمہارا خاندان دیکھو۔"

ابھی وہ کچھ کہتی ہی تھیں کہ اُدھر واجدہ زور سے بول پڑی۔ "کہنے لگی تو میرے باپ کی ناک کٹے گی، آپ کا کیا بگڑے گا۔ ؟ جب میرا باپ مرا تھا اور نانی، اماں اکیلی رہ گئی تھیں، تب آپ کو ہمارے بھلے کی نہ سوجھی۔ اب ہم کسی قابل ہو رہے ہیں تو آپ کیوں اپنا سلیقہ جتانے آن پہنچی ہیں۔ ؟"

وہ یقیناً میں نہ تھی۔ واجدہ تھی۔ ؟ جو ایک کہانی کہنے والی تھی۔ جو اپنے مستقبل کے لئے جدو جہد کرنا چاہتی تھی۔ کیونکہ مجھے اعتراف ہے کہ میں جو ہوں تو ایک بہت ہی بزدل لڑکی ہوں۔ ہاں جناب! اس دن ڈوان جھلکا، اور ایسا جھٹکا کہ پھر کسی نے میرے سامنے کچھ نہ کہا۔ مگر میرے پیچھے تو کہتے ہی رہے۔ وہ بھی جو کہنا چاہیئے۔ اور وہ بھی جو نہ کہنا چاہیئے۔

میں پہلے واجدہ تھی۔ پھر تبسم بنی۔ مگر اس ایک مسکراہٹ کے لئے آنسو میری آنکھوں سے ٹپکے۔ ؟)

ایک بار ایسے ہی کسی موقعے پر میں نے ایک اور نام نہاد عزیزہ سے کہا تھا۔ "جی آپ تو آپ ہیں۔ اگر قبر سے میرا باپ اٹھ کر آ جائے تو بھی میں افسانے لکھنا نہیں چھوڑ دوں گی۔"

یہ بڑی عجیب و غریب بات ہے کہ یہ ساری باتیں چار سال پہلے کی ہیں۔ اور جو پہلے ڈر تے تھے کہ واجدہ خاندان کی، رشتہ داروں کی ناک کٹا دے گی، اب میرے پیچھے اپنے ملنے والوں سے فخریہ کہتے پھرتے ہیں کہ "ارے وہ واجدہ تبسم! میری بھتیجی ہے۔ بڑی ہونہار لڑکی ہے — ہاں ہاں وہ واجدہ تو میری عزیزہ ہے۔ بڑی اچھی کہانیاں لکھ رہی ہے۔"

اس کے باپ تو میرے دوست تھے۔ خاندان کا نام روشن کر دیا بٹیا نے۔"
آپ یقین کریں مجھے ان باتوں سے نہ خوشی ہوتی ہے نہ فخر محسوس ہوتا ہے۔ رنج بھی نہیں ہوتا، غصہ ضرور آتا ہے۔ اور میں تو بچپن ہی سے تنک مزاج ہوں۔ بس جی چاہتا ہے جو لوگ میرا نام لے کر فخر محسوس کرتے ہیں ان سے کہہ دوں۔
" معاف کیجئے آپ سے میرا کوئی رشتہ نہیں ہے۔"
پہلے کے مقابل اب حالات کافی بدل چکے ہیں۔ مگر پھر بھی نانی اماں مجھ سے تھوڑی بہت بدگمان ضرور ہیں۔ انہیں ایک شکایت ہے کہ میں انہیں اپنی کہانیاں نہیں سناتی۔ اور صاف سیدھی بات تو یہ ہے کبھی اپنا ہوتا نہیں جو نانی اماں کو کہانی سنا سکیں۔ ایک بار، بار بار کے کہنے پر، افروز نانی اماں کو میری کوئی کہانی سنانے بیٹھی۔ اس میں لفظ محبت اس انداز سے آیا کہ نانی اماں گڑبڑا گئیں۔
"ہیں۔ کیا پڑھا۔؟ محبت ۔ کس کو محبت ۔ کس سے۔ ؟ اچھا تو یہ بات ہے۔ یہ عشق عاشقی کی کہانیاں لکھی جاتی ہیں یہ ہوں تو یوں کہو۔"
اسی لئے میں کہانیاں سب سے چھپ کر لکھتی ہوں۔ ایک بے حد نازک اور اندھیارے کونے میں۔ اگر آنگن سے ہو کر کوئی اس کمرے میں آئے تو دکھائی بھی نہیں دے سکتا کہ کونے میں کوئی متنفس بھی ہے۔ بانو (جیلانی بانو) جب پہلی بار مجھ سے ملنے میرے گھر آئی تو اس نے وہ جگہ دیکھنی چاہی، جہاں میں بیٹھ کر میں " ادب تخلیق " کیا کرتی تھی۔ پہلے تو اسے یقین ہی نہ آیا کہ ایسی واہیات جگہ بیٹھ کر کوئی سانس بھی لے سکتا ہے۔ مگر جب میں نے اسے ٹوٹا ہوا پین، زنگ آلود چاقو، چھوٹی سی دوات،

لال آدھی پنسل کا ٹکڑا اور تازے آئے ہوئے رسالوں کے ساتھ فرش پر بے شمار سیاہی کے چھینٹے پڑے ہوئے دکھائے تو اسے یقین کرنا پڑا۔ گھر جا کر اس نے لکھا تھا۔

"دجو چندا۔
میرا مشورہ ہے کہ تم اس کونے سے نکل کر آسمان تلے آجاؤ
اگر سورج کا اجالا بھی تمہاری کہانیوں میں آ جائے تو
کیا کہنے۔؟"

میں نے اس سے کہا تھا۔

میں کسی سورج کی مرہونِ منت نہیں ہونا چاہتی۔ میں خود سورج بن کر اس کونے کو منور کر دوں گی۔" سورج بن جانے کی یہ تمنا میرے دل میں آج بھی موجود ہے۔ بانو کے علاوہ اور کئی بہنوں نے مجھ سے یہ بات کہی ہے۔ میں صرف گھریلو کہانیاں لکھتی ہوں۔ میری کہانیوں میں کوئی خارجی مسئلہ نہیں ہوتا۔ آخر دنیا بھی اور بھی تو موضوع ہیں۔

یہ بات نہیں کہ مجھے عورتوں کی ایسی کہانیاں اچھا پسند نہیں ہیں جن میں کسی بڑے اہم موضوع کو سمویا گیا ہو۔ جیسے امن، جنگ، ہڑتال یہ باں کسی موضوع کی قید نہیں۔ ہزاروں موضوع اور مسائل ایسے ہیں جن پر لکھا جا سکتا ہے۔ مگر میں یہ کہتی ہوں کہ اگر ہم گھر میں بیٹھ کر چولہا ہانڈی کرنے والی عورتیں، جنہوں نے بازار کی شکل تک نہیں دیکھی، یوں ایسی کہانیاں کہنے لگیں جن میں امن کا ذکر ہو، کسی جنگ کی تفصیل ہو یا کمیونزم یا کسی اور ازم کا پروپیگنڈہ ہو تو کس قدر غلط سی بات ہوگی۔ یہ بات طے ہے کہ آپ اس وقت تک کسی مسئلے پر کامیابی سے نہیں لکھ سکیں گے۔ جب تک کہ آپ

نے شئے متعلقہ سے گہری واقفیت حاصل کرلی ہو۔ اگر میں یہاں حیدرآباد دکن میں بیٹھ کر کراچی کے غنڈوں پر کوئی کہانی لکھنا چاہوں تو کیسی بےہودہ سی بات ہوگی۔ میں کسی کے میدان کو محدود نہیں کرنا چاہتی، صرف اپنے متعلق کہہ رہی ہوں کہ میں ایسے کردار کبھی نہیں چنوں گی جن کے بارے میں مجھے کچھ بھی علم نہ ہو۔ کرشن چندر "مہالکشمی کا پل" ایسی کہانی بڑی خوبصورتی سے لکھ سکتا ہے۔ کیونکہ اس نے نہ صرف بمبئی دیکھی ہے، بلکہ وہ مرد ہے اور اس نے باہر کی سیر بھی کی ہے۔ ایسے میں اس کے قلم سے جو کہانی نکلے گی بڑی پختہ ہوگی۔ کوئی بات ایسی نہ ہوگی۔ جس کے متعلق کہا جاسکے کہ "مسٹر آپ نے کبھی بمبئی کی گلیاں دیکھی ہیں؟ کبھی نعرے لگاتے ہوئے جلوسوں کے ساتھ گھومے ہیں۔؟" برخلاف اس کے اگر آپ کرشن سے پوچھیں کہ "بریانی میں کتنی سرخ مرچیں ڈالتے ہیں۔؟" اور وہ یہ جواب دیں کہ "سیر بھر کی بریانی میں آدھو پاؤ مرچیں" تو میاں ان کے "مشاہدے اور تجربے" کی پول کھل جائے گی۔ آپ جانیں بریانی میں مرچ تو پڑتی ہی نہیں۔ کرشن بریانی نہیں پکا سکتا، میں مہالکشمی کے پل پر کوئی کہانی نہیں کھڑی کرسکتی۔ کیونکہ ہم دونوں کے میدان الگ الگ ہیں۔ خود اپنے سے بھی، اور پڑھنے والوں سے بھی، یوں بے ایمانی کر کے فائدہ ہی کیا ہے؟ کیا اس سے اچھا یہ نہیں ہے کہ ہم صرف اپنی موضوعات پر قلم اٹھائیں جن کے بارے میں ہم اچھی طرح جانتے ہیں اور ہمارے دل کو یہ ڈھکا بھی نہیں لگا رہتا کہ کہیں ہم ادب کے نام پر دھوکہ بازی تو نہیں کر رہے ہیں۔؟

لوگ مجھ سے کہتے ہیں۔ "تم کب تک گھر کی چاردیواری میں بیٹھی

رہوں گی۔؟ باہر نکلو، دنیا میں گھوم پھر کے دیکھو کیا ہو رہا ہے اور پھر اچھی اچھی کہانیاں لکھو۔ تمہاری کہانیوں میں تو آجکل وہی ایک سی باتیں ہیں۔" چلئے مان لیا کہ میری کہانیوں میں وہی ایک سی باتیں ہیں۔ مگر ذرا یہ بھی سنیئے ــــ کیا آپ یقین کریں گے کہ میں ہوش و حواس کے عالم میں، ریل میں پہلی بار، صرف تین سال پہلے بیٹھی ہوں۔؟ پارٹیشن کے وقت تو پتہ نہیں کیسے ہم حیدرآباد تک آپہنچے، مگر جہاں تک ہوش و حواس کا سوال ہے میں نے ریل کی شکل صرف تین سال پہلے دیکھی ہے۔ یہ سوال آپ کو قطعی غیر ضروری نظر آئے گا۔ مگر آپ یوں بھی تو سوچیں کہ وہ لڑکی، جو خود کو "بڑھیا" کہتی ہے، جو پہلی بار بڑھاپے میں ریل میں بیٹھی ہو۔ وہ دنیا کے متعلق کیا سوچ سکتی ہے۔؟ کیا لکھ سکتی ہے شاید ریل میں بیٹھنا نصیب ہوتا بھی نہ، مگر بھیا کی شادی ناگپور میں ٹھہری۔ برات لے کر تو جانا ہی تھا۔ میں نے پلیٹ فارم کے بارے میں بڑے بڑے اندازے لگا رکھے تھے۔ لیکن جب دیکھا تو سخت مایوسی ہوئی۔" ارے باپ اسی واہیات سی چیز کے اتنے ڈھنڈورے تھے۔؟ پلیٹ فارم ایسا اور پلیٹ فارم ویسا۔ خاک بھی گلیمر نہ تھا کم بخت میں!" اب ریل میں بیٹھی ہوں تو یہ عالم ہے کہ مارے ڈر کے دم نکلا جا رہا ہے، کیونکہ ریل پل پر سے گزر رہی ہے۔ گھڑ گھڑ دھڑ دھڑ کی وحشتناک آوازیں! اور مجھے ہر لمحہ یہ ڈر محسوس ہو رہا ہے کہ بس ابھی ابھی ریل پانی میں گر پڑے گی۔

قریب بیٹھا ہوا ایک کرسچین جھلا کر بولا۔

"O Gosh! The most Coward Creature I've ever Seen!"

("اوگاش — دی موسٹ کاورڈ کریچر آ ہیوا یور سین !")

"جس لڑکی کے بارے میں ایک غیر ملکی یہ ریمارک پاس کرتا ہے، اس سے آپ یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ باہر کی دنیا پر کہانیاں لکھے۔ ؛ نا با با نا - یہ ہم سے نہ ہوگا۔ ایسا کیا ہم مرے جا رہے ہیں۔ جب وقت آئے گا اور دنیا کو گھوم پھر کر دیکھیں گے، تب لکھ لیں گے ایسی کہانیاں۔ جب مرنے کا سیزن تھا۔ تب تو نہ مرے، اب کیا مریں گے۔ ؛ اب تو جینے کے دن آ رہے ہیں۔

ویسے آپ یقین مانئے آپ میں سے کوئی میری کہانیوں کو برا کہتا ہے تو مجھے ذرا بھی دکھ نہیں ہوتا۔ (اور آپ میں سے بہت کم ایسے ہیں جنہوں نے میری کہانیوں کو برا کہا ہے۔!) اگر آپ اچھا کہہ دیتے ہیں تو خوشی بہت مل جاتی ہے۔ اور یہ خوشی مجھے یوں ملتی ہے کہ میں نے جن کرداروں کو آپ کے سامنے پیش کیا ہے انہوں نے کسی نہ کسی طرح آپ کو متاثر ضرور کیا ہے۔ ایسے میں میں اس دکھ اور کرب کو بھول جاتی ہوں جو کہانی لکھنے سے مجھے پیش آیا تھا۔ ! (میں نے آپ سے کہا ہے تاکہ مجھے کہانیاں لکھنے میں کسی قسم کی "محنت" نہیں کرنی پڑتی۔ میں نے اپنی طویل سے طویل کہانیاں بھی ایک ہی sitting میں لکھی ہیں !) "شہر ممنوع" میری وہ کہانی ہے جس کے کردار مجھ سے، میری زندگی سے، میرے دل سے سب سے زیادہ قریب رہے۔ یہ کہانی میں نے بڑی مشکل سے لکھی ہے۔ آپ میرے دکھ کا اندازہ شاید نہ لگا سکیں کہ جب یہ کہانی لکھ رہی تھی۔ میرا دل کیسے کیسے روتا تھا۔ ! پڑھنے والوں نے مجھ سے کہا کہ "! ... وہ کہانی شاید اب تم کبھی نہ لکھ سکو گی۔" دیگر مجھے اپنی زندگی کی سب سے زیادہ غمناک اور خون رلانے والی کہانی جو محسوس ہوتی ہے وہ "گلستان سے قبرستان تک" ہے)

کالے بادل" لکھنے سے میں جس کرب اور امتحان سے گزری اس نے مجھے تین چار راتوں تک سونے نہ دیا۔ یہ بہ کتنی حقیقت ہے۔ مگر پھر بھی اس کو سجدے کئے جاتے ہیں۔ لیکن عجیب و غریب بات ہے خدا نے خود ہی انسان کو پیدا کیا اور خود ہی اس کی زندگی میں غم ہی غم بھر دیئے۔ ہم کون ہیں؟ کیوں ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ اس دنیا میں کس لئے بھیجے گئے ہیں؟ یہ سب باتیں سوچتے سوچتے کبھی کبھی میں Pagal ہونے لگتی ہوں۔ پھر سوچتی ہوں اگر میں خدا ہوتی تو؟ شاید میں دنیا کو اتنی تباہ حال نہ رکھتی۔ میں سمجھتی ہوں حالات سے مغلوب ہو کر ہر دکھی دل ایک نہ ایک بار خدا بن جانے کے بارے میں سوچتا ضرور ہوگا۔ مگر پھر خیال آتا ہے کہ بڑی اچھی بات ہے جو میں خدا نہیں ہوں، ورنہ مجھے ایسے دکھی دلوں کی اتنی باتیں سننی پڑتیں کہ چوتھے ہی دن آسمان سے اتر آتی اور سیدھی سادی زاہدہ تبسم بن جاتی۔ مگر انسان بن کر تو کہیں جائے فرار نہیں۔ اس دنیا میں اپنی جملہ محرومیوں اور ناکامیوں کے باوجود رہنا ہی پڑتا ہے۔ جینا ہی پڑتا ہے۔ مسکرانا ہی پڑتا ہے۔ بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ تو میں یہی کہہ رہی تھی جناب کہ مجھے کہانی لکھنے میں محنت تو نہیں کرنی پڑتی، ہاں شدید کرب سے اکثر گزرنا پڑتا ہے۔ "شہر ممنوع"، "گلستان سے قبرستان تک"، "ساتواں شہزادہ"، "کالے بادل"، "پاندان"، "گناہوں کی پاداش"، "آگ میں پھول" یہ اور ایسی کتنی ہی کہانیاں کہانیاں نہیں جیتی جاگتی حقیقتیں تھیں جنہیں میں نے لفظوں کا جامہ پہنایا اور آپ نے کہانیوں کا نام دیا۔ ابھی چار سال پہلے ہی کی تو بات ہے کہ ۲۶ ستمبر کی شب کو میری

پہلی کہانی چھپی تھی۔ اور اب چار سال بیت گئے ہیں۔ ان چار سالوں میں داد بہت ملی۔ "بے داد" کچھ نہیں۔ خود ستائی نہیں کر رہی ہوں۔ لیکن جانے کیوں محسوس ہوتا ہے کہ مجھے اپنے مستقبل سے مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ یہ جانتی ہوں کہ میں نے ابھی کچھ نہیں لکھا ہے، کچھ بھی نام پیدا نہیں کر سکی ہوں۔ لیکن سوچتی ہوں ناکامی کی اینٹوں سے ہی تو کامیابی کا محل کھڑا ہوتا ہے۔ پیچھے مڑ کر دیکھتی ہوں تو اتنی ساری کٹھنائیاں اور مصیبتیں جھیل کر بڑھے چلے آنے کا احساس شدید سے شدید تو ہو جاتا ہے اور یہ یقین پختہ ہونے لگتا ہے کہ اب میں زندگی سے کبھی ہار نہیں مان سکتی۔

رہی آپ کی یہ بات کہ مجھے اور دوسرے موضوعات پر بھی لکھنا چاہیے۔ تو میں آپ سے بتاؤں، دنیا کو قریب سے دیکھنے اور گھومنے پھرنے کی تمنا تو میری بہت پرانی تمنا ہے۔ میری یہ تمنا پوری ہو جائے، میں آپ کی خواہش کا ضرور احترام کروں گی۔ ابھی ابھی تو ایک پنچھی نے اڑنا سیکھا ہے۔ اگر آپ ابھی سے اس سے یہ توقع کرنے لگیں کہ وہ آسمان تک پرواز کرنے لگ جائے تو بے چارہ تھک کر زمین پر آ پڑے گا۔

آپ سوچ رہے ہوں گے کہ "عجیب ہے یہ لڑکی بھی۔ اپنے تعلق سے جو کچھ کہلوانا تھا، سب خود ہی کہہ ڈالا۔

جی ہاں بس میں یہی نہیں چاہتی کہ کوئی میرے متعلق وہ سب کچھ کہے جو بہت ہی فارمل ہوتا ہے۔ ہمارے ادب میں 'پیش لفظ' کی وبا بہت عام ہو رہی ہے۔ مجھے ہمیشہ سے پیش لفظ پڑھنے سے چڑ رہی ہے۔ مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس طرح قاری کی رائے ہمیشہ متاثر ہو جاتی ہے۔

وہ اپنی نہج سے الگ ہٹ کر سوچنے لگتا ہے۔ اور یوں عادی کی بات جانے دیجئے تو مجھے سرے سے یہ سلسلہ ہی ناپسند ہے۔ بھئی آخر کیا ضرور ہے کہ ہم نے جو کچھ بھی لکھا ہے اس پر کسی نہ کسی "بڑے آدمی" کے نام کا لیبل بھی ضرور لگا ہو۔ ابھی میں نے تو ان "رالیوا" کو بھی روا نہیں رکھا ہے جو ڈسٹ کور پر بڑے بڑے ادیبوں اور نقادوں کی طرف سے چپکا دی جاتی ہیں۔ ویسے آپ یقین مانیں کہ میرے پاس کئی "بڑے لوگوں" کے ایسے ایسے خط موجود ہیں جن میں میری افسانہ نگاری کے تعلق سے بڑی خوبصورت باتیں کہی گئی ہیں۔ یوں بھی میرے آس پاس اتنے سارے شفیق اور مہربان چہرے موجود ہیں کہ ان سے اگر تھوڑوں بھی "کچھ" لکھنے کو کہہ دیتی تو بلا مبالغہ وہ ایک طویل سا پیش لفظ میرے لئے لکھ دیتے۔ لیکن مجھے اس تصور سے ہی الجھن ہوتی ہے۔ پیش لفظ دراصل پڑھنے والوں کو بہکانے کا خوبصورت طریقہ ہے، اور مجھے چیپ قسم کی پبلسٹی سے ہمیشہ سے بڑی نفرت رہی ہے۔ انسان میں اگر آگے بڑھنے کی دھن ہے تو اسے چاہئے کہ اپنے ہی بل بوتے پر بڑھے۔ کسی کی کار میں بیٹھ کر راستہ طے کرنے کی بجائے میں اس چیز کو کہیں زیادہ پسند کروں گی کہ لڑکھڑا تے ڈگمگاتے خود ہی اپنی منزل کو پہنچوں۔۔!!

واجدہ تبسم

۲۹ر دسمبر ۱۹۵۹ء حیدرآباد دکن

فاختہ

منیا ابھی ابھی بستر پر سے اٹھ کر گئی تھی۔ اس کے بدن کی گرمی سے بستر گویا جھلس رہا تھا۔ سر کے دباؤ سے تکیہ کے بیچ میں ایک گول سا نشان پڑ گیا تھا۔ چوٹی جو پیٹھ کے نیچے دب گئی تھی اس نے چادر پر اپنا بل کھایا ہوا نقش چھوڑ دیا تھا اور پورا بستر بھینی بھینی خوشبو سے مہک رہا تھا۔

شبیر میاں جوتے اتار کر بستر پر بیٹھنے لگے تو اکدم انہیں مانوس سی خوشبو کا احساس ہوا۔ بستر پر بیٹھے تو اسے بڑا نرم نرم، گرم گرم سا پایا، جیسے فاختہ کے پر۔

"سوں" کر کے انہوں نے زور سے سانس لی اور ناک سے ہوتی ہوئی خوشبو ان کے دل تک آتر گئی۔ اکدم وہ بوکھلا سے گئے۔ یہ کیفیت تو ان پر کبھی نہ گزری تھی۔ ایسا لگا گویا فاختہ کے گدگدے اور تپتے ہوئے پروں میں دھنس گئے ہوں۔ وہ بستر سے اٹھ گئے۔ منی اور ارشد کمرے کے باہر کھیل رہے تھے۔ انہوں نے بڑی سہمی ہوئی آواز سے پکارا۔

"اے منی۔ اے ارشد۔ ذرا ادھر تو آؤ۔"

منی سہاگنی ہوئی آئی اور آنکھوں پہ سے بال ہٹاتی ہوئی بولی۔

"ہمیں بلایا ابا میاں۔؟"

"بیٹی تم میرے بستر پہ سوئی تھیں۔!" انہوں نے حد درجہ رازدارانہ لہجے میں پوچھا۔

"نہیں جی۔ ہم تو جب سے باہر کھیل رہے ہیں۔"

"اچھا تو شاید ارشد سویا ہوگا۔" اور انہوں نے ارشد کو پکارا۔

"واہ جی۔ ہم تو اکیلا منی کے ساتھ کھیل رہے ہیں۔ ہم نے تھوڑے ہی گندے پیر آپ کے بستر پہ۔ ہاں آپا ابھی ابھی سو کے اٹھی ہیں۔"

شبیر میاں سن ہو گئے۔! بستر پہ پھیلتی ہوئی خوشبو نے انہیں آپ ہی بتا دیا تھا۔ "میں منیا کے پاس سے آئی ہوں۔۔!"

انہیں یاد آیا ممانی بی سدا سنبل کے لئے چکی میں خوشبودار مصالحے پسوایا کرتی تھیں۔ اور منیا ہمیشہ صابن کی بجائے مصالحوں سے نہاتی ہے۔ تبھی تو اس کے بال اتنے لمبے لمبے ہیں اور چلتے میں اس کے پاس سے نئی نویلی دلہنوں کی سی خوشبو آتی ہے۔

گول پیچ دار زینے پر مانوس کھٹ کھٹ سنائی دی اور پھر تھوڑی باریک سی، ملائم سی۔ میٹھی آواز آئی۔

"اے خالنا ماں کھانا لگادو۔ میاں آگئے۔"

آج شبیر میاں کو یہ آواز بالکل نئی لگی۔ لہجہ بالکل نیا لگا اور وہیں بیٹھے بیٹھے الجھتے رہے۔ "اے خالنا ماں کھانا لگادو۔ میاں آگئے۔"

ممانی بی منیا کو کئی بار ٹوک چکی تھیں کہ "اے بیٹا اپنے سے بڑوں کو رشتہ لگا یا کرتے ہیں۔" مگر جہاں جہاں بھی رشتہ لگانے کا موقع آیا منیا کی

زبان پر کلا گئی۔

شبیر میاں ممانی بی کے سگوں میں سے ہوتے تھے۔ ایسا بہت دور کا رشتہ بھی نہ تھا۔ شادی ہوئی تو دوہرا رشتہ ہو گیا۔ بھانجے لگتے تھے اور ممانی بی کہتے منہ سکھاتے تھے۔ ممانی بی کو بھی ان سے بڑی محبت تھی۔ کوئی کار ہو، کوئی کاج۔ ہر کام میں شبیر میاں کی رائے لی جا رہی ہے، شبیر میاں بلائے جا رہے ہیں۔

جہاں کوئی اچھی سی چیز پکی رکابیوں میں لگا۔ سرپوش ڈھک، جھٹ سے زیبن بوا کے حوالے کشتی کی کہ "جا جلدی سے شبیر میاں کے ہاں پہنچا آ۔"

شبیر میاں بھی ممانی سے ایسے گھلے ملے تھے کہ ماں سے بھی اتنی نہ رہی ہوگی۔ اور جب سے نواں کی جاگیر کا قصہ ختم ہوا تھا یہ اپنا گاؤں چھوڑ کر یہیں آ بسے تھے۔ ممانی جی کے ہی پڑوس میں چھوٹا سا مکان تھا۔ وہیں رہتے۔ شادی شدہ تھے۔ شریف خاندانی بیوی بھی، دو بچے، مزے سے کٹ رہی تھی۔ اپنے کام کاج سے فرصت پاتیں تو رقیعہ بیگم بھی گھڑی، دو گھڑی کو ممانی کے پاس آ بیٹھتیں۔ مینا سے ان کی بڑی دوستی تھی۔ دل سے دل ملنے میں کیا دیر لگتی ہے۔ یہ تیس کے اندر تھیں اور مینا تو سولہ سترہ ہی میں ہی تھی۔ پھر بھی دونوں ایسی گھلی ملی تھیں گویا ساتھ کی کھیلی سہیلیاں۔ گھنٹوں سر جوڑے بیٹھی باتیں کرتی رہتیں۔

مینا کو شہر سے افسر کا پیام آیا تو انہی کی کوششوں سے ہی "نہ" ہوئی تھی۔ اب لاکھ ممانی بی کہتی ہیں۔

"وا بی۔ اچھا کماؤ لڑکا ہے۔ گن کا، ڈھنگ کا۔ اب اور کیا

دیکھیں گے۔؟" مگر رفیعہ بیگم کی ایک نہیں تو لاکھ نہیں۔ ممانی بی نے کہا بھی "اے تم ایسی جنم جنم کی دشمن کا ہے سے ہوگئی ہو لڑکی کہ منہ توڑ انکار کئے جاتی ہو۔" ہنس کے بولیں۔" اے ممانی بی! ہماری مرضی نہیں تو آپ کیوں مجبور کر رہی ہیں۔"

اصل میں منیا کی مرضی نہ تھی۔ کیوں نہیں تھی۔؟ بس نہیں تھی۔ اڑتے اڑتے اتنا ضرور سنا تھا کہ صاحبزادے ذرا رنگین مزاج ہیں۔ ممانی بی اتنی روشن خیال بھی نہ تھیں کہ بیٹی کے منہ سے صاف 'نہیں' سن سکیتں، اس لئے رفیعہ بیگم نے اپنی طرف سے توڑ جوڑ کر کے بات بنا دی۔ ممانی بی بھی کھٹک گئیں۔ سوچا۔" اپنی طرف سے تو یہ زور زوری سے کہہ نہیں سکتی، ہو گی دونوں کی ملی بھگت۔" خاموش رہ گئیں

ویسے سچ بات تو یہ تھی کہ ممانی بی اتنی لکیر کی فقیر بھی نہ تھیں۔ انہوں نے تو آپ ہی بہت سی دیواریں گرادی تھیں"عصمت" تو خیر بہت زمانے سے آتا تھا۔ اب تو رسالوں کی ڈور بندھ گئی تھی۔ جہاں کسی نئے پرچے کا نام سنا اور منیا نے چندہ بھیجا۔ اتنا یقین تو انہیں بیٹی پہ ضرور تھا۔ اوندھی سیدھی کتابیں تو خیر منیا نے نہیں پڑھیں، مگر یہ انہونی ضرور کر دکھائی کہ رے کے ایک مضمون لکھ ڈالا۔ اب نصیب ہی اوندھے ہوں تو کوئی کیا کرے۔؟ وہ چھپ بھی گیا۔ سارے خانوادے میں ولے لے دے دے ہوئی کہ ممانی بی سے تو منہ چھپانا بھی نہ بن پڑ سکا۔ پانی ایک ہی بار زور توڑ کے راہ بنا لے تو پھر تو سبھی جگہ سے بہتا چلا جاتا ہے۔ پہلی بات تھی۔ سمجھوں بیں دھوم سی ہو گئی۔ مگر اب بعد میں تو یہ عالم ہو گیا کہ منیا نے باقاعدہ انگریزی بھی پڑھ ڈالی۔ بہشتی زیور اور دینی مسائل تو پڑھے ہی پڑھے

تھے۔ الٹے سیدھے ناول، کہانیاں بھی پڑھنی شروع کر دیں۔ سب سے پہلے جو کتاب گھر میں آئی "دولت پہ ٹھوکر یا بنیاں" تھی۔ پھر تو گویا کھلی چھٹی ہی مل گئی۔

مگر اب الٹے سیدھے ناول پڑھنے کا یہ بھی مطلب نہیں ہے سر سے ناک کاٹ ڈالی ماں باپ کی۔ مگر ہاں اپنا مستقبل ضرور بنا لیا۔ ساتھ ہی ساتھ پرانی باتوں کا توڑ بھی اسی نے توڑا۔ چار کلی کے کھڑے پائنچوں کے پاجاموں اور بند گلے کی کرتیوں کی بجائے وہ ساڑی پہنتی تھی۔ کانوں میں ممانی بی کے جہیز کی بالیاں تو اس نے سرے سے پہنی ہی نہیں۔ جگ مگ جگ مگ کرتے ٹاپس پہنتی تھی۔ جھوکا جھول جنیدن ہار اور جوسری کی بجائے گلے میں ہلکا پھلکا نکلس ڈال لیتی۔ اور یہ بھی روز روز نہیں۔ کسی کے ہاں آنا جانا ہوا تو ماں کے اصرار پر پہن لیا۔ نہیں تو وہی اپنے بھونڈے ہاتھو، بھونڈا انگلا۔ آنے جانے والیاں ٹوکتیں بھی "اے کنواری اور سہاگن سے ہی گھر کی رونق ہے۔ یہ ٹھنڈے ہاتھوں کی کیا چال اٹھائی ہے بی۔" یہ مسکرا کر رہ جاتی خاندان والے تو، علی الاعلان کہتے کہ "اے بڑی بیگم نے تو نونڈیا کو کھلی چھٹی دے رکھی ہے"

گھپ اندھیرے میں زور دار اجالا گھس پڑے تو آنکھیں پہلے تو میچ میچ کرنے لگتی ہیں، پھر اسی چکا چوند اجالے کی عادی ہو جاتی ہیں ممانی بی کو تو احساس ہی نہ ہوتا تھا کہ واقعی ان کی بیٹی اور خاندان والیوں سے الگ ہے۔

ممانی بی کے میکے میں، اور اب میاں سسرال میں بھی، اتنا سخت پردہ تھا کہ مردوں کی تصویر تک دیکھنا گویا پردہ توڑ دینے کے برابر تھا۔

ہتیا کو بھی حسبِ قاعدہ سب سے پرے دکرایا جاتا۔ مگر اس نے جو ادھر ہاتھ پاؤں اچھالے تو سبھی جھڑ بیں کاٹ پھینکیں۔

رفیعہ بیگم کا زچہ خانہ ہونے والا تھا۔ دردوں سے بے حال پڑی تھیں۔ ڈاکٹر، لیڈی ڈاکٹر کا تو کیا ذکر گذر ہوتا، محلے کی دائی کو بلایا گیا۔ وہ بھی آخر کو اناڑی نکلی کچھ سمجھ پڑا۔ کچھ نہ پڑا۔ اس نے آڑے ٹیڑھے ہاتھوں سے کیا زچہ کو ایسے جھونٹے دیئے کہ الٹے لینے کے دینے پڑ گئے۔ بڑی تجربہ کار بوڑھیاں بھی ہاتھ مل کر رہ گئیں۔ مامابی کو بھی کچھ نہ سوجھا۔ ہتیا اپنے گھر ہی پر تھی۔ کنواری بالی چھوکریوں کا ایسے موقعوں پر کام بھی کیا؟ مگر شبیر میاں کو تو معلوم تھا کہ ہتیا کافی لکھ پڑھ گئی ہیں۔ چھنو خالہ کا ہتیا جو گھر میں گر پڑا تھا۔ تو انہوں نے اندھا لٹا کے سارا پانی نکلوایا تھا۔ مھنو ماما کو سانپ نے کاٹا تو یہ اثر زائل ہونے تک نیم کی ٹہنیاں بار بار جھاڑتی رہیں۔ لیکن یہ رفیعہ بیگم کو بھی کوئی دوا لگ جائے، اسے مان لیا۔ کہ ڈاکٹرنی نہیں تھیں۔ پھر بھی تھوڑی بہت دوا دارو بھی تو آتی ہی تھی۔ دوڑے دوڑے آئے۔ وہیں پردے کے پاس کھڑے نصیبن بوا سے کہلوایا۔

"چھوٹی بی بی سے کہو بہو کی طبیعت اچھی نہیں۔" ساری بات پوری ہونے سے پہلے ہی نصیبن بوا چیخ اٹھی۔ "اے میاں! تمہاری عقل سلامت ہے؟ بالی چھوکری ہے۔"

بات پوری ہونے سے پہلے ہی ہتیا خود دروازے تک پہنچ گئی اور وہیں سے بولی۔ "میری اپنی ذاتی رائے یہ ہے کہ آپ فوراً کسی لیڈی ڈاکٹر کو بلوا لیجئے۔" اور ایک ڈاکٹرنی کا پتہ بھی بتا دیا۔

شبیر میاں الٹے پاؤں واپس ہوئے۔ جانے کیا بات یاد آئی تو پھر لوٹ کر آئے، آواز دی اور کہا۔

"میں تو یہ سمجھا، ہی گیا تھا کہ وہ فیس کیا لے گی۔ !" ابھی یہ بات منہ میں ہی تھی کہ پھر بولے۔" اور فیس کا کیا ہے ! جان سے بڑھ کر تو پیسہ نہیں ہوتا۔ اللہ جانے وہ آتی ہے یا نہیں۔ ؟ پھر میں کیا کر دل گا۔ ؟"

اور ان کی آواز بھرا گئی۔ لاکھ آدمی ضبط کرے مگر بیوی کا ساتھ کچھ ایسا کچا بندھن تو ہوتا نہیں۔ اب یہ اور بات ہے کہ ان کی بی بی ان کا کہنا ذرا کم مانیں اور بات پیچھے منہ کو منہ دیئے چلی جائیں۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ یہی منہ چار سے اٹھانا ہے اور یہی منہ چار میں بٹھانا ہے۔ مگر اب یہ بات بھی نہ تھی کہ اتنی اتنی سی باتوں کو لے کر وہ کھڑے کھڑے کہہ دیتے کہ "جا و بی بی میں نے تین بار تمہیں طلاق دی۔" میاں بی بی کی زندگی بچوں کا کھیل تو ہوتی نہیں کہ جب دل بھر گیا ایک نے سب کو مخاطب کر کے کہہ دیا۔" کھیل ختم، پیسہ ہضم۔" ایسا تو نہیں ہو سکتا کہ بغیر دھوئیں کے لکڑی جلے۔

منیا کو بھی خیال آ گیا کہ اللہ جانے وہ انکار ہی کر دے۔ پھر کیا ہوگا۔؟ لپک کر باہر ہی تو نکل آئی اور بولی۔

" چلئے دونوں مل کر اسے بلا لائیں۔" اور ذرا سی چھپا کے میں وہ شبیر میاں کے ساتھ ہو گئی۔

شبیر میاں کی بی بی کی زچگی بھی گئی، چلّہ بھی نہا لیا، بات پرانی پڑ گئی، مگر خاندان والوں نے کیا کیا بہتان نہیں باندھے۔ لیکن منیا نے ذرا شکن نہ چڑھائی۔ مامانی بی نے البتہ دو چار دن منیا سے بول چال

ضرور بند رکھی۔ ، مگر پیٹ کی اولاد سے کوئی منہ پھیرے بھی تو کب تک ؟
اب تو شبیر میاں کا آنا جانا بھی شروع تھا۔ اور مینا بھی سامنے آتی تھی۔ سلام کرنے کو ہاتھ اٹھاتی مگر منہ سے کچھ نہ بولتی۔ بس چاندی کا پنجہ چاند ایسے ماتھے سے چھو جاتا۔ ممانی بی ہنس کر پیار سے ڈانٹیں بھی۔ "پڑھ لکھ کر بالکل ہی چلن بدل دیا۔ یہ بھی کوئی سلام ہوا۔!" مینا ہنس پڑتی۔

رفیعہ بیگم کی زچگی بڑی مشکلوں سے ہوا کرتی۔ پہلا بچہ تو جیسا ہوا۔ ہوا۔۔۔ دوسرا اپنے وقت کا قیصر تھا۔ ڈاکٹرنی صاف کہہ گئی تھی کہ اب کے بچہ ہوا تو جان کا خطرہ ہے۔ مگر ڈھائی دو برس پیچھے پھر رفیعہ بیگم امید سے رہیں، اور اب کے جو زچگی کا وقت آیا تو بچہ بھی ضائع ہوا اور ماں بھی۔ شبیر میاں بھری پری دنیا میں تنہا رہ گئے۔

چہلم پر ممانی بی نے بہت آنسو بہائے۔ دل تو شبیر میاں کے لئے بہت ہڑک رہا تھا۔ مگر کرتی بھی کیا بیچاری ؟ جوان بیٹی کا ساتھ تھا اور ہر ایک کے پیچھے شیطان لگا ہے۔ دنیا دکھاوے کو منہ سے کہا بھی کہ "میاں اب تو دیکھ بھال والا کوئی نہیں، ہمارے ہاں اٹھ آؤ نا۔ مگر شبیر میاں بھی ان کی مجبوری کو سمجھتے تھے۔ سر ہلا کر انکار کر دیا۔

مینا کو ان پر بڑا ترس آتا۔ بیچارے اول ہی تو اللہ میاں کی گائے تھے۔ اب تو بالکل ہی موم ہو کر رہ گئے تھے۔ دونوں بچے الگ ڈھائیں ڈھائیں پھرتے۔ مینا ہاتھ پکڑ کر منہ ہاتھ دھلا دیتی۔ ناشتے کے وقت آتے تو ساتھ بٹھا لیتی۔

ایک دن شبیر میاں بھی آئے بیٹھے تھے۔ دونوں بچے بھی ساتھ تھے۔

ممانی بی نے پھر پھیر سے ذکر چھیڑا۔" اے میاں لوگ تو کہتے ہیں بیوی کی موت کہنی کی چوٹ ہوتی ہے۔ لگتی بڑے زور سے ہے مگر ذرا دیر میں درد غائب۔ تم کب تک یونہی رہو گے۔؟ ماشاء اللہ خود بھی جوان جوان ہو، ننھے ننھے بچے ہیں، کوئی تو ہو دیکھ بھال کرنے والا۔"

شبیر میاں بولے۔ "ممانی بی رنج و غم کی بات تو جانے ہی دیجئے میں سوچتا ہوں آنے والی بچوں سے سگی ماں کا سا برتاؤ نہیں کر سکے گی اور میں یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکے گی، اور میں یہ سب کچھ برداشت نہیں کر سکوں گا۔" ان کی آواز سوبیگ سی گئی۔ پھر ٹھہر ٹھہر کر بولے۔

"کیا گھر کا گھر دا ہو گیا ممانی بی۔ اب تو دھول اڑتی ہے ہر طرف باہر سے آؤں تو کوئی منہ دھلانے والا بھی نہیں۔ پانی وانی کی ضرورت پڑے تو خود اٹھ کر لوں تو لوں، ورنہ کوئی اس کا بھی روادار نہیں کہ پیاس ہی بجھا دے بچے الگ تباہ حال۔!"

منیا کا دل اندر سے مچل اٹھا، بولی۔

"آپ ہمارے ہاں آجایئے نا۔ یہاں اماں بھی ہیں، بچوں کا جی بھی بہل جائے گا۔"

"میں آ تو جاؤں، مگر ...." شبیر میاں کی زبان گنگ ہو گئی۔

ممانی بھی بات کا رخ دیکھ کر خاموش رہ گئیں۔ منیا پھر بولی

"تنا مدران والوں سے ہی ڈر رہے ہیں نا آپ؟ اپنے کام سے کام رکھئے کنٹوں کا کام بھونکنا ہے۔ بھونکتے ہی رہتے ہیں۔"

تھوڑی سی دیر یوں ہی ہاں ہاں ہوتی رہی۔ پھر ممانی بی نے بھی زور دیا تو شبیر میاں اسی دن اٹھ آئے۔ منیا کا وقت اب بڑا

اچھا کٹ جاتا۔ تمام دن بچوں میں الجھی رہتی، بچے بھی ہل مل گئے تھے۔ اپنی ماں کو بھول کر بھی یاد نہ کرتے کبھی کبھار ایسے ہی مینا کے جسم پر کوئی خوبصورت سا کپڑا یا زیور دیکھ لیتے تو کہتے۔

"امی جی بھی ایسا ہی کرتا پہنتی تھیں۔"

"ہماری امی کے پاس بھی ایسا ہی ہار تھا۔"

شبیر میاں گھر میں رہتے ضرور۔ مگر یوں، جیسے رہتے ہی نہ ہوں۔ نہ چیٹ نہ پٹ کبھی اونچی آواز سے بولتے۔ نہ قہقہہ لگا کر ہنستے۔ ممانی بی جس ڈر سے انہیں اپنے گھر بلانے سے ڈرتی تھیں وہ بالکل ناممکن سی بات تھی۔ ایسے بھولے بھالے تھے کہ بھولے سے بھی مینا کو آنکھ بھر کر نہ دیکھتے۔ ایک دن باتوں ہی باتوں میں ممانی بی بولی تھیں۔ "بچپن میں میری بٹیا مینا کی طرح چہکتی تھی، بس میں نے یہی نام ڈال دیا۔" اس پر شبیر میاں نے آنکھیں اٹھا کر ضرور اسے دیکھا اور بڑی سادگی سے بولے۔

"واقعی اچھا نام دیا آپ نے مینا بڑی پیاری ہنسی ہنستی ہیں۔"

مینا کے چم چم چمکتے دانت گلابی گلابی ہونٹوں میں چھپ گئے۔ اتنی سادگی سے جوانتا بڑا سچ کہہ دے تو اس سے کوئی خطرہ نہیں ہو سکتا۔ شبیر میاں کے لہجہ میں کوئی گہرائی نہ تھی۔

بڑے نانا کہتے تھے۔ کتوں کا رونا بڑا نحس ہوتا ہے۔ کتے کے رونے کی آواز آئے تو صدقہ دلوا دینا چاہیئے۔ اس رات رہ رہ کے کتے بھونکتے رہے۔ اور صبح ہی صبح نصیبن بوا نے تازہ تازہ دودھ ابالنے کے لئے چولہے پر چڑھایا تو وہ آپ ہی آپ پھٹ گیا۔ نصیبن بوا زمانہ دیکھے ہوئے

تھیں۔ منہ سے کچھ نہ بولیں، مگر مولا کی دھائی مانگنے لگیں۔ چار دن کی بیماری میں ممانی بی چٹ پٹ ہو گئیں۔ اور مینا سے آلو بن گئی۔ اندھیاروں چھپتی روتی پھرتی۔ بستر پر اوندھے منہ پڑی پڑی سسکیاں لیتی رہتی بیسیوں ہی تو پیام اچھے برے آئے ہوں گے۔ مگر ماں کو پسند نہ آئے۔ اور جو ماں کو پسند آیا، بیٹی کو ناپسند ہوا۔ بیٹی کے بیاہ کا ارمان جی کے جی میں ہی لے گئیں۔ اب تو خاندان والوں کو موقع ہی مل گیا۔ جہاں دیکھو وہاں مینا اور شبیر میاں موضوع بنے ہوئے ہیں۔ اوندھی، سیدھی، جھوٹی، سچی ہزاروں ہی باتیں اڑائی گئیں اور مینا ہول ہول جاتی۔ باپ کا سایہ تو مدت ہوئی اٹھ چکا تھا۔ ماں چھاؤں بن کر سہارے بیٹھی تھیں وہ بھی چل دیں۔ روپے پیسے کی کمی نہ تھی، مگر روپے پیسے ہی سے سب کام تو نہیں چلتے۔ بولنے والے بھی کہاں تک بولتے۔ تھک ہار کر خود ہی چپ رہ گئے۔ شبیر میاں اب بھی مینا کے ہاں ہی رہتے۔ باہر سے آتے ہی سیدھے اپنے کمرے میں پہنچ جاتے۔ گرمی کے دن ہوتے تو دالان میں نظر آتے۔ مونڈھا بچھا ہوا، اخبار منہ سے لگا ہوا۔ سردیوں اور بارشوں میں تو اتنا بھی نہ ہوتا۔ ان کے آتے ہی گول بیچ دار زینے پر مانوس سی کھٹ کھٹ ابھرتی اور پھر نرم نرم سی بیٹھی آواز۔

"اے خانساماں کھانا لگا دو۔ میاں آ گئے۔"

شبیر میاں اور مینا اسی زندگی کے عادی ہو گئے۔ نہ ان کے دل میں ان کے لئے کوئی جگہ تھی، نہ انہوں نے ان کو اپنے دل پر چڑھایا۔

ایک دن ارشد اپنی آنکھیں کھجلاتا ہوا آیا اور منمنا کر بولا۔

"ہماری آنکھوں میں کھجلی ہوتی تھی تو امی کاجل لگا دیتی تھیں۔"

"ارے رے۔" منیا نے اسے پیار سے گود میں اٹھا لیا۔" تو بھئی مجھ سے پہلے ہی کیوں نہ کہا۔ میں نہ بنا دیتی اپنے راجہ گڈے کے لئے کاجل۔؟"

منیا نے سکوری بھر کے ارنڈ کا تیل شیشی سے انڈیلا۔ روئی کو بل دیکر بتی بنائی اور کونے میں چراغ سا بنا کر اوپر سے مٹی کا ایک پیالہ اوندھا دیا۔ گھنٹہ بھر کے بعد یہ اتنا بڑا کاجل جم گیا۔ منیا نے ڈبیہ میں کاجل پکڑا اور منے کو گود میں بیٹھا کر اس کی آنکھوں میں سلائی پھرانی چاہی۔

"آں ہاں۔ امی کہتی تھیں آنکھوں میں تو ہاتھ نہیں پھیرنا چاہیئے"۔

منیا ہنس پڑی۔" اچھا تو انگلی سے لگا دیں۔"

"ہاں۔" ارشد نے سر ہلا دیا۔

منیا نے ارشد کی دونوں آنکھوں میں انگلی پھیری۔ بخھوڑا کاجل پھر بھی انگلی پر لگا رہ گیا۔ وہ اس نے اپنی آنکھوں میں بھر لیا۔ اور بھول بھی گئی کہ کاجل لگایا تھا۔

شام کو شبیر میاں آئے۔ گول پیچ دار زینے پر مانوس قدموں کی کھٹ کھٹ سنائی دی۔ پھر میٹھے لہجہ میں آواز آئی۔

"اے خانساماں کھانا لگا دو۔ میاں آ گئے۔"

دستر خوان پر بیٹھے تھے کہ ارشد منیا کا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹتا ہوا لے آیا۔

"ابا میاں آپا نے ہماری آنکھوں میں کاجل لگا دیا ہے۔ دیکھا آپ نے۔"

"ہاں ہاں۔ بڑی اچھی ہیں تمہاری آپا۔" اور وہ اسی انہماک سے کھاتے رہے۔ کھانے کے بعد دالان میں نکل کر مونڈھے پہ بیٹھے تھے کہ منیا آ گئی۔ اخبار دیتے ہوئے بولی۔

"ذرا پڑھنے کے لئے لے گئی تھی۔ معاف کیجئے بغیر پوچھے ہی اٹھا لیا۔" شبیر میاں نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی معذرت پر کچھ کہنا چاہتے تھے۔ مگر اکدم رک کر سادگی سے بولے۔

"ارے میں نے کبھی غور ہی نہیں کیا۔ منیا تمہاری آنکھیں کتنی خوبصورت ہیں۔" اور اخبار لے کر یوں پڑھنے میں منہمک ہو گئے گویا کسی لڑکی کی خوبصورت آنکھوں کی تعریف نہ کی ہو۔ موسم کی تعریف کی ہو۔ "واہ بھئی کیا اچھا موسم ہے۔!"

منیا بوکھلا کر الٹے پاؤں بھاگی۔ اس کا پیر ساڑی سے الجھ گیا اور وہ گر پڑی۔ شبیر میاں نے لپک کر اسے اٹھایا۔ نرم نرم، گرم گرم پروں والی فاختہ گویا ہاتھوں میں آ گئی۔ سادگی سے بولے۔

"ذرا سنبھل کے نہیں چلتیں، ابھی ہڈی چورا ہو گئی ہوتی!"

اور اٹھاتے میں منیا کا سر ان کی ناک سے اتنی قریب ہو گیا کہ بھینی بھینی سی خوشبو سے ان کا پورا وجود مہک مہک گیا۔

شبیر میاں نے اس دن اخبار پڑھا ضرور، لیکن اگر کوئی پوچھتا۔ "سنائیے میاں آج کی خاص خبر کیا ہے۔؟" تو وہ سٹ پٹا کے رہ جاتے۔

منیا تین دن سے کھانسی نزلے میں پڑی گھل رہی تھی۔ شبیر میاں کو تین دن سے وہ مانوس کھٹ کھٹ سنائی نہ دی تھی انہوں نے چاہا خبر لینے کو جائیں۔ مگر پھر ارادہ ترک کر دیا۔ جانے کا ارادہ کرتے تو لگتا کہ نرم نرم پروں کے ڈھیر میں دھنسے جا رہے ہیں۔ گھبرا کر وہ باہر نکل آتے۔

"اونہہ! نزکام بھی کوئی بیماری ہوئی بھلا۔ آپ ہی ٹھیک ہو جائیگا۔"

ایک دفعہ وہ بخار میں بھن بھن کر اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ تو منیا نے

انہیں مشورہ دیا تھا۔

"آپ شادی کیوں نہیں کر لیتے؟ آخر کوئی دیکھ بھال والا بھی تو چاہیئے۔"

اب انہیں خیال آیا یہ مینا شادی کیوں نہیں کر لیتیں۔؟ آخر کوئی دیکھ بھال والا بھی تو چاہیئے نا۔!" پھر انہیں مینا اور رمانی بی کے احسان یاد آ گئے۔ انہوں نے دل میں تہیہ کر لیا کہ مینا کے لائق بر ڈھونڈ نکالیں گے۔ مینا۔ جو اتنی پیاری اتنی خوبصورت اتنی سگھڑ، اتنی تعلیم یافتہ ہے۔ اس کے جوڑ کو جوڑ تو ملے۔ مینا کا دل کتنا نرم تھا۔ کئی بار وہ اس کی آنکھوں میں نمی دیکھ چکے تھے۔ بچوں سے باتیں کرتے کرتے وہ رفیعہ بیگم کی یاد میں آنسو بہانا شروع کر دیتی۔ بچوں سے اتنی ہل مل گئی تھی۔ کہ رفیعہ بیگم کی کمی بھلا دی۔ بچے اب صاف ستھرے رہتے۔ روتے بسورتے نہ تھے اور صورت پر بہار آ گئی تھی۔

"لاحول ولا۔" شبیر میاں نے سوچا۔ "میں بھی کتنا کورا اخلاق ہوں کہ وہ تو مجھ سے، میرے بچوں سے اتنی ہمدردی کرے اور میں اس کی خبر تک نہ لوں۔" اخبار مونڈھے پر رکھ کر اٹھے اور مینا کے کمرے کی طرف چلے۔

مینا نے سردی کے سارے سوئٹر چڑھا لیا تھا۔ اب جو گرمی ہوئی تو اسے اتار پھینکنا چاہا۔ سوئٹر کھلے گلے کا نہ تھا۔ گردن میں سے اتارنا چڑھانا پڑتا۔ دروازے کی طرف پیٹھ کر کے ساڑی کا آنچل دونوں گھٹنوں میں دبا کر وہ پیٹھ کے بل جھکے جھکے، زور لگا کر سوئٹر اتار رہی تھی۔

شبیر میاں روائیتی کانچ کی جوتی اور بالوں کی سنہری لٹ دیکھ کر

اندھا دھند عاشق ہو جانے والے شہزادوں میں سے تو تھے نہیں، مگر یہاں ایک جگمگاتی صبح دیکھ کر گھبرا اٹھے۔ ڈھیر سارے نرم گرم پروں میں ان کو اپنا وجود ڈوبتا ہوا محسوس ہوا اور وہ ہڑبڑا کر لوٹ گئے۔

مینا نے قدموں کی چاپ سن کر بمشکل سوئیٹر کھینچ کر چھینکا اور دیکھا تو شبیر میاں سر نیہوڑائے جلدی جلدی چلے جا رہے تھے۔

تین دن سے تو بخار ہی تھا ——— اور ——— تین دن مینا نے یوں ہی کمرے میں کاٹ دے۔ ہمت نہ پڑتی تھی کہ باہر نکلے۔ ساتویں دن اپنے کمرے سے باہر آئی تو سہی۔ مگر شبیر میاں سے یوں لجائی لجائی جیسے نئی نویلی دلہن سسرال دکھا دے کو دولہا سے شرمائے اور موقع ملنے پر رہ رہ کے کن انکھیوں سے دولہا کو دیکھتی جائے۔

شبیر میاں چپ چپ سے تھے۔ آگے کبھی انہیں یہ خوشبو اپنے تکئے پہ، بستر پر مل چکی تھی۔ جو اپنے منہ سے کہتی تھی۔

"میں مینا کے پاس سے آئی ہوں۔"

اب مینا اتنی گئی گذری نہ تھی۔ کہ کسی کے بستر پہ لوٹیں لگاتی پھرے۔ منی اور ارشد سونے کے لئے کمرے میں جانے لو اسے کبھی گھسیٹ لیتے۔

"آپا ہمیں ڈر لگتا ہے نا۔ آپ کبھی ہمارے ساتھ چلئے۔"

تب تک وہ سوئیں سوئیں، یہ بیٹھی کتابیں ٹٹولتی رہتی کبھی کبھار پیٹھ سیدھی کرنے کو شبیر میاں کے بستر پہ لڑھک جاتی۔ انہی کا پلنگ اس وقت خالی ہوتا تھا۔

بدلی چھائی، برس گئی۔ آسمان پھر نیلا نیلا، دھلا دھلا تھا۔ وہی شام کی واپسی، وہی بچوں کی شرارت، وہی مینا کی کھنکتی ہوئی ہنسی

اور گول پیچ دار زینے پہ مانوس سی کھٹ کھٹ کے بعد نرم، ملائم، گھلی گھلی سی آواز۔

"اے خانساماں کھانا لگا دو۔ میاں آگئے۔!"

جاتے جاتے ایک دن شبیر میاں کہہ گئے۔" منیا ان کپڑوں کو ذرا دھوپ دکھا دینا، کیڑا نہ لگ جائے۔"

اس دن تو منیا سے نہ ہو سکا۔ دوسرے دن صبح ابھی شبیر میاں گھر ہی سے نکلے تو سارا سامان لے کر بیٹھ گئی۔ کپڑوں کے صندوق میں زیورات کی صندوقچی بھی نکلی۔ بچے بھی آدھمکے۔ صندوقچی کھول کے یوں ہی منیا بیٹھ گئی سامان الٹ پلٹ کرنے لگی۔ صندوقچی بھری پڑی تھی۔ زیور سے لے کر افشاں تک، بس جوں کی توں۔ بچے پاس بیٹھے اوندھی سیدھی باتیں کر رہے تھے۔ ایک بھی سوال انھوں نے اپنی ماں سے متعلق نہ کیا۔

منیا خود ہی بول اٹھی۔

"امی کی یاد آتی ہے منے۔؟" ارشد اور منی ایک زبان ہو کر بولے۔" اوں ہوں۔ آپ جو اتنی اچھی ہیں۔!"

"مگر میں امی کی برابری کہاں کر سکتی ہوں۔" وہ ہنس کر بولی۔

"اوں،" ارشد بولا۔" ہم تو آپ کو اپنی امی سمجھتے ہیں۔!" منیا کا منہ لال ہو گیا۔ ہونٹ کانپ اٹھے۔ اس کی آنکھوں کے کونے گیلے گیلے ہو گئے۔ بڑی مشکل سے مسکرا کر بولی۔" سچ۔؟"

"ہاں اور کیا۔!" ارشد بولا۔

منیا نے صندوقچی کا نچلا خانہ ٹٹولا۔ کالی پوت کا لچھا پڑا چمک رہا تھا۔ اس نے لچھا اٹھا کر مٹھی میں دبا لیا اور گھڑی کی طرف دیکھا۔

دس بجنے میں پندرہ منٹ تھے۔ روز اسی وقت شبیر میاں گھر سے باہر جاتے تھے۔

وہ تیزی سے لپکی۔ زینے کے پاس تھوڑی دیر رکی مٹھی کھولی اور پھر دوڑتی ہوئی دروازے میں رک گئی۔ "سنیئے۔" وہ ٹھٹھک گئی۔

شبیر میاں بھی رک گئے اور ایک دم چونک گئے۔ دھانی ساڑی میں اس کا ہلکا پھلکا جسم کانپا جا رہا تھا۔ ساڑی کے آنچل کا ایک کونہ پتلے پتلے ہونٹوں میں دبا ہوا تھا۔ آنکھیں جھکی ہوئی تھیں پلکیں لرز رہی تھیں اور گوری گوری گردن میں سانسوں کے زیر و بم کے ساتھ ساتھ کالی پوت کا لچھا کانپ رہا تھا۔

وہ اٹک اٹک کر بولی۔

"سنگھار دان میں اور تو سب چیزیں ہیں۔ مگر مسّی نہیں ہے۔!"

اور وہ منہ پلو میں چھپا کر شرما کر بھاگ گئی۔ شبیر میاں کے آس پاس نرم نرم فاختئی پروں کا ڈھیر سا لگ گیا اور وہ ڈوبتے ہی چلے گئے۔

شام کو جب وہ ہاتھ میں مسی کی دوہری پوڑی سنبھالے گھر میں داخل ہوئے تو گول پیچ دار زینے پر مانوس سی کھٹ کھٹ ہوئی اور نرم، ملائم سی، شکر میں گھلی ہوئی میٹھی آواز گونجی۔

"اے خانساماں کھانا لگا دے، وہ آ گئے ہیں۔!"

❖

آدم اور حوّا

چھک - چھک - چھک - ریل چلی جا رہی تھی -
"ہاں جی - اگر میں اس چلتی گاڑی سے گر پڑی تو - ؟"
عورت نے مسکراتے ہوئے پوچھا -
مرد نے اخبار سے نگاہیں ہٹائے بغیر، ناگواری سے کہا -
"اونہہ - وقت پڑنے پر دیکھا جائے گا -"
تھوڑی دیر بعد مرد نے اخبار تہہ کر کے رکھ دیا اور مسکراتے ہوئے پوچھا -
"ہاں جی —— اگر میں اس چلتی گاڑی سے گر پڑا تو - ؟"
عورت نے ایک لمحہ کو مرد کی طرف دیکھا اور دوسرے ہی لمحے وہ چلتی گاڑی سے کود پڑی -

❖

پاندان

"ننھے میاں کل پھر آئے تھے۔" بڑی بیگم نے چھالیہ کترتے کترتے آہستہ سے کہا۔

اشرف میاں اخبار میں ایسے منہمک تھے کہ انہوں نے بڑی بیگم کی بات پر کان ہی نہ دئے۔ بڑی دیر بعد پڑھتے پڑھتے یکدم اچھل کر بولے "ابھی تم نے ننھے کا نام لیا تھا۔؟"

بڑی بیگم نے سر اس انداز سے جھکا لیا، جیسے کہتی ہوں۔ "جی ہاں۔"

"اور صاحب زادی کہاں تھیں۔؟" انہوں نے تیز ہو کر پوچھا۔

اب بڑی بیگم کی بن گئی۔ "وہ بی صاحب زادی کہاں تھیں۔؟ خود انہوں نے ہی ننھے میاں کو لا کر اپنے کمرے میں بٹھایا۔ کرمن سے کہہ کر چائے بنوائی اور خود ہی ان کے سامنے کھڑے ہو کر پیالیوں میں انڈیلی۔ میں ادھر سے گزری تو کیا دیکھتی ہوں۔ کہ چائے کی چسکیاں لی جا رہی ہیں اور مزے مزے میں ہنس ہنس کر باتیں ہو رہی ہیں۔"

اشرف میاں نے جھنجھلا کر اخبار اتنی دور پھینکا کہ وہ بجائے میز پر ٹکنے کے زمین پر جا پڑا۔

"اور تم نے کچھ بھی نہ کہا۔؟"

"اے لو۔ بھلا یہ کیا کہنی۔ کچھ صاحب زادی میرے ہاتھ کی ہیں۔
اب تو زمانہ ہی الٹا ہو گیا ہے۔ کہ بجائے اس کے کہ چھوٹے بڑوں سے ڈریں
الٹے بڑے چھوٹوں سے کانپتے ہیں۔ کیا میری مت ماری گئی تھی کہ دو
بول بول کر ان سے سترہ باتیں سنی۔؟"
"سترہ باتیں کیوں سنیں۔؟ کیا تم ان کی ...." وہ کچھ دیر رکے،
پھر اسی تیزی سے بولنے لگے "کیا تم ان کی بزرگ نہیں ہو۔؟"
"اے ڈالو چولہے میں ایسی بزرگی کو۔ جب وہ باپ کا ڈر نہیں
مانیں تو ہم تو تیسرے کونے پڑے ہیں۔"
"تیسرے کونے کیوں۔؟ کیا تم اُن کی خالہ نہیں ہو۔؟"
"اونہہ۔" انہوں نے زور سے سر دتنہ جھٹک دیا، "ایسا ہی بڑا خالہ
کا مان ہوتا تو یوں کھلے خزانے.... "وہ بڑے ڈرامائی انداز سے جملہ
ادھورا چھوڑ خاموش رہ گئیں۔
"کیا۔؟ کیا بات ہے۔؟" اشرف میاں بڑی بے تابی سے بولے۔
"وہی بات کیا ہوئی۔ ہمارا تمہارا ڈر ہوتا تو یوں آپو آپ اپنے
دیدوں اپنا بیرنہ ڈھونڈتیں۔"
سارا معاملہ اشرف میاں کی سمجھ میں آ گیا۔ بھائی خون جوش کھا
گیا۔ سرخ پڑ کر بولے۔
"یہ بالشت بھر کی چھوکری سمجھتی کیا ہے اپنے آپ کو۔؟ اس کا
دانہ پانی نہ بند کر دیا تو کہنا۔ سنو جی! اب سے بڑے دروازے کو قفل
ڈال کے رکھنا۔ ایک چابی تمہارے پاس ایک چابی میرے پاس۔
جس کو بھی باہر جانے کا کام پڑے ہم دونوں میں سے کسی سے پوچھ کر جائے

سمجھ گئیں نا۔"

بڑی بیگم ہول گئیں۔" دوئی کیسی بات کرتے ہیں آپ۔ جوان بچی بے یوں پابندی۔ کبھی جان پر کھیل گئی تو۔؟"

"اجی محبت دیکھیے ایسے جان پر کھیلنے والے۔" اشرف میاں تاؤ میں آکر بولے۔ مگر دوسرے ہی لمحے وہ ذرا رک گئے۔

"کیا کہا تم نے ابھی۔؟" وہ انگلی اٹھا کر بولے۔

"کہتی کیا۔ یہی کہ جان وان پر نہ کھیل جائے۔"

اشرف میاں کو خیال آیا کہ رضیہ ان کی کتنی لاڈلی ہے۔ کیسے اس کی زندگی سے ان کی اپنی زندگی ہے۔ اور رضیہ کی ماں کی میت کے بعد سے تو وہ رضیہ پر یوں بھی زیادہ ہی جان چھڑکنے لگے تھے۔ ویسے پہلے ہی رضو سے وہ کیا کم محبت کرتے تھے۔ مگر اس کی ماں کی موت نے تو انہیں رضیہ کا ہی بنا کے رکھ دیا۔ اور یوں تو چار بیٹوں پہ بیٹی ہو تو اس کے لاڈ پیار کا کیا کہنا۔؟

رضیہ جب ایک ماہ کی تھی تو یہ اس کی ننھی منی گلابی گلابی انگلیاں اپنے ہونٹوں میں دبا لیتے اور کھل کھلا کر ہنسا کرتے۔ اور جب چھ ماہ کی ہوئی تو اسے تکیوں کا سہارا دے کر کونے میں بٹھا دیتے اور خود اس کے سامنے شیر بن کر ہاتھوں پیروں کے سہارے چلا کرتے۔ اس کے معصوم قہقہوں سے سارا گھر کھل کھلا اٹھتا۔ پھر ایک سال کی ہوئی تو یہ اپنے ہاتھوں اسے سہارا دے کر چلایا کرتے۔

"پاؤں پاؤں، سونے کے پاؤں
رانی جائی راجہ کے گاؤں"

وہ تھرک تھرک کر چلتی اور ان کے دل میں پھول چٹکتے جاتے۔ پھر یونہی ماہ و سال گزرتے رہے اور پھول چٹک چٹک کر گلزار ہوتے رہے۔ جب رضیہ اٹھارہ سال کی ہوئی تو ایک دن چپکے سے اس کی ماں نے آنکھیں موند لیں۔ معمولی سا میعادی بخار تھا۔ مگر جس کی پوری ہو گئی ہو اسے تو معمولی سا بہانہ بھی کارگر ہو جاتا ہے۔

اشرف میاں کی دنیا لٹ گئی۔

کہاں تو وہ زندگی کہ گھر بھرے میں خوشیاں مہکتی تھیں۔ دن رات قہقہے اچھلتے تھے۔ یا اب یہ عالم کہ رضیہ گھٹنوں میں سر دیئے جو بیٹھی ہے تو ادھر کا سورج ادھر ڈھل جائے اور اس کا سر نہ اٹھے۔ باپ اپنے دفتر کچہری کے کاموں کو بھول بھال جو ہاتھوں میں منہ چھپا کر بیٹھے تو نہ کھانے کا خیال نہ پینے کی فکر۔ !

ذکیہ بیگم کی اچانک موت نے رضیہ کی محبت ان کے دل میں دگنی تگنی کر دی۔ ہر بات میں رضیہ کا خیال، ہر وقت رضیہ کی فکر۔ خود اپنا یہ حال کہ سوکھ سوکھ کے کانٹا ہوتے جا رہے ہیں مگر رضو بی ہیں تو زندگی ہے۔ ورنہ کچھ نہیں۔ رضیہ بی۔ اے کا پہلا سال تھا۔ ابھی پڑھائی شروع بھی نہ ہوئی تھی کہ ماں کا غم سر پہ آ پڑا۔ تعلیم و علیم کو بھول بھال بس اپنے کمرے میں پڑی پڑی جھکو جھکو روئے جاتیں۔ ادھر باپ بے حال، ادھر بیٹی تباہ۔ جانے بڑی بیگم نہ ہوتیں تو اس گھر وائے کا کیا حشر ہوتا!

پرسے کے لئے گاؤں سے ذکیہ بیگم کی رشتوں کی بہن رفیعہ بیگم آئی تھیں۔ شادی اور سہاگ کے کوئی سترہ سال بڑی امنگوں اور خوشیوں میں گزارے تھے۔ سات آٹھ سال بعد خدا نے ایک بیٹا بھی دیا تھا،

اور بیٹیا دیکھ میاں چھین لیا تھا۔ کو کہ ٹھنڈی کی تو سہاگ کی سرخی چھین لی۔ اوپر والا جو چاہے سو کرے آج کل کی بات بھی نہ تھی۔ برس گزر گئے تھے مگر غموں کی اندیاں ہو ئی تھیں۔ موت کی چوٹ ان کا دل کبھی کھا چکا تھا۔ رضیہ کا غم بھی دیکھا نہ جاتا۔ نہ وہ ہوتیں، نہ رضیہ اور اشرف میاں کی زندگی ہوتی۔ ان دونوں باپ بیٹی کا کیا تھا۔ کچھ خبر بھی نہیں کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے اور کیا نہیں۔ اگر یہ کھانا لگوائیں تو پکے، نہ کہیں تو دن دن بھر چولہے ٹھنڈے پڑے ہیں۔ کھانا میز پہ لگ کر ٹھنڈا ہو چکا ہے مگر نہ اپنی جگہ سے ہلتی ہیں نہ وہ۔ چلو میز پہ آ کر بیٹھ بھی گئے مگر یہ نوالہ توڑتی ہیں نہ وہ۔ ایسے بھی کہیں زندگی گزاری جاتی ہے۔ وہ ہوتیں نہ دوبارہ سے اس گھر میں زندگی لوٹ کر آتی۔ ایسے غیر محسوس طریقے سے وہ اس گھر کے ماحول میں رچ بس گئیں کہ ان کے بغیر اب تنکا بھی نہ ہلتا۔ گھر کا انتظام آپی آپ ان کے ہاتھوں میں چلا گیا، اور ادھر رضیہ کا دل بھی چنو کے ساتھ بہلتا گیا۔

دن اور رات کی سنگت نے اب یہ احساس مٹا دیا تھا کہ رضیہ کی کوئی ماں نہیں۔ بڑی بیگم ماں تھیں، اور ایسی ماں تھیں کہ اب ایک کی بجائے انہیں چھ چھ بچے تھے لڑکوں سے دل بہر تو نہیں ہوتا۔ مگر لڑکیوں کے مقابلے میں ان کے دل ذرا سخت ہی ہوتے ہیں۔ بھائی بھی بڑے بڑے تھے اور دنیا کی اچھی خاصی سمجھ رکھتے تھے۔ ماں کا غم تو بس کچھ رضیہ کے جی کو ہی لگا۔ بڑے دو بیٹے تو ماں کی زندگی میں ہی پاکستان سدھار چکے تھے۔ دو چھوٹے علی گڑھ میں تعلیم پاتے تھے۔ جس وقت ماں مریں بڑے بیٹے کوئٹہ میں تھے اور چھوٹے مری میں تار بھجوائے ضرور گئے مگر ماں کو مٹی دینا نصیب نہ ہوا۔

رضیہ نے دل توڑ غم سے آنکھیں کھولیں تو سامنے بس بڑی بیگم کو پایا۔ اور اب دن گزرنے پر تو وہ یوں سمجھنے لگی کہ گویا وہی اس کی ماں ہو۔ کبھی بھول کر بھی خیال نہ آتا کہ ایک ماں تو خیر چھوڑ کر چلتی بنیں۔ یہ بھی کبھی دور ہو سکتی ہیں۔ مگر ایک دن جب بڑی بیگم نے اپنا بستر باندھتے ہوئے جانے کا اعلان کر دیا تو رضیہ کے ہاتھوں سے کتاب چھوٹ گری۔

"آپ جا رہی ہیں خالہ بی۔" اس نے کھوئے کھوئے انداز میں کہا۔

"اور کیا بیٹا کوئی کسی کا عمر بھر کا ساتھ تھوڑے ہی دے سکتا ہے، بس اوپر والے کی نگاہ رہے۔" انہوں نے ہولڈال کے بند کستے ہوئے بڑی رقت بھری آواز سے کہا۔

"اور پھر یہاں ہم لوگوں کا کیا ہوگا۔؟" رضیہ نے بڑے دکھ سے سوال کیا۔

بڑی بیگم نے کوئی جواب نہ دیا۔

رضیہ نے اپنے آپ میں کہنا شروع کیا۔ "اچھا ہے، بھائی جان اور بھابی جان تو پاکستان میں خوش ہیں۔ الطاف بھائی اور چھوٹے بھیا ہوسٹل میں مگن۔ ایک ہم بدنصیب ہیں۔ اونہہ۔! مرے تو کیا جیئے تو کیا"

بڑی بیگم نے ذرا کرب سے اس کی طرف دیکھا۔

"دونی بی بی یہ منحوس باتیں کیسی کر رہی ہو۔؟"

چنو پاس بیٹھا اپنے چھوٹے ٹرنک میں کپڑے ٹھونس رہا تھا۔ وہیں سے چلا کر بولا۔

"تو پھر آپ مر کیوں نہیں جاتیں۔"

رضیہ چنو سے مخاطب ہو گئی۔ "خالہ بی کو ہم سے محبت ہوتی تب

رکھتیں۔ وہ تو ....."

بڑی بیگم نے لپک کر اس کا منہ بند کر دیا۔" تمہاری باتیں بھی نرالی ہوتی ہیں بی ـــــ میرا کون ہونا بیٹھا ہے جس میں اپنا جی اٹکاؤنگی۔"

ماں کی موت کے بعد سے رضیہ کے منہ پر ہنسی نہ آتی تھی۔ بس آنسو ہی آنسو تھے کہ امڈے آتے۔

بڑی بیگم نے بڑے دکھ سے رضیہ کو دیکھا۔

"میں چلی تو جاؤں، مگر پھر کوئی تو نہ ہوگا کہ آنسو ہی پونچھ دے۔"

انہوں نے ہولڈال کے بند کھول دیئے۔

دن چیونٹی کی چال گزرنے لگے۔

بڑی بیگم رکنے کو تو رک گئیں، مگر اپنے آپ میں کھسیائے جائیں۔ اگر رضیہ کے آنسوؤں کا واسطہ نہ ہوتا تو کبھی کا گھر چھوڑ چھاڑ کر چلی جاتیں۔ اشرف میاں ایسی سیلڈسی ناک کے تھے کہ کوئی چیز میاں کے من نہ سہانی۔ پٹھان تھے اور گورے چٹے بھی۔ بات بات پر سرخ پڑ جاتے۔ خون جوش کھانے لگتا۔ بڑی بیگم کی مروت ما متا کو تو کچھ سمجھتے ہی نہ تھے۔ یوں ان سے برتاؤ کرتے جیسے یہ تو ان کا حق ہی تھا۔ انسان کچھ تو غیر اور اپنے دلے میں تمیز رکھتا ہے۔ مگر وہ تو ان پر اپنا حق سمجھے بیٹھے تھے۔ مگر دن گزرے تو وہ بھی ان کے مزاج کی عادی ہوتی گئیں اور اب تو یوں ہونے لگا کہ وقت پڑے پر خود اشرف میاں سے ضد کر کے اپنی بات منوا لیتیں۔

اشرف میاں شہر میں وکیل تھے۔ نام بھی بڑا تھا۔ اور سا کیوں بھی خود بھی تعلیم یافتہ تھے۔ بیٹوں کو بھی تعلیم دلوائی اور بیٹی کو بھی۔ پردہ

حجرہ برائے نام ہی تھا۔ روشن خیال لوگ تھے، پرانی باتوں کا چلن ان
کے ہاں نہ تھا۔ نہ رضیہ کو کسی بات پر پابندی تھی، نہ کہیں آنے جانے پر
روک ٹوک۔ کالج بھی جاتی تو کھلی موٹر میں۔ یوں خوبصورتی اور دکھاوے
کو ریشمی پردے بھی پھڑپھڑاتے تھے۔ مگر ان سے پردوں کا کام نہ لیا جاتا۔
ذکیہ بیگم شہر میں بیاہی گئی تھیں۔ جیسا ماحول انسان کو ملتا ہے۔
اسی کا عادی ہو جاتا ہے۔ ذکیہ بیگم کا بھی وہی چلن ہو گیا۔ جوان کی
سسرال کا تھا۔ بڑی بیگم رہیں گاؤں والی، یہاں آ ملیں تو عجب ترقی
پسندی دیکھی۔ بولیں۔ ؟ کچھ اپنے گھر کی سی بات تو نہ تھی۔ پر سے کو آئی
تھیں، خواہ مخواہ گھر کے معاملات میں دخل اندازی کر کے نکو کیوں بنتیں۔
ایک دن بڑی بیگم پورچ میں کھڑی تھیں۔ کوئی چار ساڑھے
چار بجے ہوں گے کہ اکدم موٹر آ کے رکی۔ رضیہ اتری۔ چہرے پر ہنسی
بکھری ہوئی۔ منہ تمتما رہا تھا۔
بڑی بیگم نے اسے اوپر سے نیچے تک دیکھا۔ ماں کی موت کو اتنے
دن گزر گئے تھے۔ کبھی بھولے بسرے بھی مسکراہٹ منہ پر نہ ٹھٹکی تھی۔
آج تو انگ انگ مسکرا رہا تھا۔
پیچھے پیچھے چلتی چلتی اس کے کمرے تک آئیں۔ رضیہ نے کتابیں
میز پر پٹخ دیں اور ہنس کر بولی۔
"خالہ بی آج کالج میں مشاعرہ تھا، بس مزہ آ گیا۔"
بڑی بیگم کو اس میں تو ہنسی کا کوئی پہلو ہی نظر نہ آتا تھا حیرت
سے بولیں۔ "پھر۔؟"
"ارے خالہ بی۔ بڑے اچھے اچھے شاعر آئے تھے۔ اس قدر

ہنگامہ رہا آج۔ آپ بھی چلتیں، بڑا لطف رہتا۔"

"نہ بابا۔" خالہ بی کانوں پر ہاتھ رکھ کر بولیں، "غیر مردوں کے سامنے جانے بھلا کچھ اچھا لگتا ہے۔"

رضیہ زور سے ہنسی۔ "واہ خالہ بی یہ اچھی سنائی۔ پھر یہ تو دیکھئے کہ اتنے سارے لوگوں میں کون کسی کو دیکھتا بیٹھتا ہے۔"

"اے واہ! دیکھتا کیسے نہیں۔ نگاہ پڑ ہی جاتی ہے۔"

رضیہ کا چہرہ گلابی گلابی ہو رہا تھا۔ "آپ بھی کیسی پرانے قنوں کی سی باتیں کرتی ہیں۔ اچھا دیکھئے کسی دن اپنے ہاں مشاعرہ منعقد کریں گے۔"

"نہ بی بی،" بڑی بیگم بول گئیں، "ایسے غیر مردوں کا جمگھٹ اپنے ہاں نہ لگا بیٹھنا۔ خدا رسول کا بھی کچھ خوف ہے کہ نہیں۔؟"

غیر مردوں کا جمگھٹ تو خیر وکیل صاحب کے ہاں نہ لگا، مگر ایک دن رضیہ کالج سے لوٹی تو اس کے ساتھ ایک نوجوان بھی بیٹھا ہوا تھا۔ گورا رنگ، بڑے بڑے سنہرے بال۔ دونوں ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے۔

ہنسی کی غیر مانوس آواز سن کر بڑی بیگم نے کمرے کی کھڑکی سے جھانکا۔ رضیہ موٹر کے دروازے میں اندر کی طرف سر ڈالے کھڑی تھی۔ اور ہنسے جا رہی تھی۔

"اس دن آپ کی نظم تو واقعی سب پر چھا کر رہ گئی تھی۔"

"آپ کی ذرہ نوازی ہے، ورنہ ایسی کوئی قابلِ تعریف نظم تو تھی نہیں۔"

ایک دلکش قہقہہ بلند ہوا۔ "اب یہ آپ کی کسرِ نفسی ہے۔ ورنہ

آپ خود جانتے ہیں کہ بار بار آپ کو ڈھوایا گیا۔ اور آپ نے جو رباعیاں پڑھی تھیں۔ وہ ... " اکدم وہ رک کر بولی۔ "ارے میں نے آپ سے یہ بھی نہیں کہا کہ اندر چل کر بیٹھیے۔ آپ بھی سوچیں گے میں کتنی بدتمیز ہوں۔"

"اوہ۔" وہ مسکرایا۔ "ایسی کوئی بات نہیں۔" اور موٹر سے نیچے اتر آیا۔ سفید قمیص، سفید پتلون، اونچا سا قد، ہنستا ہوا چہرہ ۔ بڑی بیگم کو اس میں کوئی برائی نظر نہ آئی۔ مگر یہ کیا کم برائی تھی کہ رضیہ اس سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ ایسے غیر مرد سے جو نہ ماں کا سگا، نہ باپ کا سگا۔ توبہ۔

رضیہ کے چہرے کی ویرانی اور وحشت اب دور ہوگئی تھی اور اس کی جگہ مستقل سرخی چھائی رہنے لگی۔ یا تو سدا خاموش خاموش رہتی تھی۔ یا اب اپنے آپ میں مسکرائے جاتی، گنگنائے جاتی۔

ایک دن رضیہ صبح سے جو کالج گئی تو شام تک نہیں لوٹی۔ رات کے کوئی دس ساڑھے دس کے انداز میں موٹر کے گھڑ گھڑانے کی آواز آئی اور موٹر پھاٹک میں داخل ہوئی۔ بڑی بیگم نے اپنے کمرے سے جھانک کر دیکھا، رضیہ اتر رہی تھی۔

سفید ساڑی، سفید بلاؤز۔ گھونگھریالے بالوں کے چھلے اس کی پیشانی کے دونوں طرف جھک آئے تھے۔ اس نے ذرا آگے بڑھ کر کلائی پر بندھی ہوئی نازک سی گھڑی میں ٹائم دیکھا۔ پورچ کی دودھیا روشنی میں رضیہ خطرناک حد تک حسین اور معصوم نظر آ رہی تھی۔

"ایسی پیاری صورت پر تو کوئی بھی آسانی سے عاشق ہو سکتا ہے۔"

بیگم نے گھبرا کر سوچا اور ان کی نگاہوں کے سامنے ایک ہیولا سا ابھر آیا۔ اونچا قد، بڑے بڑے سنہرے بال، سفید قمیض، سفید پتلون، مسکراتا چہرہ۔

بڑی بیگم اپنے کمرے سے نکل آئیں۔ رضیہ بڑی متوالی چال چلتی اپنے کمرے کو جا رہی تھی۔

"سنو بٹیا۔" انہوں نے ذرا بھاری آواز سے کہا۔

"جی۔" رضیہ ٹھٹھک گئی۔

"تم اب تک کہاں تھیں۔؟"

"بنے کے ساتھ۔" وہ بڑی معصومیت سے بولی۔

"بنے۔؟ بنے کون۔؟" خالہ بی نے حیرت سے پوچھا۔

رضیہ ہنس دی۔" وہ اس دن جو آئے تھے نا۔!" پھر خالہ بی کے حافظہ میں یاد کو ابھارنے کی کوشش کرتے ہوئے بولی۔

"وہ۔ وہی اونچے اونچے سے بال۔ بٹیا نے جنہیں چائے پلائی تھی۔ ارے جو شاعر ہیں۔"

خالہ بی کو یاد آگیا۔ ذرا تلخی سے بولیں۔"کیا کر رہی تھیں اس کے ساتھ۔"

"شام غزل، کے نام سے ایک ادبی پروگرام ہونے والا ہے سارا دن اسی گورکھ دھندے میں ختم ہو گیا۔ اف کس بری طرح تھک گئی ہوں۔" وہ پاؤں جھٹکتے ہوئے بولی۔ مگر اس کے چہرے پر تھکن کے کوئی آثار نہ تھے۔

بڑی بیگم نے اس کی آنکھوں میں جھانکا اور آہستہ سے بولیں۔

"تم خود سمجھدار ہو بیٹی۔"

اشرف میاں کو بیٹی سے اتنا ہی سروکار تھا۔ کہ اس کے کھانے پینے، پہننے اوڑھنے کا۔ ہر ہر بات کا خیال رکھیں۔ یہ نہ سوچیں کہ جوان لڑکی اکیلی کدھر آتی جاتی ہے۔ نہ یہ دیکھیں کہ بن بہار کے یہ گالوں پہ گلاب کیوں کھل رہے ہیں۔ جہاں کسی چیز کی ضرورت پڑی یہ باپ کی پیٹھ سے جا کھڑی ہوئیں اور باپ نے جھٹ چیک کاٹ دیا۔ پھر یہ نہ پوچھیں کہ "بٹیا یہ ضرورت کیوں پڑتی ہے۔؟" بس بٹیا کا دل نہ ٹوٹ جائے۔

"بیٹے تو خود ہی پڑھ لکھ کر کمائی کرتے ہیں، انہیں کیا روپے پیسے کی ضرورت۔؟ ہاں بیٹیوں کا دل نہ توڑنا چاہیئے۔"

کبھی تو منہ اٹھا کر نہ پوچھا کہ "بٹیا تم کن گلیوں کے چکر کاٹتی ہو۔؟"

رضیہ بی کے واحد غم خوار اور راز دار چنو میاں تھے۔ کالج سے لوٹ کر گھر پر جو ٹائم گزرتا، انہی کی صحبت میں۔ بڑی بیگم ایک دن باہر تخت پہ بیٹھی آلو چھیل رہی تھیں، اندر رضیہ اور چنو میں باتیں ہو رہی تھیں۔

"اچھا بتایئے جی چنو راجہ آپ نے اب تک اسکول میں کیا کیا پڑھا ہے۔؟"

"اب آپ کو سارے کا سارا کیسے بتائیں۔ آپ کچھ پوچھیئے تو جواب دیں۔!"

"اچھا کیوپڈ کے بارے میں کچھ پڑھا ہے۔؟"

"کیوپڈ۔؟" چنو کی حیرت بھری آواز خالہ بی کے کانوں سے ٹکرائی۔

"ہاں ہاں کیوپڈ۔ جو اندھا ہوتا ہے اور بس بیٹھے پر ترکش دھرے تیر پہ تیر چلاتا پھرتا ہے۔"

"جانے کیا بک رہی ہیں آپ۔" وہ جھنجلا کر بولا۔ "تو وہ بن بات تیر کیوں چلاتا رہتا ہے۔؟"

"بس یونہی۔" رضیہ ہنسنے لگی۔

"کچھ بتاتی تو ہیں نہیں، بس ہنسے جا رہی ہیں۔ میں کیا سمجھوں۔؟" بہت دیر تک رضیہ کی کھنکھناتی آواز آتی رہی۔ پھر بڑی ہی شگفتگی سے بولی۔

"سن چینو، لوگ کہتے ہیں وہ بہت ... ہوتا ہے نا! تو بس کسی کے دل پر کبھی تیر چلا دیتا ہے۔ چاہے بوڑھا ہو، جوان ہو۔ لڑکا ہو کہ لڑکی۔" بڑی بیگم نے بڑی ناگواری سے ان ... کے کمرے کی طرف دیکھا۔ چینو بڑی معصومیت سے پوچھ رہا تھا۔

"کہیں آپ کے دل پر تو تیر نہیں لگ گیا۔" اس کی آواز میں ہلکا سا خوف چھایا ہوا تھا۔

رضیہ سنجیدہ ہو گئی۔ "وہی میں بھی سوچ رہی ہوں چینو۔ جانے سردی کا اثر ہے یا کیا ہے، ان دنوں سینے میں درد ہوتا رہتا ہے۔"

"وکس لاؤں۔؟" چینو باہر دوڑنے لگا۔

رضیہ 'ارے رے' کرتی رہ گئی۔ مگر چینو باہر دوڑ گیا۔ بڑی بیگم کچھ سمجھیں، کچھ نہ سمجھیں۔ مگر دوسرے دن بڑی بیگم ناشتہ کی میز پر بولیں۔

"ہاں بٹیا تم ڈاکٹر کے ہاں کیوں نہیں چلی جاتیں۔؟"

"کس لئے۔!" رضیہ حیرت سے بولی۔

"تمہارے سینے میں تکلیف جو ہے۔ رات تم چینو سے ذکر بھی تو کر رہی

تھیں نا۔؟"

رضیہ کو ہنسی آ گئی۔ "نہیں نہیں، ایسی کوئی بات نہیں۔" وہ اٹکتے اٹکتے بولی۔

اشرف میاں نے اپنے چشمے کے اوپر سے جھانکتے ہوئے کہا۔ "نہیں بیٹیا اگر کوئی تکلیف ہے تو جلدی سے دوا منگوا لو۔ بیماری میں ڈھیل دینی ٹھیک نہیں۔"

بڑی بیگم کی عجیب مصیبت تھی۔ رضیہ بی کے رنگ بتاتے تھے کہ وہ کچھ کر گزریں گی، اور باپ تھے کہ ہر طرف سے بے فکر۔ اگر کچھ منہ ہلاتی ہیں تو رضیہ بی منہ پھلا لیں گی۔ "بھئی یہ کون ہوتی ہیں مجھے ٹوکنے والی۔" بات ٹھیک بھی تھی۔ سگے باپ نے جب ڈھیل دے رکھی تھی۔ تو یہ تیسرے کونے کدھر کہنے سننے کی حق دار تھیں لاکھ خالہ خالہ باجی تھیں۔ مگر تھیں تو پرائی سی۔ باپ جو سر پر موجود تھے! مگر آنکھوں دیکھتے ان سے صبر بھی نہ ہوتا تھا۔

"کچھ نہ کچھ تو ضرور ہو کر رہیگا۔" انہوں نے گھبرا کر سوچا۔ "خدا خیر ہی کرے۔ جوان بیٹی کا معاملہ ہے اور یہ کمبخت گھرانہ ایسا ہے کہ نہ پردے کی قید نہ کہیں جانے آنے پر پابندی۔ ورنہ کہیں یہ بھی کسی نے سنا ہے کہ جوان بیٹیاں خود موٹریں اڑاتی پھر رہی ہوں۔ مشاعروں میں کھلے بندوں شرکت کر رہی ہوں، اور موٹر کے دروازوں میں سر ڈال ڈال کر کہتی ہوں۔ "آپ کی نظم تو واقعی سب پر چھا کر رہ گئی تھی۔" بڑی بیگم کو بس آ جا کے یہی حل سوجھا کہ بی رضو کے ہاتھ پیلے کر دیں۔

انہی دنوں ایک جج صاحب نے اپنے بیٹے کے لئے رضیہ کو سا نگا بھی تھا۔ بڑی بیگم کو دھن لگ گئی کہ جس قدر جلد یہ کار سلجھ جائے بہتر ہے۔ رضیہ کی موجودگی میں ایک دن کھانے کی میز پر قصداً انہوں نے یہ ذکر چھیڑا۔

"جج صاحب کے بیٹے کے بارے میں آپ نے کیا سوچا ہے ؟"

اشرف میاں نے ہاتھ روک کر حیرت سے دیکھا اور بولے۔

"ابھی سے ۔ ؟ بھلا اتنی جلد۔ ؟"

"اے لو - اسے جلدی کہتے ہیں۔ بیس کی ہونے کی تو سوچ رہی ہیں صاحبزادی اور باپ کہتے ہیں ابھی سے۔"

"مگر پھر بھی اسے تعلیم تو پوری کر لینے دو - بی۔ اے کا آخری سال ہے، کم از کم گریجویٹ تو ہو لے۔"

"اونہہ ! تعلیم کا کیا ہے، ؟ شوق ہے تو شادی کے بعد بھی پڑھ ہی لے گی۔"

رضیہ نے بھنا کر بڑی بیگم کو دیکھا۔

"ابھی بچہ ہے۔" باپ بول رہے تھے۔

"بچہ ہے۔ ؟" بڑی بیگم حیرت سے بولیں۔ "ابھی شادی کر دو تو اس بچے کو بچہ ہو جائے۔ ہونہہ۔" انہوں نے تیزی سے چمچہ پٹخا۔

"ہر باپ کو اپنی بیٹی سدا بچہ ہی نظر آتی ہے۔"

رضیہ نے نوالہ ہاتھ میں تھامے تھامے بڑی لاپروائی سے کہا۔

"ابھی تو میں بی۔ اے کر دوں گی۔"

بڑی بیگم کے ہاتھ کا نوالہ بھد سے رکابی میں جا گرا اور سالن

کی سرخ سرخ چھینٹیں ان کے کرتے پر بکھر گئیں۔ "دو دو ٹی بہ کیسی بیٹی ہے کہ اپنے منہ سے شادی کے معاملہ میں دخل دے رہی ہے۔"

اشرف میاں نے اتنی بڑی بات پر سنجیدگی سے غور نہ کیا۔ بڑی متانت سے بولے۔

"ٹھیک ہی تو کہتی ہے۔"

ادھر رضیہ بی کو باپ کی شہ کیا ملی کہ اب کھلے خزانے بی۔ اے کی اسٹڈی ہونے لگی۔ گھر گھر کر کے موٹر رکتی اور ایک دروازے سے بنے میاں اور ایک دروازے سے رضوی بی ڈرائنگ روم میں شعر شاعری پر مباحثے ہوتے، ادبی بحثیں چھڑتیں، نظمیں غزلیں پڑھی جاتیں اور چائے پی جاتی۔ بڑی بیگم نے اپنے منہ میں مونگ بھر لئے۔ کوئی سنتا ہی نہیں تو بولیں بھی کس سے۔

ایک دن رات کے آٹھ بجے جب میز لگ چکی تھی اور سب کھانا کھانے میں مشغول تھے کہ تار والے نے آواز دی۔ بڑی بیگم کا جی اڑنے لگا اور اشرف میاں منہ کھولے تار کے مضمون کا انتظار کرنے لگے۔

"بڑے بھائی صاحب اور بھائی جان پاکستان سے آج سے چوتھے روز یہاں پہنچ رہے ہیں۔" رضیہ نے پڑھ کر سنایا۔

جمال میاں اور حامد میاں کے یوں یکا یک آنے کی غرض و غایت کسی کی سمجھ میں نہ آئی تھی۔ مگر پھر بھی گھر بھر میں خوشی پھیل گئی۔ باپ نے علی گڑھ نا کر دار بار چھوڑے دنوں کے لئے چھوٹے بیٹے بھی آجائیں۔ پھر بھلا پاکستان سے روز روز کون آتا ہے یہاں تو پرمٹ اور ویزا کی جھنجھٹ ہی مہینوں تک ختم ہونے میں نہیں آتی۔

جمال میاں، حامد میاں آئے تو ان کی بیٹیوں بچوں سے گھر میں ہنگامہ مچ گیا۔ بڑی بیگم گھنٹوں دونوں بھائیوں سے سر جوڑے باتیں کرتی رہتیں۔ اب کہیں جاکر ان کا دل ہلکا پڑا۔

یوں تو دونوں بھائی کوئی آٹھ ماہ کا پرمٹ بنوا کر ہندوستان آئے تھے، اور ابھی جانے کو تو دن پڑے تھے، مگر چاہتے یہی تھے کہ جلد سے جلد بہن کی شادی طے ہو جائے۔ پھر کون جانے بعد میں طے ہونے پر شامل ہو سکیں، نہ ہو سکیں۔!

جج صاحب کے بیٹے کے علاوہ اور بھی دو چار پیام نگاہ میں تھے۔ اس لئے غور و خوض ہونے لگا۔ کہ بی رضو کو کس کے ساتھ بیاہا جائے۔ ادھر بی رضو تھیں کہ شاعر میاں کے ساتھ جنم کرم نباہنے کے بارے میں قطعی طور سے طے کر چکی تھیں۔ زبان پر کھیں جاتیں۔ مگر کسی اور کا ہاتھ نہ تھامتیں۔ جمال میاں ان سے بڑے فرد تھے، ... ... ، مگر روشن خیال گھرانوں میں جو بے تکلفی ہوتی ہے وہ یہاں بھی بہن بھائی میں موجود تھی۔ بھائی نے ایک دن بات شروع کی۔

" رضو تم جانتی ہو ابا میاں بوڑھے ہو رہے ہیں۔ پچھلی بار جب میں ہندوستان آیا تھا تب سے اب تک ان کی حالت میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس پر امی جان کی موت نے الگ اثر کیا۔ موت زندگی کا کیا بھروسہ ہے۔ ؟ خالہ بی اپنے گھر کی، ہم رہے پاکستان میں بھئی تم وہاں شادی کر ڈالو۔ ایسے موقعے پر ہم موجود ہیں دراصل ہم اسی لئے آئے ہیں کہ تمہاری شادی کر دیں۔"

" ہوں۔ تو خالہ بی نے بلوایا ہوگا۔" رضیہ نے منہ سے کچھ نہ کہا۔

بس بھائی کو دیکھتی رہی۔

"ایک جج صاحب کے صاحبزادے ہیں۔ ایک وہ پروفیسر تھا۔ اور ایک پھوپھی اماں کے بیٹے۔ تم خود بھی پڑھی لکھی ہو، عقل رکھتی ہو، اپنا برا بھلا سمجھتی ہو۔ تم کس کو اپنے لئے مناسب سمجھتی ہو۔؟"

"اگر مناسب سمجھنے کا سوال ہے تو پھر میں نبے سے شادی کرونگی۔" رضیہ نے معصومیت سے جواب دیا۔

"سبنے سے؟" بھائی صاحب اپنی جگہ سے اچھل پڑے۔ ("خالہ بی نے آگے ہی شاید محبت کان بھر دیئے ہیں!") تیزی سے بولے۔ "نبے سے شادی کرکے کیا لو گی۔؟"

رضیہ بڑی سادگی سے بولی۔ "وہی جو جج صاحب کے بیٹے سے لوں گی۔"

"کمال ہے!" وہ غصے سے بولے۔ "ابا میاں کی پوزیشن کا کچھ تو خیال کرو۔ وہ اتنے بڑے آدمی ہیں، ان کا اتنا بڑا نام اور صاحبزادی شادی کر رہی ہیں ایک شاعر سے کہ جس کے پاس بیوی کو پالنے کے لئے کوئی مستقل آمدنی بھی نہیں۔ اس سے تو شادی کرنے سے بہتر یہ ہے کہ ساری عمر کنواری ہی رہو۔"

"تو کیا میں اس کی آمدنی سے شادی کر رہی ہوں۔؟"

"سر پکڑ کر روؤگی بنو بی۔ جب فاقے پڑیں گے تب پتہ چلے گا۔ ابھی ابا میاں سنیں گے تو گولی داغ دیں گے۔"

بڑے شاعرانہ انداز سے رضیہ بی بولیں۔ "مگر محبت کے سینے پر کون گولی داغ سکتا ہے۔!"

"اچھا۔" جمال میاں غصہ میں بھر کر بولے۔ "تو یوں کہیئے کہ جینا بیگم کو محبت ہو گئی ہے شاعرِ اعظم سے۔!"

رضیہ نے ناگواری سے بھائی کو دیکھا۔ "آپ مجھ پر جبر نہیں کر سکتے بھائی صاحب۔ مجھ میں اتنی ہمت تو یقیناً ہے کہ اپنا گلا آپ گھونٹ سکوں۔"

باپ کے کانوں تک پہنچتے دیر نہ لگی کہ صاحبزادی نے کون سا راستہ اختیار کر رکھا ہے۔ بھائی خون جوش کھا گیا اور کانوں کی لویں سرخ پڑ گئیں۔

"ہم بھی سمجھ لیں گے صاحبزادی کتنے پانی میں ہیں۔"

مگر وہاں تو پتہ ہی نہ چل سکا کہ واقعی کتنے پانی میں ہیں۔ بھائیوں، بھاوجوں، بھتیجوں سے بات نہ چیت۔ گھر سے کالج، اور کالج سے گھر۔ بس منہ لپیٹے پڑی ہیں۔ کہاں تو خالہ بی بجائے ماں کے تھیں یا اب انہی خالہ بی کی صورت زہر ہو گئی تھی۔

ایک دن کالج سے آ کر یونہی پڑی تھیں۔ منہ اترا ہوا، آنکھیں کھنچی ہوئیں۔ چہرے پر محرم برس رہے تھے۔ جب سے بھائی صاحب سے بات چیت ہوئی تھی ادھر نبے میاں کا آنا جانا بالکل بند ہو گیا تھا۔ مگر اس دن شام کو نبے میاں وارد ہو گئے۔ مرد لوگ تو کسی کے ملنے گئے ہوئے تھے، بس گھر میں عورتیں ہی عورتیں تھیں۔ رضیہ بی کی عید ہو گئی۔

دوڑتی ہوئی پھاٹک تک گئی۔ ڈرائینگ روم میں لا کر بٹھایا اور کریمن سے چائے کا کہہ دیا۔ چائے بن کر آئی تو انہوں نے خود اپنے

ہاتھوں چائے پیالیوں میں انڈیلی کرنے میاں کے ہاتھ میں تھمائی۔
"کیا بات ہے۔؟ چہرہ اتنا اداس اور رویا رویا سا کیوں ہے تمہارا۔؟" وہ غور سے ان کے چہرے کو پڑھتے ہوئے بولے۔
رضیہ بی معصومیت سے بولیں۔ "دیکھو نا۔! یہ سب لوگ کہتے ہیں کہ میری شادی جج صاحب کے بیٹے سے کر دیں گے۔ بھلا میں کیا کروں گی ان کے ساتھ شادی کرکے؟ صبح سے شام تک اس کنجوس بنئے کی طرح بس اشرفیاں گنتی رہوں گی کیا۔؟"
یہ میاں ہنس پڑے۔ لوٹا لینے کو چھیڑا۔ "تو ہوا کیا؟ اچھے ابھی گھر بیٹھ رہی ہو، کر تو بیا۔؟"
رضیہ نے لمبی آنکھیں اٹھا کر دیکھا۔ مسے کچھ نہ کہا سنے میاں اپنے آپ بیٹھے رہے۔
خالہ بی کسی کام سے ادھر سے کچھ دیر بعد گزریں تو کمرے سے دھیمی دھیمی باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ سننا چاہا، مگر کان تو بوٹ تھے اتنی دور کی بات بھلا کیا سمجھ آتی۔
دوسرے دن صبح انہوں نے، جب اشرف میاں اخبار لئے بیٹھے تھے۔ رات کی بات کہہ سنائی۔
"بنے میاں کل پھر آئے تھے۔!"
اشرف میاں کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔
جان چھڑکنے والے باپ کیا سے کیا ہو گئے کہ اب صورت تک دیکھنے کے روادار نہ تھے۔ یا تو ہر دن باہر جاتے ہوئے پوچھ جاتے تھے۔
"بٹیا کو کوئی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔؟"

"ہاں بھئی - بٹیا کے لئے کیا لاؤں - ؟"
پھر شام کو واپسی پہ ساتھ میں کبھی تو کپڑوں کا بنڈل لپٹا ہوتا کبھی کتابوں کا پارسل، کبھی سیا کلبٹ تو کبھی سینڈل - اب کہاں کے پھل اور کدھر کی مٹھائی - ؟ بڑی بیگم اور جمال میاں سے دو چار بار کہلوایا بھی، مگر وہ تو یونہی بنڈ نہیں رہیں -
" شادی تو لیس دینے سے ہی کروں گی -"
" میٹی ذات کو اتنی چھوٹ دینا مناسب نہیں، مگر ہم کہیں بھی تو سنے کون - ؟ رات بے رات، دیر سویر گھر کو لوٹنا، چائے پارٹیوں میں شریک ہونا - ؟ مشاعروں میں شرکت کرنا - ؟ غیر مردوں کے ساتھ گھومنا یہ کوئی شریف بیبیوں کے رنگ ڈھنگ ہیں - ؟ میں کہوں ایسی بھی کیا آزادی - اب بیٹھے ہیں ناہاتھ پہ ہاتھ دھر کے -"
بڑی بیگم دونوں بہوؤں کے سامنے دل کے پھپھولے پھوڑتیں - گھر میں جب ادھر جانتے ادھر بھی بھنبھنا ہٹ - تنگ تنگ ہو کے اشرف میاں نے اعلان کر دیا -
" میں نے جج صاحب کے ہاں حامی بھر دی ہے، شادی کی تیاری شروع کر دو -"
گھر میں ادھر جھم جھم لپے گوٹے جھپکنے لگے اور ادھر چھم چھم آنسو بی رضیہ کی آنکھوں سے گرنے لگے - اس دن پہلی بار اس کی آنکھ سے آنسو ٹپکا - اور یوں رو دھو کر انہوں نے ہار مان لی -
اس دن کالج کو چھٹی تھی - رضیہ بی دن بھر سے اپنے کمرے میں ہی تھیں - شام کو کوئی ساڑھے چار بجے اپنے کمرے سے باہر نکلیں -

سفید ساڑھی، سفید بلاؤز۔ چال میں ہم آہنگی چہرے پر بھرپور اطمینان، یوں جیسے حالات سے سمجھوتہ کر لیا ہو۔ اتنے دنوں سے آنے جانے پر پابندی تھی اور یوں بڑی بیگم سے بول چال بھی چھوٹ چکی تھی۔ مگر اس دن قریب جاکر بولیں۔

"خالہ بی میں ذرا اپنی سہیلی کے ہاں جا رہی ہوں۔"

"کیوں۔؟" انہوں نے ساڑھی پر لپا ٹانکتے ٹانکتے ہی پوچھا۔

"اس کا رسم ہو رہا ہے آج منگنی کا۔"

"وہ بی تو کوئی ایسے خوشی کے موقعوں پر سفید ساڑھی پہن کر جاتا ہے۔؟ کوئی رنگین جوڑا پہن لو۔"

"نہیں، مجھے سفید ہی کپڑے اچھے لگتے ہیں۔" وہ لاپروائی سے بولی۔ "شام تک لوٹ آؤں گی۔ شاید ابا میاں کو کہیں جانا ہو اس لئے گاڑی نہیں لے جا رہی ہوں۔"

شام کے سات آٹھ بجے کے اندازمیں ایک لڑکا ایک چٹھی لیکر آیا۔ رضیہ کی تحریر تھی، اپنے باپ کے نام۔

ابا میاں! آج شام پانچ بجے میں نے اپنی پسند سے بنے سے شادی کر لی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو اس خبر سے بہت دکھ پہنچے گا۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی یقین ہے کہ آپ میری اس خطا کو معاف کر دینگے۔ آخر میں آپ کی اکلوتی بچی ہوں اور بچپن سے آپ میری خطائیں معاف کرتے آئے ہیں۔

آپ کی دعاؤں کی طالب
رضیہ

آٹھ دن سے رضیہ گھر سے باہر تھی، اور اشرف میاں کا یہ عالم تھا کہ مارے غصے کے انگاروں کی طرح چھنکتے جا رہے تھے۔ گھر کی فضا ہی بدل گئی تھی۔ نہ کوئی کسی سے بات کرتا تھا، نہ کسی کے مزاج ملتے تھے۔ بس اپنی اپنی جگہ چلے جا رہے تھے۔ ایک دن بڑی ہمت کر کے بڑی بیگم نے اشرف میاں سے کہا۔

"اب میں کہوں غصہ پتہ کر کے فائدہ بھی کیا ہے؟ جو ہونا تھا سو ہو گیا۔ اب ہمارے غصے سے شادی تو ٹوٹنے سے رہی۔"

"شادی نہیں ٹوٹ سکتی۔ ٹھیک ہے مگر میں اس کمبخت کو بندوق سے پھونک تو سکتا ہوں۔ اس کی اتنی ہمت ہوئی تو کیسے۔؟" مارے غصے کے ان کے منہ سے بات نہ نکل رہی تھی۔

"مار کے بھی فائدہ کیا ملے گا۔؟ اچھا ہی ہوا اپنے گھر کی ہو گئی تنہائی بڑی بری ہوتی ہے۔"

اشرف میاں نے نوں نوں کر کے ان کی طرف دیکھا۔

"کوئی حماقت سی حماقت ہے! خود بھی کہے جا رہی ہیں اچھا ہوا۔ کیا اچھا ہوا۔؟ کاہے کی تنہائی تھی یہاں۔؟"

"مرد کے سہارے کی ضرورت تو ہر عورت کو محسوس ہوتی ہے۔ کیا یہ اچھا نہ ہوا کہ اس نے اپنی پسند اور چاہت سے یہ سہارا ڈھونڈا ہے۔ عورت اگر تنہائی محسوس نہ کرے تو دنیا میں مرد کی ضرورت ہی نہ پڑے؟"

وہ خالی خالی نگاہوں سے اشرف میاں کو دیکھ رہی تھیں۔

اشرف میاں نے ایک لمحے کو ان کی اور دیکھا۔ لمحہ بھر خاموشی رہی اکدم وہ بپھر کر بولے۔ "بال سفید ہو رہے ہیں مگر عقل نام کو نہیں۔"

"اتنے غصے تپے سے بھی کام نہ چلے گا۔ پیٹ کی اولاد ہے آخر، معاف کیوں نہیں کر دیتے۔ ؟"

"معاف کر سکتا ہوں، مگر اس صورت میں کہ وہ پھر کبھی اپنی سسرال نہ جائے۔"

"اے لو۔ کیا بٹیاں اسی لئے سہاگ کی چاہت کرتی ہیں کہ گھر بیٹھ جایا کریں۔ ؟"

"تو پھر میں اس کمبخت کو کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ زندگی بھر اس کی صورت دیکھنا مجھ پر حرام ہے۔"

"ہے ہے ایسی بڑی بڑی قسمیں نہ کھایئے۔ کیسے باپ ہیں، سمجھ میں نہیں آتا۔ قصور تو اولاد سے ہوتا ہی ہے۔ کیا یونہی قسمیں کھا لیا کرتے ہیں۔"

"ایسا قصور تو کوئی بھی نہیں کرتا نا گھر۔" وہ ذرا تڑپ کر بولے۔

"نامراد نے عزت مٹی میں ملا دی ساری۔ ان آٹھ دنوں میں آدھا بھی نہیں رہ گیا میں۔"

"تو بھلا عزت کاہے سے مٹی میں ملا دی۔ کیا کوئی حرام کا پیٹ گرایا ہے یا کوئی ناجائز بچہ جنا ہے۔ بس پسند سے شادی ہی کی ہے نا۔ اس میں کیا گناہ ہو گیا۔ یہ تو زندگی کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔"

اشرف میاں نے غور سے ان کی طرف دیکھا، پھر بولے۔

"مگر میں تو اپنی جگہ اب تک یہی سمجھتا رہا کہ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ہو گئی ہو گی۔ اسی کو چھپانے کے لئے شادی رچا لی۔"

"جانے کس کس کے بہکاووں میں آ جاتے ہیں آپ۔ گھر میں چلتی پھرتی دیکھ کر بھی تو مجھ پہ بھید کھلتا۔ بالکل بے قصور ہے بچاری۔ بس اتنا

بیا تصور کہ اپنی پسند سے برچنا ہے۔ اچھا ہی کیا۔ زندگی تو اسی کو گزارنی تھی۔ اگر ادھر اُدھر پکڑ کر باندھ دیتے تو کیا ہوتا ؟ جیتے جی مر جاتی۔ اب بس کہتی ہوں سیدھی طرح معاف کر دیجیے اور چار لوگوں کے سامنے رخصتی کر دیجیے۔ شادی تو ہو ہی گئی۔"

اشرف میاں پھر بدک گئے۔ "ہاں ہاں رخصتی کر دوں۔ کیوں کر دوں۔ مجھے معلوم ہے اس کمبخت نے میری بچی سے اسی لیے شادی کی ہے کہ جہیز اور زیور اس کے ہاتھ لگے۔ محبت وحبت خاک نہیں۔ آج کل کے لونڈوں کو کسی سے محبت نہیں ہوتی۔ بس۔"

"ہے ہے کیسی ناسمجھی کی باتیں کرتے ہیں آپ! اس لیے چارے کو لالچ ہوتی تو یوں کھڑا کھڑی شادی کاہے کو رچاتا کہ صرف جسم کے جوڑے سے لگی ہی تھی رضو۔ نہ کوئی سہاری جوڑا، نہ جسم پر ماشے کا چھلہ۔ خواہ مخواہ کی بدگمانی بھی ٹھیک نہیں۔" بڑی بیگم کی آنکھوں میں یہ بات کھل رہی تھی۔

اسی دن شام میں رضیہ آئی۔ اشرف میاں الماری سے کتاب نکالتے کھڑے تھے۔ یہ جا کر ان سے لپٹ گئی۔ پیٹھ موڑ کر دیکھا تو رضیہ تھی۔ کہاں تو بند دق سے پھونک دینے کا عزم کیے بیٹھے تھے یا اب گلے سے لپٹا لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رو نے لگے۔ شرماتے جھینپتے نبے میاں بھی آئے۔ چوٹوں کی طرح کھڑے تھے۔ سسر نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"آؤ بیٹھو نا میاں ۔ اب تو تم ہمارے داماد ہوئے۔"

شادی کا اصل ہنگامہ اب نکاح خوانی کے پندرہ بیس دن بعد ٹھہرا۔ اشرف میاں بڑی حیثیت کے مالک تھے اور روپے پیسے کی کمی نہ تھی۔ بیٹی

کا جہیز کچھ تو پہلے ہی سے تیار تھا۔ کچھ اب ہو گیا۔ سب اپنے اپنے کاموں میں لگے ہوئے تھے۔ بڑی بیگم جہیز کے کمرے میں ایک ایک چیز لاکر رکھتی جاتیں۔

"دیکھئے یہ ساڑیاں آپ دلی سے لائے تھے۔"

"یہ پاندان مراد آباد کا ہے۔"

"یہ چوڑیاں آگرے کی ہیں۔"

ان کی سفید ساڑی کا پلو بار بار گرتا اور وہ بار بار سنبھالتیں۔

"ارے — یہ پاندان کیوں رکھ دیا وہاں۔ رضیہ بھلا پان کب کھاتی ہے۔؟"

"اے واہ تو کیا ہوا۔ آخر دولہے کو بنا کر دے گی تو سہی۔" ان کے چہرے پر شعلہ سا جلا اور اسی لمحے بجھ بھی گیا۔ وہ پھر سامان کی اٹھا پٹخ میں جت گئیں۔

ایک زعفرانی ساڑی انہوں نے بستر پر پھیلائی۔ "یہ آپ لکھنؤ سے لائے تھے نا۔ دھیان سے مجھے بتاتے جائیے۔ جانے بے چاری ذکیہ کے ہاتھ کی چیزیں کہاں کہاں رکھی ہیں۔"

"زعفرانی رنگ تو سانولی رنگت پر خوب کھلتا ہے۔ رضیہ تو اچھی خاصی گوری ہے۔ جانے کیوں خرید لی تھی۔"

سامنے کے سنگھار دان میں بڑی بیگم کو اپنی سانولی رنگت تیزی سے سرخی میں بدلتی دکھائی دی۔ وہ جھٹ سامنے سے ہٹ گئیں۔

ڈھم ڈھم ڈھم ڈھول بجے۔ اور رضو بی چار لوگوں کی موجودگی میں بنے میاں کی ہو گئیں۔ رخصتی ہو گئی۔ رضیہ بی اپنی ساس، نندوں

اور دولہا کے ساتھ سسرال چلی گئیں۔ سنسان گھر میں پھولوں کی مہک اور مرجھائی کلیاں باقی رہ گئیں۔ گلی میں اب تک زور زور سے باجے بج رہے تھے۔

اشرف میاں بوجھل قدموں سے گھر میں داخل ہوئے۔ بیٹھی بیٹھی رہے تو دل بوجھل، اٹھ جائے تو چھاتی بوجھل۔

بڑی بیگم بار بار اپنی آنکھیں پونچھتیں اور آنسو پھر اسی تیزی سے بھر آتے۔

"گھر کیا سنسان ہوگیا ہے۔" وہ بھرے گلے سے بولیں۔

"ہاں اب سنسانی ہی سنسانی ہے۔ رضیہ اپنے گھر کی ہوگئی، بیٹے باہر کے۔ تم تھیں سو ایک رضیہ کی وجہ سے۔ بس اب ہم ہی ہم ہیں۔"

بڑی بیگم نے ان کی طرف دیکھا۔ وہ اپنی عمر سے کہیں بوڑھے نظر آ رہے تھے۔

"ہاں رضیہ کی وجہ سے بڑی دلبستگی تھی، مگر بیٹیاں بھلا کب تک ساتھ دیا کرتی ہیں۔؟"

"بیٹیوں کا کیا ہے۔؟ کوئی بھی تو نہیں دیتا۔ چار دن رہ کر سب اپنے اپنے ٹھکانوں پر چلے جاتے ہیں۔" انہوں نے جلدی جلدی پلکیں جھپکا کر بڑی بیگم کو دیکھا اور اکدم کچھ یاد کر کے بولے۔

"ہاں جی تم تو خود رضیہ اور بنے کی شادی کے اتنے خلاف تھیں۔ پھر تمہی نے کیسے ان کا ساتھ دیا۔؟"

"میں نے۔؟" وہ حیرت سے بولی۔

"اور کیا میں نے۔؟ کبھی کہتیں رضیہ کو معاف کر دو۔ کبھی کہتیں

رخصت کرو۔ کبھی پچھتا اٹھاتیں کہ دونوں کو گھر بلا لو۔ کبھی کہتیں بیٹے اچھا خاصا لڑکا ہے اور کبھی۔"

بے تکے انداز میں بڑی بیگم بولیں۔

"میں نے سوچا ہو سکتا ہے تنہائی کا بھوت جس طرح مجھے ڈستا رہتا ہے اسی طرح رضیہ کو بھی ڈسنا ہو۔ پھر یہ مجھے اپنی زیادتی ہی لگی۔"

"زیادتی۔؟" اشرف میاں حیرت سے بولے: "وہ کیسی۔؟"

"رضیہ کو کسی نہ کسی کا سہارا تو ہونا ہی تھا، سو اس نے ڈھونڈھ لیا۔ رضیہ کی کیا بات ہے، کوئی بھی عورت بغیر سہارے کے نہیں رہ سکتی پھر اس میں ناراضگی اور غصے کی کون بات۔؟ اور پھر بے چارہ بیٹے اچھا خاصا سمجھ دار لڑکا ہے۔"

"تم نے اس کے دل میں جھانکا ہے جو یوں کہتی ہو۔؟ کیا پتہ وہ تیز مزاج ہی ہو۔ بھلا رضیہ کو کہاں سہار ہو گی کہ مرد کی گھرکیاں سنے۔"

سوئے سوئے لہجہ میں وہ بولیں۔"ہونہہ۔ سہار کہاں ہو گی۔" مرد کی گھرکیاں کھانے میں کیا برائی ہے بھلا۔؟ اور پھر عورت جس سے پیار کرے اس کی گھرکیاں سننے میں مزہ آتا ہے۔"

وہ آپ ہی آپ چونکیں۔"کیا کہا میں نے۔!"

"تم کہہ یہ رہی تھیں کہ تمہیں مجھ سے پیار ہے اور تمہیں میری گھرکیاں کھانے میں مزہ آتا ہے۔"

وہ گھبرا گئیں۔" واقعی میں نے یہ کہا۔؟"

اشرف میاں نے ان کی طرف غور سے دیکھا۔ بڑھاپا زبان سے کہہ رہا تھا۔"میں آرہا ہوں۔ میں آرہا ہوں۔ میں۔۔۔"

اکرم اشرف میاں زور سے بولے۔
"ارے تم نے وہ زعفرانی ساڑی رفیعہ کے ساتھ کر دی کیا۔؟"
"اور کیا رکھ لیتی۔ ؟ جہیز کی تھی۔ جہیز میں رکھ دی۔" وہ دھیرے سے بولیں۔
"لاحول ولاقوۃ۔" وہ تیز ہو کر بولے، "اب بھلا رفیعہ پر کیا کھلے گی وہ ساڑی۔ اکرم گوری ہے رفیعہ۔ تم پہنتیں تو کس قدر اچھی لگتیں۔"
اکرم بڑی بیگم کی نگاہ میز پر پڑے ہوئے پاندان سے جا ٹکرائی۔
"ارے ہے، پاندان یہیں رہ گیا۔"
"وہ نہیں گیا۔ میں نے رکھ لیا۔"
"کیوں۔؟" بڑی بیگم تعجب سے بولیں۔
"تمہارے لئے۔" وہ ذرا سا مسکرائے۔
"دو بی میں کب پان کھاتی ہوں بھلا۔"
"نہیں کھاتیں تو مجھے تو بنا کر دو گی۔"
بڑی بیگم نے گھبرا کر منہ اوپر اٹھایا۔ اشرف میاں ان کے چہرے پر جھکے چلے آ رہے تھے۔
سارے میں پھولوں اور صندل کی مہک مہکار رہی تھی۔ ڈھم ڈھم ڈھم باجوں کی تیز آواز ان کے کانوں میں گھس کر پردے پھاڑنے لگی۔

گناہوں کی پاداش

"ہائے اس ٹونی نے تو میری جان لے لی۔"
شمیم شیو کرتے کرتے گڑبڑا کر اٹھا اور دروازے پر آکر بولا۔
"ارے کیا کیا ٹونی نے۔؟"
برآمدے میں ثریا جھلائی ہوئی کھڑی تھی۔
"دیکھیئے نا پڑوسی کے بچے کو اتنی زور سے پتھر مارا کہ سارا خون نکل آیا۔"
"تو اس میں تمہاری جان کیسے چلی گئی۔؟" شمیم حیرت سے بولا۔
"ہائے ہائے میری جان کیسے نہ جائے بھلا۔؟ شرمندگی کے بھیکرے تو میرے ہی سر آکے پھوٹتے ہیں نا۔ کل رزاق صاحب کے کتے کو اس زور سے لکڑی ماری کہ وہ لنگڑا ہو گیا۔ رحمت علی کی بلی کو چھت پر سے نیچے پھینک دیا۔ ڈاکٹر صاحب کی بچی کے ہاتھ سے مٹھائی چھین کر کھا گیا۔ اور یہ سب مقدمات آتے ہیں میری عدالت میں — یہ کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔؟"
"قسم خدا کی ثریا، تم بھی بس بات کا بتنگڑ بنا ڈالتی ہو۔ ایسے

بچے شور شرارت کرتے ہی رہتے ہیں۔"

"مگر شرارت بھی شرارت جیسی ہو۔ تین سال کا تو ہو گیا۔ اور۔۔"

شمیم بھنا کر بولا۔ "تم تو یوں کہہ رہی ہو جیسے تین سال کا نہیں تیس سال کا ہو گیا ہو۔ آخر تین سال کے بچے سے اور کیا توقع رکھی جا سکتی ہے۔؟"

"ارے یہ بچہ ہے۔؟ آپ اسے بچہ کہتے ہیں۔؟ اس نے تو بڑے بڑوں کے کان کاٹ دیئے ہیں۔ میں تو اس بچے سے عاجز آ گئی۔"

شمیم نے حیرت سے دیدے پھاڑ کر بیوی کو دیکھا۔

"تم ۔۔ تم اپنے بچے سے عاجز آ گئیں۔؟"

"اور کیا۔؟ جب دیکھو تب شرارت ۔ جب دیکھو تب شرارت۔ آخر دنیا میں اور بھی تو بچے ہوتے ہیں۔"

"پھر تمہارا ارادہ کیا ہے آخر۔؟"

"میں اس کے ہاتھ پاؤں باندھ دوں گی رسی سے۔"

"اچھا۔؟" شمیم ہنس کر بولا۔ "بہت بڑے بڑے ارادے باندھ رہی ہیں حضور۔"

ثریا بھِر گئی۔

"پھر وہی ہنسی۔ آپ کی اس ہنسی نے ہی اسے شیر بنا کر رکھ دیا ہے۔"

"میری ہنسی نے؟ میں بھلا کیا کرتا ہوں۔؟"

ثریا تیزی سے ہاتھ چلا چلا کر بولنے لگی۔ "اس دن ڈاکٹر صاحب کی مونچھوں کو پکڑ کر کھینچ رہا تھا تو آپ ہنس رہے تھے کہ نہیں۔؟ پچھلے دن ابا جان کی داڑھی کو دیکھ کر بولنے لگا۔ نانا میاں آپ کی داڑھی تو

جھاڑو والیسی ہے، تو کون ہنس رہا تھا۔ ؟ ہوں ؟ ؟ اپنی بالوں سے تو اسے شہ ملتی ہے۔"

شمیم کو سچ مچ ہنسی آگئی۔ " تو تمہارا مطلب ہے کہ میں ہنسوں بھی نہیں۔؟"

" ہنسیے نا صاحب، ضرور ہنسیے۔ کون کم بخت منع کرتا ہے۔ ؟ مگر صاحبزادے کے کرتوت بھی دیکھتے جائیے۔ اس دن ابا جان کے سامنے مجھے کیسی شرمندگی ہوئی۔ بھلا کوئی نواسہ نانا کو ایسا کہتا ہے۔ کہ آپ کی داڑھی تو جھاڑو والیسی ہے۔"

" ثریا بی بی تم تو اُلٹی طرح سے سوچنے کی عادی ہو۔ یوں دیکھو تو یہ کتنی ذہانت کی بات ہے کہ......"

" ہاں ہاں کتنی ذہانت کی بات ہے کہ نواسہ نانا کی داڑھی کو جھاڑو بنا ڈالے۔"

" تم نے ابھی لوگوں کے بچے دیکھے ہی نہیں، کیسے بے ہودہ ....."

" اجی بس بس۔ اپنا بچہ دیکھ دیکھ کر ہی حیران ہیں۔ دوسروں کے دیکھنے کی کیا تمنا کریں۔ ؟ میں تو سچ اب اسے نہ باندھ کے رکھوں تو میرا نام پلٹ دینا۔"

اتنے میں باہر کے دروازے سے ٹونی میاں برآمد ہوئے —— بش شرٹ گلے کے پاس سے پھٹا ہوا، گال مٹی میں سنے ہوئے، جوتے ندارد، اور بال یوں جیسے بیے کا گھونسلہ۔

" دیکھا دیکھا۔ " ثریا چلا کر بولی۔ " اس کم بخت کو کل ہی نیا بش شرٹ پہنایا تھا۔"

شمیم پھٹے کالر کو دیکھ کر ہنس دیا۔ " ارے تو کیا ہوا۔ ؟ اس کا

باپ ساڑھے پانچ سو اور کس لئے کماتا ہے۔؟"

ثریا نے حیرت اور غصے سے میاں کو دیکھا۔ "ہائے تو آپ ساڑھے پانچ سو اسی لئے کماتے ہیں۔؟"

"ظاہر ہے ہر باپ اپنی اولاد کے لئے ہی کماتا ہے۔"

"ایسا باپ تو آج تک میری نظروں سے نہ گزرا۔"

"تو جانم یہ تو بتاؤ کہ آج تک تم نے کتنے باپ بمرت ڈالے ہیں۔؟" شمیم شرارت سے بولا۔

"آپ کو تو مذاق ہی سوجھتا ہے۔ قسم خدا کی آپ کے بیٹے کے یہ کارنامے اب مجھ سے برداشت نہ ہوں گے۔"

ٹونی میاں اتنے میں باپ کی گود میں جا سوار ہوئے تھے۔ باپ ان سے ہنس ہنس کر باتیں سجھکا رہے تھے۔ ثریا کی جان جل گئی۔

"دنیا کے سارے شریر بچوں کو بگاڑنے کی ذمہ داری صرف باپوں کے سر جاتی ہے۔"

"ہونہہ۔ اور جیسے مائیں تو بڑی سمجھدار مخلوق ہوتی ہیں نا۔؟"

"دنیا کا نہیں کہتی ہوں، میں تو کم از کم آپ سے لاکھ درجہ اچھی ہوں۔ اگر میں توجہ نہ دوں تو یہ بچہ نہ جانے کیا کر دکھائے۔"

ٹونی میاں شریر نگاہوں سے ماں کی طرف دیکھے جا رہے تھے۔ جانے باپ نے انہیں سکھا دیا یا خود ہی بدمعاشی سوجھی کہ ماں کو زبان چڑھا بیٹھے — ثریا کے ضبط کی ساری طاقت جاتی رہی۔ شمیم کی گود سے ٹونی کو گھسیٹتی ہوئی بولی۔

"یہ ایسے تو مانے گا ہی نہیں۔"

اور اس نے ٹونی کو کھینچتے ہوئے لے جاکر کھمبے سے رسی کے ساتھ باندھ دیا۔
شمیم کو ثریا کی پریشانی دیکھ کر ہنسی آرہی تھی۔ وہ سر جھٹکتا ہوا منہ دھونے چلا گیا۔
شام کو شمیم واپس ہوا تو دیکھا کہ ثریا کا منہ اسی طرح پھولا ہوا ہے۔
"کیوں اب کیا ہو گیا۔؟" وہ ہنس کر بولا۔
"ہونا کیا۔؟ میں نے رسی سے باندھ کر چھوڑ دیا۔ وہ جناب آخر کس باپ کی اولاد ہیں۔؟ جانے کس طرح زور لگا لگا کر رسی کھول ڈالی۔ اور سیدھے گھر سے باہر بھاگ گئے۔ ثریا غصے سے جھاڑ کے نیچے مری ہوئی مرغی کی طرف اشارہ کر کے بولی۔" دیکھئے شکاری باپ کے شکاری صاحبزادے مرغی مار کر لائے ہیں۔ تین روپے ڈنڈ ہو گئے۔ اب کہیے نا بڑا ذہین ہے۔"
"ارے باس ۔۔ تین روپے کے لئے اتنی جھنجھٹ میں کبھی سمجھا شاید تین سو روپے برباد کر ڈالے۔" وہ لبوں کو لمبا کرتے ہوئے بولے۔
باپ کے اس رویئے سے ثریا کے تلووں میں لگی تو سر ہی میں جا کر بجھی۔
"میں تو باپ بیٹے کو دیکھ دیکھ کر دنگ ہوں خداوند۔"
"کیوں ۔؟ بہت غیر معمولی مخلوق ہیں کیا ہم دونوں۔؟" باپ ہنس کر بولے۔
ثریا بڑی سنجیدگی سے بولی۔
"کیوں جی۔ بچپن میں آپ بہت شریر تھے کیا۔؟"

"یہ تو امی جانیں۔ ویسے کوئی خاص تو نہیں۔ بس اپنے ٹوٹی جیسی معمولی شرارتیں یونہی دل بہلانے کو کر لیا کرتے تھے۔"

"ارے خدا ـــ یہ شرارتیں معمولی ہیں۔؟" ثریا سینے پہ دو ہتڑ مار کر بولی۔ "گھبرانے کی بھی ضرورت نہیں۔" شمیم ہنسکر بولا۔ "آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا۔ ماشاءاللہ دوسرے صاحبزادے بھی دنیا میں آنے کیلئے بری طرح ہاتھ پاؤں چلا رہے ہیں۔" وہ اس کے بڑھے سے پیٹ کو دیکھ کر ہنستے ہوئے بولا۔

"میں تو انہی سے بیزار ہوں۔" وہ سچ مچ بیزاری سے بولی۔ شمیم سنجیدہ ہو گیا۔

"یہ تم کہہ رہی ہو ثریا۔ تم۔؟"

"جی ہاں میں۔ میں اپنی ثریا۔"

"یعنی تم ایک ماں ہو کر ایسا کہہ رہی ہو۔"

"جی ہاں، جی ہاں۔" وہ طعن سے بولی۔

"اصل میں خدا نے تمہیں بن مانگے ہی اولاد دے کر اچھا نہیں کیا۔ تمہیں معلوم ہی نہیں لوگ اولاد کے لئے کیسے ترستے ہیں۔ اگر تمہیں بھی اتنی ریاضتوں اور عبادتوں کے بعد ایک بچہ ملتا تو قدر کرتیں۔"

"اولاد کا کیا ہے۔ سبھی کو دیر سویر ہو جاتی ہے۔ خود میرے میکے میں ڈھیر سبھی بچے تھے۔ ایسا کیا دنیا کے سوا مجھی کو بچہ ہوا ہے۔؟"

"ارے تم کیسی ماں ہو۔؟ مائیں تو اولاد کی شرارتوں پر بھی یوں خوش ہوتی ہیں۔ ہر آنے گئے سے تذکرہ کرتی ہیں کہ دیکھو اس نے ایسا کیا، اس نے ویسا کیا۔"

"میری اولاد نے تو بس شرمندہ کروانا ہی سیکھا ہے۔ پرسوں ڈاکٹر صاحب کے ہاں گئے۔ پہلے تو جناب نے چائے کی میز پر وہ اودھم مچایا کہ وہ بھی یہ سمجھے ہوں گے کہ اس کے ماں باپ نے کبھی اس کو چائے پلائی ہی نہ ہوگی۔ وہاں سے اٹھے تو ان کے بچوں میں جاکر گھس گئے اور ایک سرے سے سبھی کی پٹائی کر ڈالی۔ لڑکیوں کے کمرے میں جاکر گڑیاں توڑ ڈالیں۔ کھلونے بکھیر ڈالے۔ رہی سہی کسر باغ میں جاکر پوری کر دی۔ سارے پھول توڑ تاڑ کر پھینک دیے۔ سارے گھر میں رونق ہی رونق بکھرا دی۔ میں نے ڈانٹ بتانی چاہی تو ڈاکٹر صاحب کی بیوی بولیں۔ 'اے ہے بچے ایسا کرتے ہی ہیں۔ مگر وہ بھی جھلائی ہوئی دکھ رہی تھیں۔ یوں کہنے کو تو کہنا پڑتا ہی ہے۔"

"آخر ان سب باتوں سے تمہارا مطلب کیا ہے۔؟" شمیم الجھ کر بولا۔

"مطلب۔؟ ہونہہ، آپ تو یوں ہی دھونس دکھا رہے ہیں۔ جو کہتا ہے وہی جانتا ہے۔ ایسا ہی ہے۔ تو ذرا دن بھر سنبھال کر بتا دیجیے۔ تب کہوں کہ ہاں باپ ہیں۔"

یہ تو شمیم صاحب کی مردانگی کو کھلا چیلنج تھا۔ ڈٹ کر بولے۔

"اب اتنا گیا گزرا بھی نہ سمجھو۔ ایک کے بعد ایک گیارہ بچے جن ڈالو اور سب کو بائیں ہاتھ سے سنبھال کر نہ بتاؤں تو شمیم نہ کہنا۔ مہتر کہنا۔"

"جو گرجتے ہیں وہ کبھی نہیں برستے۔" ثریا تاؤ کھا کر بولی۔ "جیسے میں جھوٹ ہی تو کہتی رہتی ہوں۔ مشین پر ذرا سیون کرلے کو تو بیٹھیے پر

کبھی تلنگے کی گنڈی نکال کر پھینک دے ہے تو کبھی کپڑا ہی کھینچ لے۔ کیا مجال جو ایک کپڑا ایک ہفتے میں کبھی پورا کر لوں۔"

"سینا ہی نہ آتا ہوگا۔ ورنہ کون سگھڑ ایک کپڑا ہفتے بھر تک لئے بیٹھی رہتی ہوگی۔"

ثریا پاؤں پٹخ کر بولی۔ "دیکھئے شمیم صاحب مجھے غصہ نہ دلائیے۔"

"ارے بھئی غصہ کون دلا رہا ہے۔؟ سیدھی سچی بات پہ تم خود ہی غصے ہو جاؤ تو میرا کون قصور۔!"

"آپ کا مطلب ہے مجھے سینا نہیں آتا۔ پھر یہ کرتا جو آپ پہنے ہیں کس نے سیا ہے۔؟ یہ آپ کا لاڈلا جو قمیص پہنے پھر رہا ہے۔ کس جہیز نے سیا ہے۔؟"

بازار سے خرید کر بھی پہنا دو اور یہ کہہ دو کہ میں نے سیا ہے تو میں کیا جانوں۔!"

"ہاں ہاں میں تو ایسی ہی جھوٹی ہوں نا۔ اور یہ حضور جو سویٹر ڈالے پھر رہے ہیں تو کس نے آنکھیں پھوڑ پھوڑ کر بنا ہے۔؟" یک دم ثریا کو کچھ یاد آیا۔ تیزی سے بولی۔ "اور ننھے کے لئے کوئی تین ہفتوں سے موزے بننے شروع کر رکھے ہیں۔ مگر آپ کا یہ جگر گوشہ کچھ تو سوچنے دے کبھی تو بلی کے بلونگڑوں کی طرح گولوں کے پیچھے ایک کرا دن الجھا ڈالے اور کبھی سلائیاں پھینک دے۔"

شمیم ذرا اکتاوٹ سے بولا۔ "یہ ننھے کی فکر کیوں ہو رہی ہے حضور کو۔؟ وہ بھی تو آخر ٹونی کا بھائی ہوگا۔؟"

ثریا کے چہرے پہ ذرا سی شرم آئی، مگر وہ دوسرے ہی لمحے

ڈھٹائی سے بولی۔

"تو بس اب معاملہ ختم ہے۔ اب آگے کون اس جھنجھٹ میں پڑے۔"

"کیوں۔؟ معاملہ ختم کیسے ہے۔؟" شمیم حیرت سے بولا۔

"بس میں کوئی دوا کھالوں گی کہ بچے ہی نہ ہوں۔"

شمیم کو غصہ آگیا۔" دیکھو ثریا بی تم میرے بچوں کو دنیا میں آنے سے منع نہیں کرسکتیں۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔ باپ تو اپنا کام کرکے چلتے بنے اور ستم ٹوٹے ماں کی جان پر۔ بھلا بچے پیدا ہونے میں آپ کا کیا جاتا ہے۔؟"

"اور آپ کا کیا جاتا ہے جناب۔؟"

"پیدا کرنا پڑے تو پتہ چلے۔"

"اور کیا ہم اتنی مشکل سے پیدا نہیں کرتے تو کیا تم کرتی ہو۔؟" شمیم ہنس کر بولا۔

"ہائے اللہ۔!" ثریا آنکھیں پھاڑ کر بولی "آپ بھلا کیا کرتے ہیں۔؟ خواہ مخواہ منہ کو آرہے ہیں۔"

"آتو نہیں رہا ہوں، اگر تم چاہو تو تمہارے منہ تک آسکتا ہوں ضرور۔" شمیم معنی خیز ہنسی ہنس دیا۔

ثریا الجھ کر بولی۔"یہی اثرات تو اولاد میں بھی ہیں۔"

"ارے شکر کرو ڈیئر۔ اگر دنیا کی اور ماؤں کو ایسی اولاد ہو تو وہ شکر کے مارے سجدے سے سر نہ اٹھائیں۔"

"وہ پاگل عورتیں ہوتی ہوں گی۔ ابھی تو جان آدھی ہوگئی۔ میں نے نوٹ کیا ہے کہ سیزن شروع ہونے اسے کانونٹ میں داخل کرادونگی۔"

"ہائیں۔!" شمیم صاحب حیرت سے بولے، "ابھی سے؟ ارے ابھی تو وہ اتنا سا ہے۔ ابھی سے پڑھائی کا بار اس کے سر۔؟"

"ہاں ہاں اتنا سا ہے، مگر شرارتیں تو دیکھئے۔ زمین آسمان ایک کر رکھا ہے۔"

"آخر تم اس سے اتنی بیزار کیوں ہو۔؟"

ثریا نے میاں کو گھورا۔ "جیسے مجھے دیوانے کتے نے کاٹا ہے ناجو جان بوجھ کر خواہ مخواہ اس کے پیچھے پڑ گئی ہوں۔"

"بھئی میری تو سمجھ میں نہیں آتا۔ آخر تو کر کیا کرتا ہے۔؟"

"جی، ہاں ایسا ہی آپ کا لاڈلا نوکر سے سنبھلنے والا تھوڑا۔ اسے تو جوتی کے بدل نہیں گنتا۔ وہ وہ گھونسے اس کے سر اور پیٹھ پر کستے ہیں کہ جان جوان آدمی اور بلبلا ہی جائے۔ ہیں تو آپ کے لاڈلے تین سال کے۔ مگر چھ سال سے کم کے نظر آتے ہیں۔ نہ حرکتیں ہی ایسی ہیں کہ نبھے گنائے جاسکیں۔" بڑی بے بسی سے وہ بولی۔

"جانے کس گناہ کی پاداش میں اللہ نے ایسا بچہ میرے پیٹ میں دے دیا۔"

اب تو شمیم صاحب کے صبر کا پیمانہ چھل چھل چھلک پڑا۔

"اچھا تو یہ لونی آپ کے گناہوں کی پاداش ہے۔"

"بالکل۔"

"تو پھر پھینک کیوں نہیں دیتیں اٹھا کر۔؟"

"وہی تو سارا جھگڑا ہے کہ پیٹ کی اولاد کو کوئی پھینکے تو کیسے۔؟"

"تو کیا تم سچ مچ ہی اس سے بیزار ہو۔؟"

"تو آپ کے خیال میں میں اب تک مذاق فرما رہی تھی۔"

"اچھا یہ بات ہے تو اپنے بچے کو ہم سنبھال لیں گے۔"

"آپ۔!" ثریا ہنس کر بولی۔ "ارے آپ۔؟"

"کیوں اس میں ہنسی کی کیا بات ہے۔؟ کیا باپ بچوں کو سنبھال نہیں سکتے۔؟"

"کیوں نہیں صاحب، کیوں نہیں۔ ضرور سنبھال سکتے ہیں۔ ضرور سنبھال سکتے ہیں۔" ثریا طعنے سے بول رہی تھی اور ہنسی بھی جا رہی تھی۔

"وہ ڈاکٹر صاحب، رات کو بچہ پیشاب کر دیتا ہے تو اٹھ کر پوتڑا بدل دیتے ہیں۔ اور رحمت علی خود میری آنکھوں کے سامنے اپنی بیٹی کو کموڈ پر بٹھا رہے تھے۔ اور رزاق صاحب ایک دن بوتل سے منی کو دودھ پلاتے بیٹھے تھے۔ میں کون ایسا گیا گزرا ہوں۔"

"مگر جناب آپ رہے دن بھر آفس میں، اور آفس والے کیسے یہ کام کر سکتے ہیں۔؟"

"اجی کرنے والے دنیا کے کام کر سکتے ہیں، بس ہمت چاہیئے۔"

"تو آپ ٹونی کو آفس لے جایا کریں گے۔؟" وہ حیرت سے بولی۔

"ظاہر ہے۔"

"اور کام کون کرے گا آپ کا۔؟"

"ہم ہی کریں گے اور ہم سنبھالیں گے۔ آپ نے کیا بالکل ہی بدھو سمجھ رکھا ہے۔"

ثریا خوشی بولی۔ "پھر تو سچ مچ مجھے بڑا سکون مل جائیگا۔

میں دن بھر چین سے کام کیا کروں گی۔ اپنی سہیلیوں کے ہاں جایا کروں گی۔ کپڑے سینا، سوئیٹر بننا، اور بھی کچھ سکون سے کرسکوں گی۔"

شمیم صاحب حیرت سے بولے۔ "اور وہ یاد نہیں آئے گا۔"

"ارے یاد آنے کی کون بات ہے۔ شام کو تو آ ہی جایا کرے گا نا۔"

"اور جو کبھی وہ تمہیں یاد کرے تو ؟" وہ ذرا پریشانی سے بولے۔

"اونہہ، وہ بے ایمان باپ کی اولاد۔ مجھ سے ایسی کون لگی لپٹی رہتی ہے کہ میری کمی محسوس کرے۔؟"

دوسرے دن آفس جانے کا وقت آیا تو شمیم صاحب نے خود اپنے ہاتھوں لوٹی بیٹے کو کپڑے بدلوائے۔ تھرموس میں دن بھر کیلئے دودھ رکھا۔ بسکٹ کا ڈبہ، چاکلیٹ، سارا الم غلم پلاسٹک کے بیگ میں بھر لیا۔ موٹر سائیکل کے پیچھے ایک گدی رکھ لی گئی کہ لوٹی میاں آرام سے بیٹھ سکیں۔

"اچھا چلو بیٹے۔" باپ نے پکارا، "ممی کو ٹاٹا کرلو۔"

"ٹاٹا۔" وہ اپنی باریک اور شریر آواز سے چلائے۔ "بٹیا ممی کو یاد تو نہیں کروگے۔؟" انہوں نے لاڈ سے پوچھا۔

جواباً لوٹی میاں نے سامنے کھڑی ممی کو پوری کی پوری زبان چڑا دی جیسے "اونہہ، ممی میں کیا دھرا ہے کہ انہیں یاد کیا جائے۔"

ثریا کا مزاج جا تا رہا۔ "دیکھا، دیکھا۔ ان گنوں کے صاحبزادے ہیں۔ بھلا اپنی ماں کو کوئی زبان چڑایا کرتا ہے۔؟"

باپ کے کندھوں پر ہاتھ رکھ کر جب وہ جانے لگے تو تیز بھاگتی ہوئی موٹر سائیکل پہ بیٹھے بیٹھے مڑ کر انہوں نے قصداً ماں کو اور ایک

بار زبان چڑا دی۔
"امی۔ امی۔ امی۔" ثریا نے بھی جل کر ساری کی ساری زبان نکال دی۔
شام کو شمیم صاحب واپس آئے تو ٹونی صاحب بجلد کتے ہوئے پہلے کے پہلے ماں کے کمرے میں گھس آئے۔
"پپا نے تو ہمیں مٹھائی بھی دی۔ ہاں ہاں۔" اور وہ مارے اترا ہٹ کے راک اینڈ رول کرنے لگے۔
ثریا نے ذرا جھلا کر میاں کی طرف دیکھا۔ "کیوں جی۔ اس نے وہاں ستایا یا نہیں۔؟"
"ستاتا کاہے کو۔ ہم کو دراصل بچہ پالنا نہیں آتا۔ خواہ مخواہ اس کے پیچھے پڑی رہتی ہو۔ وہ تو اتنی شرافت سے بیٹھا کہ پوچھو نہیں سارے کلرکوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لے لیا۔"
"اسی لئے نا کہ بوس کا بچہ تھا۔ ورنہ کون ایسے شریر بچے کو منہ لگاتا ہے۔؟"
"ارے قسم سے یہ بات بالکل نہیں تھی۔ وہ خود ایسا پیارا ہے۔ حرکتیں اتنی پیاری ہیں کہ سب دل چھوڑ بیٹھے۔ اور ہمارے کاظم صاحب تو بس بار بار یہی حیرت کر رہے تھے کہ باتیں کس قدر کرتا ہے۔ ورنہ تین سال کے بچے تو ایک لفظ بھی نہیں بول سکتے۔"
ماں اکتا کر بیٹے سے مخاطب ہوگئی۔ "کیوں پیارے دن کیسے گزارا۔؟"
ٹونی صاحب لاکھو گئے گزرے تھے، جھوٹ بولنے کی عادت نہ تھی۔

دن بھر کی کارگزاری سنانے پر تل گئے۔

"ممی بھیا نے انکل کی ناک پکڑ کر کھینچی، پھر ایک دوات پھوڑ ڈالی۔ وہ موٹے کا جم صاحب کی کاپی پھاڑ کر ٹوکری میں پھینک دی اور ان کو پتہ بھی نہ چلا۔"

ثریا نے فتحمندی سے میاں کی طرف دیکھا۔ "کیوں جی۔ آپ تو کہتے تھے بہ چپن سے رہا۔"

"ارے بچہ ہے تو کیا اتنی بھی دھم دھوم نہ کرے۔ مگر تم جتنا، پراپیگنڈہ کرتی تھیں اتنا اودھم تو ہرگز نہیں کیا۔" اک دم وہ ہنس کر بولے۔

"یہ بتایئے آپ کا دن کیسے گزرا۔؟"

"میرا۔؟ ارے میرا کیا پوچھتے ہیں آپ۔ سب سے پہلے تو میں نے ننھے کے چار فراک سی ڈالے۔ وہ ادھورے موزے پورے کئے۔ پھر ڈھیر بھر کپڑے دھوئے اور پھر تین دن سے جو جام منگوا رکھے تھے۔ ان کی جیلی تیار کر ڈالی۔"

"تو یوں کہئے خوب اطمینان سے دن گزرا آپ کا۔؟"

"خوب ــــ اتنے دن بعد کنوارپنے کا سا زمانہ آج پھر لوٹ آیا تھا کہ اپنی مرضی سے جو چاہو کرو۔ کوئی ہاتھ ڈالنے والا نہیں)۔"

"اور جو بے چارہ ڈونی ہوتا تو کیا بگاڑ دیتا تمہارا۔؟"

"ارے ظاہر ہے ساری دنیا تہہ و بالا کر ڈالتا۔ سب کاموں کو ڈالئے چولہے میں، جیلی کو ہی لیجئے۔ سارے جام حضرت پار کر ڈالتے کچھ کھاتے، کچھ پھینکتے۔ اور رہے سہے محلے کے بچوں میں میری چوری سے

بانٹ آتے۔ لڑنے کو بھی ایسے ہی چوکس اور دوستی نبھانے کو بھی ایسے ہی تیار۔"

"مگر اب تو تمہیں سکون مل گیا نا۔؟" وہ طعن سے بولے۔

"مجھے تو ظاہر ہے مل گیا۔ اب اپنا بچاؤ کیجیے۔" وہ ہنسکر بولی۔

ڈونی کو گود میں اٹھاکر بڑے لاڈ سے بولے۔ "ہمارا بیٹا ہم پر بھاری نہیں ہے۔ بچہ تو محبت کا بھوکا ہوتا ہے۔ دیکھنا نہیں بھول کے بھی یاد نہیں کریگا۔"

دوسرے دن شمیم آفس سے لوٹا تو ثریا نے ہنس ہنس کر ساری رپورٹ سنا ڈالی۔

"آج میں ڈاکٹر صاحب کے ہاں گئی تھی۔"

"کیا کیا وہاں جا کے۔؟" وہ لاپروائی سے بولے۔

"ایسے ہی باتیں کرتے رہے۔ پھر بچوں کے کچھ کپڑے سیئے۔ کچھ دیر کیرم کھیلا۔"

"ساری واہیات باتیں۔"

"ہونہہ۔ مردوں کو تو عورتوں کی ساری حرکتیں واہیات ہی نظر آتی ہیں۔ بھلا اور کیا کیا کرتے ہیں۔؟"

"اور انھوں نے پوچھا نہیں ڈونی کیوں نہ آیا۔"

"ارے واہ، پوچھتیں کیسے نہ پہلے تو جاتے ہی یہ سوال کیا۔ کہ "ڈونی صاحب کیوں تشریف نہیں لائے۔؟" جب میں نے کہا۔ کہ ان کی دیکھ ریکھ کی ذمہ داری ان کے باپ نے سنبھال لی ہے تو خوب ہی خوش ہوئیں۔ بلکہ وہ تو اب یہ ارادہ کر رہی ہیں کہ بیلو گوڈ سپنسری

بھجوا دیا کریں۔ کیونکہ ان کے بچوں میں سب سے زیادہ نابکار یہ ببلو ہی ہے۔"

"ہاں ہاں۔" وہ جوتے کے بند کھولتے کھولتے لاپروائی سے ہنس کر بولے۔ "اب ساری مائیں یہی طے کرلیں کہ میاؤں کے ساتھ بچوں کو بھی آفس بھیج دیا کریں۔"

تیسرے دن شبیم نے آتے ہی پوچھا۔ "آج آپ کیا کرتی رہیں دن بھر۔؟"

"آج تو کوئی خاص کام تھا ہی نہیں۔ یونہی بے کار سی پڑی تھی۔ تو آپ کے لئے ایک سویٹر کا نیا ڈیزائن شروع کر لیا۔"

"کیوں۔؟" میاں طعن سے بولے۔ "اب اتنی جلد بے کاری کی نوبت بھی آ گئی۔ پہلے تو یہ عالم تھا کہ سر کھجانے تک کی فرصت نہ ملتی تھی۔"

"اب آدھا بار آپ نے سنبھال لیا ہے نا۔ اس لئے۔" وہ ہنس کر بولی۔

"اچھا۔" وہ اسی لہجہ میں بولے۔" اب سویٹر بھی ختم ہو جائیگا۔ تب کیا کرو گی۔؟"

"تب کیا کروں گی۔؟" وہ حیرت سے بولی۔" ارے یہ بھی کوئی پوچھنے جیسی بات ہوئی۔ گھر میں زندگی کے ہزاروں بکھیڑے لگے رہتے ہیں۔ کوئی نہ کوئی کام نکل ہی آتا ہے۔"

بیکاری میں اور تو کوئی کام تھا نہیں، دن دن بھر بننا ہی بننا تھا۔ سویٹر کوئی چار ہی دن میں پورا ہو گیا۔ ساتویں دن میاں آفس

سے لوٹے تو ثریا بولی۔

"ہاں جی ـــ دن بھر میں کوئی چار چھ مرتبہ تو اس کا منہ دھلانا پڑتا تھا۔ اب وہاں کون دھلاتا ہوگا۔؟"

"چپڑاسی ہے نا ـــ اس پر تو بڑے مزے سے ہل گیا ہے۔ بس یہ سمجھو دن بھر اسی کے پاس رہتا ہے۔ مجھ سے تو کوئی سروکار ہی نہیں۔"

"ہائے جی۔ تو آپ اسی کے بھروسے بچہ چھوڑ دیتے ہیں۔؟" شمیم نے حیرت سے ثریا کو دیکھا۔

"تو کیا ہوا۔؟ کھا تو نہ لے گا بچے کو۔ آخر وہ بھی بال بچوں والا آدمی ہے۔"

ثریا کچھ نہ بولی۔ ٹونی آنگن میں کھڑا گیند اچھال رہا تھا۔ گیند اچھلی تو وہ گیند کے پیچھے لپکتا ہوا آیا۔ گیند سیدھا ثریا کے قدموں میں جا رکی۔ بجائے اس کے کہ گیند لینے آتا وہیں سے ماں کو منہ چڑا کر بھاگ گیا۔ باپ فتح مندی سے بولے۔

"دیکھا اب تمہارے پاس تو پھٹکتا تک نہیں۔"

گیارہویں دن شمیم آفس سے لوٹا تو پیچھے گدی پر ٹونی نہ تھا۔ ثریا اس وقت پورچ میں آرام کرسی پر لیٹی بے دلی سے کوئی کتاب دیکھ رہی تھی۔ موٹر سائیکل کی آواز سنکر سر اٹھایا تو دیکھا کہ گدی خالی ہے۔ بے تابی سے بولی۔

"ارے ٹونی کو کہاں چھوڑ آئے۔؟"

سیڑھیاں چڑھتے چڑھتے وہ لاپروائی سے بولے "کاظم عباس کے گھر۔"

"وہ کیوں۔ ؟" وہ تیزی سے بولی۔
"ان کے بڑے بیٹے کی سالگرہ ہے آج۔"
"تو اکیلا ہی چھوڑ دیا۔ ؟"
"آخر ان کے بھی بچے ہیں۔ کیا پھینک دیں گے اٹھا کر ؟"
"تو کم از کم کریم کو ہی بھیج دیجئے۔"
"مگر تمہیں اتنی کلپ کیوں ہو رہی ہے۔ ! اچھا ہے نا وہاں کھیل رہا ہوگا۔ یہاں تو چیخ چیخ کر اودھم مچا دیتا ہے۔ سر درد کرنے لگتا ہے۔ کم بخت۔" اور انہوں نے چور نگاہوں سے بیوی کو دیکھا۔ ثریا خاموش رہ گئی۔

دوسرے دن ٹونی میاں آئے تو انہیں گھر سے گئے تقریباً دو دن پورے ہو چکے تھے۔ میاں روزانہ دو چار جوڑے کپڑوں کے لیے جاتے تھے مگر اس دن ان کے کپڑے بھی ذرا بہتر تھے، کیونکہ کاظم صاحب کے ہاں سے واپسی پر ان کے کپڑے باپ کو لے جانے یاد ہی نہ رہے۔ اچھلتے پھاندتے وہ موٹر سائیکل سے اترے۔ اور سیدھے اپنے کمرے کو دوڑ گئے۔

ثریا کی صورت سے جھلاہٹ ٹپک رہی تھی۔
"کیا بات ہے تم کھوئی کھوئی سی نظر آ رہی ہو۔ ؟"
"بس۔ ؟ میں بھلا کیوں کھونے لگی۔ ؟" وہ جھلا کر بولی۔ "بھلی خاصی ہوں۔"
"کم از کم چہرے سے تو یہی ظاہر ہو رہا ہے۔"
وہ انہیں گھور کر چپ رہ گئی۔

"آج دن بھر کیا کیا کیا۔؟" وہ اسے سنانے کے سے انداز سے بولے۔

"جھک ماری۔!" وہ تیزی سے بولی۔

"بھلا جھک کیسے مارا کرتے ہیں۔؟ میں نے تو آج تک نہیں ماری۔"

تھوڑی دیر خاموش رہ کر بولی۔

"میں آج ڈاکٹر کے ہاں گئی تھی۔"

"پھر اس نے کیا کہا۔؟"

"کہتی کیا۔ یہی کہ اس ماہ کے ختم تک زچگی ہو جائے گی۔"

"مبارک ہو۔" شمیم صاحب ہنس کر بولے۔

"یہ مبارک سلامت کا کیا تک ہے۔؟ کیا پہلا بچہ ہو رہا ہے؟"

وہ جھلا گئی۔

دھیرے سے شمیم صاحب بولے۔

"ڈاکٹرنی سے یہ بھی پوچھ لیا ہوتا کہ میرے مزاج میں یہ تیزی کیوں آتی جا رہی ہے۔"

بالکل توقع کے خلاف وہ بولی۔ "پوچھا تھا۔!"

"ہائیں۔؟ پوچھا تھا۔؟" وہ اچھل کر بولے۔

"ہاں۔!"

"پھر اس نے کیا کہا۔؟"

"کہہ رہی تھی عورت کو حمل کے زمانے میں خوش رہنا چاہیئے۔ مگر لگتا ہے تمہیں کوئی دکھ ہے جس کی وجہ سے تم جلی جلی رہتی ہو۔"

"پھر تم کیا بولیں۔؟"

ثریا پھر الجھ گئی۔

"یوں کیا بولتی۔ ہم یوں نے کہہ دیا ہے مجھے کوئی دکھ نہیں ہے۔ ابی خواہ مخواہ ہی ٹانگ، ، ، محکمے گھونپ کر پیسے وصول کرنا تو ان لوگوں کا کام ہی ٹھیرا۔"

اگلے دن شمیم صاحب نے بیٹے کو نہلا دھلا کر کپڑے بدلوائے اور جوتے کوٹ پہنا کر مزے سے اٹھا چلے۔ باسکٹ میں کپڑے کھلونے اور کھانے کا الم غلم بھرا تھا۔ وہ اٹھا کیا نیچے اترے موٹر۔ سائیکل پر رکھا۔ ٹونی کو بٹھایا۔ پیر مارا اور موٹر سائیکل کھڑکھڑا کر دی چلنے ہی والی تھی کہ پورچ میں سے ثریا لپکتی ہوئی آئی۔ جلدی سے سیڑھیاں پھلانگ کر وہ موٹر سائیکل کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ بڑے سے پیٹ کا وزن سنبھالنے سے وہ ہانپتی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے۔

"کیا ہے۔۔؟" شمیم صاحب حیرت سے بولے۔

وہ بلک اٹھی۔

"ہائے آپ کیسے شوہر ہیں کہ اپنی بیوی کے دل کی بات بھی نہیں جان سکتے۔!"

شمیم صاحب اسی طرح دیکھ رہے تھے۔ کہ وہ پیچھے سے ٹونی کو اٹھا کر اپنی گود میں بھرتی ہوئی بولی۔۔

"کبھی آپ ایک ماں کا دل لے کر تو دیکھئے کہ سونا سونا آنگن کس قدر برا معلوم ہوتا ہے۔!"

میں نے طے کیا ہے فضول شرمانے اور رونے دھونے کی بجائے صاف صاف کہہ دوں گی۔

"نہیں ۔ مجھے یہ شادی پسند نہیں ہے۔"

اس کے بعد جو گڑبڑ ہوگی۔ جو ہنگامے کھڑے ہوں گے اس سے میں بخوبی واقف ہوں۔ مگر میرے دل میں ڈر نہیں ہے۔ ایسی بے حیا لڑکی کو بعد میں کون قبولے گا۔ مجھے اس کا بھی خوف نہیں ہے۔ ہاں میں نے ہر ہر طرح سوچ لیا ہے۔ میں وہی کروں گی۔ جو میرے دل نے مجھے سمجھایا ہے۔

عقد کے لمحے قریب سے قریب تر آرہے ہیں۔ باہر دیگیں کھڑ کھڑا رہی ہیں۔ گوشت اور یخنی کی خوشبو سارے میں اڑ رہی ہے۔

"ابے او ئے سور کے جنے! سب کباب ہی میں مت بھسم کر دے۔ تھوڑے گوشت کی یخنی بھی بنا۔"

داراب خان نے گوشت کے بڑے بڑے پارچے سیخ پر چڑھائے، ان پر نمک چھڑکا اور دہکتے انگاروں میں گھسیڑ دیا۔ نیم کے درخت سے پرے گلاب خان کی چیخ بھری آواز سنائی دی تو اس نے پلٹ کر دیکھا۔

"کیا کچھر بابا۔؟"

"کان پٹ کا ہے سے ہو گئے۔؟"

دارے نے گندے سندے ہاتھوں سے آنکھیں پونچھتے ہوئے

"ابے حرام کا مال کھا کھا کے یوں چربی نہ چڑھا۔ سالے جا جا اتنا بھاری ہو جائے گا کہ چار چھوڑ آٹھ آدمیوں سے بھی نہ اٹھے گا۔"

"میں وصیت کر کے مروں گا کہ میرا جنازہ صرف دارا ہی اٹھائے۔ سالے خاں اتنا کھلایا اور کس دن کام آئے گا۔؟"

"کھلائے کو کیا چاٹوں۔ بگڑے کسان کی تو ٹنڈیا پلا کے تب جاناں۔"

"ابے حرامی اور کتنی لونڈیاں پیئے گا۔؟ ارے تو تیری ہڈیوں میں بھی دم نہیں رہا اور پینے کی ہوس باقی ہے۔"

دارے نے آنکھیں نیچی کر کے مسکراتے ہوئے کہا۔ "ارے [illegible] کہاں تو نے سنا نہیں۔

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالب
کہ لگائے نہ لگے، اور بجھائے نہ بنے

گلاب خان ہا ہا کر کے زور سے ہنس پڑا۔ "سالے تجھے تو دن بھر میں چار چھ مرتبہ "عشق" ہوتا ہے۔ ایک آدھ دن کھوپڑا پلپلی ہو جاتی ہے تب مزہ آئے گا۔"

"یاروں کا ہاتھ کھلا ہے تب تک دارے کو کیا فکر ہے۔ مولا تجھ جیسے سردار کو قائم رکھے۔!"

دارے نے غلط کہا کہ "یاروں کا ہاتھ کھلا ہے۔" اصل میں ہم گاؤں والے غریب لوگ۔ ہم لوگوں کا ہاتھ تنگ ہے۔ اور اس تنگی کا براہ راست تعلق گلاب کے ہاتھ سے ہے۔ ابھی ابھی کی تو بات ہے کہ گلاب خان محلے بھر میں پتنگ اڑاتا، بٹیر جھگڑاتا اور نیموں تلے

کدکڑے لگاتا پھرتا تھا۔ باپ نے مار مار کے بھرکس نکال دیا مگر
اس کی ہڈی سیدھی نہ ہوئی۔ مندر کا بیل بنا پھرتا تھا۔ کام کا نہ دھام کا
ذمہ داری کا احساس انسان میں سمجھداری پیدا کر دیتا ہے۔
گلاب خان کا باپ مرا تو یہ آپ ہی آپ رستوں پر آ گیا۔ سنتے تھے بڈھا تین
چار ہزار روپیہ نقد چھوڑ کر مرا ہے۔ آگے پیچھے کوئی نہ تھا، لے دے کے
گلابے ہی سارے کا مالک بنا۔ ہمیشہ کی طرح ان دنوں بھی گاؤں والوں
پر مفلسی چھائی تھی۔ بالے رام کو پتہ چلا کہ گلابے کے پاس جمع ہے۔ ہاتھ
پاؤں جوڑتا اس کی چوکھٹ پر جا کھڑا ہوا۔ اللہ ہی جانے تو جانے کہ
اس وقت تک گلابے نے اپنی زندگی اور کاروبار کے بارے میں کیا سوچا
ہوگا۔ مگر بالے بھیا اس کی چوکھٹ پر گیا تو اس کے سیاہ چہرے پر مسرت
جھلک موجود تھی۔ خاص بنئے پن سے بولا۔
"منہ اٹھائے چلے آ رہے ہو، ہے کچھ گرہ میں بھی؟" بالے
بھیا حیرت سے بولا۔
"میں تمہارا مطلب نہیں سمجھا چودھری جی"
"مطلب تمہیں کو دیکھا دو چار گھوڑے لگتے ہیں۔۔۔؟ اپنے کوئی
زیور جہیز کا ہوگا تو رکھ جا اور رقم لے جا۔ ورنہ جا زمیندار کے گھر۔"
بالے بھیا آگے ہی زمیندار سے دھتکارا جا چکا تھا۔ اور تو کچھ
تھا نہیں۔ کچھ سوچا بھی کے کانوں کی اتنیاں تھیں، وہی رکھ کر ڈیڑھ
سو روپے لے آیا۔
نکورے کے پاس کچھ تھا نہیں۔ گلابے نے پر بھاری سود سے
دو سو لے آیا۔ اور دنوں ہی دنوں میں گلاب خاں اچھا خاصا ساہوکار

بن گیا۔

اپنے اپنے مقدر کی بات ہے۔ وہی بارہ گھنٹوں کی رات ایک جوگی پر کیسے گزرتی ہے۔ یہ بارہ گھنٹے بارہ راتیں بن کر گزرتے ہیں۔ اور تن بھروں کے یہی بارہ گھنٹے عیش و کوش میں بارہ منٹ بن کر اڑے جاتے ہیں۔

وہی ماہ و سال ہمارے بھی سروں پر تنے ہوئے تھے جو کلا خالہ کے۔ مگر دونوں ہی دنوں میں وہ کیا سے کیا ہو گیا۔ اب تو اس کے سیاہ بالوں کے چمک دار تیلی سے چپڑے پٹے کانوں پر جھک آئے تھے۔ ریشمی خانے دار تہبند۔ پیلی ریشم کا کرتا جس میں سونے کے چار چار بٹن لگے ہوتے۔ ہاتھ میں ریشم کی دستی۔ اونچی ناک کا چمڑھا وال جوتا۔ کانوں میں عطر کے پھوے۔ مونچھیں اتنی بڑی بڑی کہ کانوں کی لوؤں کو چھو لیں۔ ان میں اکڑے اکڑے بل پڑے ہوئے۔ اور سیدھے ہاتھ میں کلے کی انگلی میں، چاندی کی یہ بڑی سی انگوٹھی۔ کہتا تھا " میں نے میرا داتا کے ہاں جاکر ان کے نام یہ چڑھائی تھی۔"

اللہ دیتا ہے تو اس کے خرچ کرنے کے ڈھنگ بھی سمجھا دیتا ہے۔ چوری چھپے نہیں، علی الاعلان چار لوگوں کے سامنے بیٹھ کر جوئے بازی ہوتی۔ ہارے تو کیا، اور جیتے تو کیا۔ ہر حال اپنی ہی چاندی تھی۔ باوا کے پاس ہر رات بیٹھک جمتی اور پورے گاؤں کی خبریں سنائی جاتیں۔ بعض لوگوں کا کہنا تو یہ تھا کہ کچھ پینے پلانے کا دھندا بھی شروع کر رکھا ہے۔ اور راہ چلتی لڑکیوں کو آتے جاتے چھیڑتا رہتا ہے۔ جھوٹے سچے تو اوپر والا ہی جانے۔ مگر اس کی شرارت کے قصے دو چار بار ہم نے سنے تھے۔ باوا جب مجھے اور لوا کو سبق پڑھایا کرتے تھے تو ایک بار انہوں نے

نے ایک شعر سنایا تھا۔ اور اس کا مطلب بتایا تھا۔ اتنے دنوں کی بات ٹھیک سے کچھ یاد نہیں رہی، مگر مطلب کچھ کچھ یوں سا تھا کہ "پیسہ خدا تو نہیں ہے۔ مگر پھر بھی خدا ہے کہ ساری حاجتیں پوری کرتا ہے اور 'عیب' ڈھانکتا ہے۔"

تو میں اکثر سوچتی ہوں کہ کم از کم گلاب خاں کے ساتھ تو یہی کچھ ہوا۔ پیسہ کیا کم بخت کے ہاتھ میں آیا۔ کہ خدا رسول کو۔ دوسرے کی عزت محبت کو۔ سب کو بھول گیا۔ یا دا کہتے۔

"حرامی پلے کے دل میں رحم اور شرافت کا تو نام نہیں۔ شیر کا کلیجہ کھایا ہوگا۔"

مجھے یاد ہے۔ مجھے کیا سبھی کو یاد ہوگا کہ چندو چاچا کے ساتھ اس نے کیا دھاندلی کی۔ بے چاروں کا ایک ہی کھیت تھا۔ جس کو جوتنا اتنا ہی ضروری تھا جتنا کہ انسان کے لئے کھانا ضروری ہے۔

وہ ہوا یوں تھا۔ کہ زمیندار کا قرضہ بہت چڑھ گیا۔ سر سے پاؤں تک لد گئے۔ اس نے اس سال تک کی مہلت دی تھی۔ کہ قرضہ ادا کردیں ورنہ کھیت کے ساتھ ساتھ بیل کی جوڑی، گھر، اور گھر کے برتن باسن، سبھی کچھ اٹھا کر لے جائیگا۔ اور اب کے سے چاچا کو امید تھی کہ فصل خوب پکے گی۔ انہوں نے کسی صورت رو دھو کر، ہاتھ پاؤں جوڑ کر گلاب خاں سے دو سو روپے نکالے۔

ادھر چاچا گھر پہنچے بھی نہ ہوں گے کہ ادھر سے گلاب خاں کے "لگے" دوڑ گئے۔

آپ نیا اور سب ہو دہ دھندہ اس نے یہ شروع کیا تھا کہ لوگ ایک

گھر چوریاں کروا دیتا۔ اس طرح لوگ جھک مار کر پھر سے قرض لینے اسی کے در پر آتے، اور یوں دگنا سود اسے حاصل ہوتا۔ باوا کہتے "مولوی صاحب سچ ہی کہتے ہیں کہ گلاب خاں کے لئے تو اللہ میاں کو خاص طور سے ایک الگ دوزخ بنانی پڑے گی، جس میں وہ اکیلا ہی جلایا جائیگا۔"

مگر چند دیچیا دوبارہ اس کے پاس سے سود پر روپیہ حاصل کرنے کے لئے نہیں آئے۔ وہ راتوں رات جان بحق ہوگئے تھے۔

پیسہ بادشاہ ہے۔ بادشاہ کے سامنے کون منہ کھولتا ہے۔ دلیپ پیٹھ پیچھے لاکھ گالیاں دے لو۔ گاؤں بھر کی لڑکیوں کو اس نے کنوئیں اور کھیتوں پہ جانا چور کر دیا۔ دیکھتے ہی لے ہودے پن سے ٹھمکے گانا شروع کر دیتا۔

"ہم تو وہی کھٹی میٹھی نارنگی کھائیں گے ری جو تو چوری چھپے لئے بھاگ رہی ہے۔"

"وہ شربت کیوں نہیں پلاتی جو دو گلابی قاشوں میں بھرا ہے۔ پیاسے پر رحم کر ری گوری۔"

ادھر مسجد کے سامنے والی پگڈنڈی سے ہو کر گزرنے کو جی کانپنے لگا تھا۔ مگر اس راستہ پر سے تو گزرنا ہی پڑتا تھا، کیونکہ کچی منڈیروں والی سڑک سے جو راستہ کھیتوں تک جاتا تھا اس میں اور اس مسجد والی پگڈنڈی میں برابر آدھوں آدھ کا فرق پڑ جاتا تھا۔ اس دن تو سچ مچ میں مارے غصے کے اس پر چاقو ہی چلا دیتی۔ ہوا یہ کہ میں سر پہ پوٹلی تھامے جلدی جلدی قدم بڑھا رہی تھی کہ نفنگے پن سے ہنس کر بولا۔

"نورے کو مشٹنڈوں کی طرح چوری کھلاتی ہے، کبھی ادھر بھی رحم کرنا، ہم بھی تو آخر مستحق ہی ہیں۔"

میرے جسم کا سارا خون میرے منہ پر آکر جم گیا۔ میں تیزی سے بولی۔

"حرامی پلے تیرے تن دتن کیڑے پڑیں۔ دوسروں کی لڑکیوں کو تاکتا پھرتا ہے۔ آنکھیں نہیں پھوٹ جاتیں تیری۔" ڈھٹائی سے بولا۔

"میں سمجھ رہا تھا باپ نے راتوں کو چراغ جلا جلا کر کچھ میٹھے بول سکھائے ہوں گے۔ توبہ گالیاں ہی سیکھی ہیں۔ یہ ہے سیدزادی کی شان۔"

"باپ کا نام بیچ میں مت لاتا ہے۔" میں چیخ کر بولی۔ "دیدے کھینچ لوں گی گدھوں میں سے۔"

"باپ رے۔" وہ بناوٹی ڈر سے بولا۔ "بہت اونچے اونچے بول رہی ہے۔"

"ہاں ہاں تیرے باپ کا نہیں کھاتی کہ دھیرے دھیرے بولوں لچے لفنگے تجھے تو بس گالیاں ہی دوں۔"

بے حیاؤں کو ہنسنے کے سوا آتا ہی کیا ہے۔ میں دور تک چلی گئی پھر بھی اس کے کفن پھاڑ قہقہے میرے کانوں میں سوراخ کرتے رہے۔

نورے میرا لال لال چہرہ دیکھ کر بولا۔

"کیوں بی بی کیا بات ہے؟"

"نہیں کچھ تو نہیں۔" میں نہیں چاہتی تھی کہ اس منحوس کے ذکر سے اسے بھی رنجیدہ کر دوں۔

"اپنا دالا نہیں سمجھتی نا، اسی لئے بتاتی بھی نہیں۔"

میں نے لگاوٹ سے اس کی اور گھور کر دیکھا۔ "میں نے کبھی کوئی بات
چھپائی۔ وہی حرام زادہ راستے میں کھڑا ہو گیا تھا۔"

"اچھا۔!" نورے نے آستین چڑھانی شروع کر دی۔

"ارے بس بس۔" میں گھبرا کر بولی۔" تو نے کبھی اس کا ڈیل بھی
دیکھا ہے۔ وہ تو اپنے سے تگنے کو ہتھیلی پر بیر بہوٹی کی طرح بٹھائے سارے
میں گھماتا پھرے۔ کہیں اس کے منہ نہ آنا۔"

"میں کون سا کم ہوں۔ اس کا جوڑی دار ہوں۔" نورے نے تن کر کھڑا
ہو گیا۔

"مگر اس ذلیل سے ڈرنا ہی چاہیئے۔"

"اور جو وہ میری ....." نورے ذرا ہنس کر رک گیا۔ "بی بی کو
کچھ کہے بھی تو سن لوں۔!"

"تو کیوں سنے! میں نے اسے وہ کھری کھری سنائی ہیں کہ یاد ہی
کرتا پھرے گا۔ کہ کبھی کسی رئیس زادی سے پالا پڑا تھا۔"

رحمت بوا کے رت جگے سے میں نے مالیدہ اٹھا کر رکھ لیا تھا۔
اب نورے کو کھانا دے کر مجھے کیسی خوشی ہوتی تھی۔ چپکے لگاتا ہوا بولا۔
"گھر والے پوچھیں گے کہاں گئی تھی تو ....."

میں ٹھنک کر بولی۔ "میں ایسی بے اعتباری نہیں ہوں۔ اماں باوا
کو مجھ پر بھروسہ ہے کہ میں ادھر ادھر جھانکنے والی نہیں۔"

نورے میرے قریب سرک آیا۔

"سچ بی بی تو مجھ سے بہت پیار کرتی ہے۔"

میں دور سرک گئی۔

"دیکھ نورے تو جانتا ہے میں تجھے دل و جان سے پیار کرتی ہوں۔ اور یہ بھی جانتی ہوں کہ تو اگر ساری دنیا میں کسی کو چاہتا ہے تو بس مجھے۔ مگر اتنے قریب نہ آ۔ محبت اور چیز ہے۔ اور یہ چھچھورا پن بالکل الگ بات ہے۔"

"کیوں۔ کیا میں پسند نہیں تجھے۔؟"

"ایسی بات نہ کر نورے۔ مجھے یاد ہے۔ تجھے بھی یاد ہوگا کہ سیلی حویلی والوں کی نسبت مجھے آئی تھی۔ تو میں نے کیا طوفان مچا دیا تھا۔ بوا سے کہہ کر نسبت واپس پھیر دی تھی۔ اور حالانکہ وہ لوگ چھ کھیتوں کے مالک ہیں۔ پھر کیا میری عقل چرنے کو گئی تھی۔"

نورے احمق پن سے بولا۔ "تو نے چار جماعتیں پاس کرلی ہیں۔ عربی پڑھتی ہے۔ سارے گاؤں میں بس سید بابا کے گھرانے کو ہی پڑھنا لکھنا آتا ہے۔ تجھے اس بات پر غرور تو نہیں ہونا۔"

"اس میں غرور کی کیا بات ہوئی۔؟ یہ تو میرے لئے خوشی کا سودا ہے کہ تجھے بھی پڑھنا سکھا دونگی۔ اور کیا چار جماعتیں پڑھ لینے سے انسان مغرور ہو جاتا ہے رے۔؟"

وہ نیچے سر جھکا کر ہنسنے لگا تو میں بولی۔

"یوں کر کہ یہ غرور و ادا کا جھگڑا ہی مٹ جائے۔ باوا کے پاس آکر روز سبق لے لیا کر۔ انہوں نے تو اب بہی شروع کیا ہے کہ سب....."

وہ نورے ہنس کر، بات کاٹ کر بولا۔ "ویسے تو اردو پڑھنا لکھنا مجھے بھی آتا ہے۔ قرآن بھی میرا ختم ہوگیا ہے۔ مگر میں نے تیری طرح جماعت میں بیٹھ کر امتحان نہیں دیا۔ بس۔"

"تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔؟ یوں طعنے دینا چھوڑ دے۔

مگر۔ چاہے تو تو بھی امتحان پاس کر لے۔ شہر کے آئے دن تو پھیرے لگاتا ہے۔"

نورے چپ رہ گیا۔ بیر نے دیکھا کہ وہ ذرا آزردہ ہو رہا ہے تو بات چلانے کو بولی۔

"نورے تجھے بس مجھی سے محبت ہے نا۔؟"

وہ ذرا دیر بعد آنکھیں اوپر اٹھا کر بولا۔" ایسی بات پوچھنے کا فائدہ۔؟"

"تو پھر اتنا سمجھ لے کہ محبت کرنے والے کبھی دور نہیں ہوتے۔"

میں جانتی تھی نورے کا دل بے طرح دھڑک پھڑک رہا ہے۔ کیونکہ میں ایک دو دن بعد نہیں، پورے ڈھائی ماہ بعد اس سے ملنے کو آئی تھی۔ ہمارے گاؤں میں زیادہ تر مسلمان گھرانے ہی آباد ہیں۔ سب ایک دوسرے کو رشتوں سے پکارتے ہیں۔ سب میں محبت، میل جول ہے۔ بعضوں میں زمینیات کے متعلق بہت سے جھگڑے بھی اٹھ کھڑے ہوتے ہیں، مگر اس سے دلوں میں میل کہاں آتا ہے۔! پردہ بھی خال خال ہی ہوتا ہے۔ کھیتوں میں، لسبنیوں سے پرے پیپلوں کے پیچھے، آموں کے نیچے، سنتروں کے کنج میں، کہیں نہ کہیں دو سائے کانپتے نظر آ ہی جائیں گے۔ لڑکیاں اپنے منگیتروں سے چھپ چھپ کر ملتی ہیں۔ اور لڑکے بیروں کی ڈالیوں میں چھپ چھپ کر بالیوں کا انتظار دیکھتے ہیں۔

گاؤں میں ایسا تو کبھی نہیں ہوتا کہ کسی کی لگائی ٹوٹ جائے۔ پیار کا یہ بندھن، جو کنوارپنے سے ہی مضبوط ہوتا ہے۔ شادی کے بعد

تو اور مضبوط ہو جاتا ہے۔ یہاں کسی جھگڑے کا ڈر نہیں ہوتا۔ ڈر ہوتا ہے تو بس تھوڑا بہت بزرگوں کی آنکھوں کا، جو لگائی بکی ہو جانے پر پوری طرح چوکس ہو جاتی ہیں۔

"یہ البیلی سر پر پوٹلی دھرے کھیتوں کو جاتے جاتے کہیں رک تو نہیں جاتی۔ ہاں بیچ میں بالم کا کھیت بھی تو پڑتا ہے۔!"

("کیا تم لوگوں کے دل کبھی پیار سے نہیں دھڑکے تھے۔؟)

مجھے یاد آیا رحمت بوا کے رت جگے میں بابان نے میرے کان میں ہنسی ہنسی کہا تھا۔

"کب دلہنیا بن کر پیا کا دل آباد کرے گی۔؟ وہ بے چارہ تو فراق میں جنگلوں کی خاک چھان رہا ہے۔ اپنی جھونپڑی چھوڑ کر راتوں رات جاگتا رہتا ہے سرحد کنارے۔"

نورے کو دیکھ دیکھ کر میرا چلوؤں خون بڑھ جاتا ہے۔ دنیا میں محبت سے بڑھ کر بھی کوئی چیز ہوگی۔؟

اس دن میں لوٹی تو خوشی سے منہ تمتما رہا تھا۔ سانولے گالوں پر لہو نہیں خون جلدی جلدی جھلکیاں مارنے لگتا ہے۔ گلا بے جیسا بے غیرت بھی شاید ہی کوئی رہا ہو۔ منہ موڑ کر ڈھولکا گانے لگا۔

"اس پتھریلی زمین پر تو تیرے نازک تلوے چھلنی ہو جائیں گے۔ تو ان آنکھوں پر قدم کیوں نہیں دھرتی جو میں نے تیری راہ میں بچھا رکھی ہیں۔؟"

"بہت اچھے، بہت اچھے۔" میں طنز سے بولی۔ "آج کچھ زیادہ ہی چڑھا رکھی ہے کیا۔؟"

"جس نے ایسی آنکھوں کی چڑھا رکھی ہو....." ایسے کمینوں کے کون منہ لگے۔ ؟ میں نے کانوں پہ دوپٹہ لپیٹ لیا۔
میں اس کی دوکان کے سامنے سے گزرنے لگی تو بیہودے پن سے اپنی گدی دار چوکی سے اتر آیا اور بیچوں بیچ رک کر بڑی سنجیدگی اور آزردگی سے بولا۔
"بی بی میں سچ مچ تجھ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔"
"شادی؟" کالی مٹی کی مضبوط ہانڈی میرے ہاتھوں میں تھی۔ میں نے پوری طاقت سے اس کے سر پہ دے ماری۔
"کلموہے! میں تو تیرے منہ پر تھوکوں بھی ناں۔"
پاؤں پٹختی، غصے میں سنسناتی میں جلدی جلدی بھاگ کھڑی ہوئی۔
گلابے نے ایک لفظ بھی نہ کہا۔
پھر دن گزر گئے۔
گاؤں میں سائیں سائیں ہوائیں چلنی شروع ہو گئی تھیں۔ نیم کے درختوں سے پیلی پیلی نمکولیاں جھڑتی تھیں جنہیں بچے کڑوے کڑوے منہ بنا کر کھاتے اور ایک دوسرے پر نشانہ باندھ باندھ کر اچھالتے۔ پتے سوکھ سوکھ کر گر رہے تھے۔ (پھر بہار جھومتی ہوئی آئے گی۔) بوڑھوں کے بیٹھنے کے لئے اب کوئی جگہ نہ رہ گئی تھی اس لئے شام ڈھلے کھلے صحنوں میں یا گھروں سے باہر چارپائیاں بچھتیں، تخت لگتے اور باتیں ہوتیں۔ دل والے حقے بھر لاتے، ورنہ یونہی باتوں کا دور چلتا۔
وہیں ایک دن سفید مسجد کے مولوی صاحب دین کی باتیں بتا

رہے تھے۔ انہوں نے ایک واقعہ بتایا کہ ایسے ہی ایک سود خوار تھا جس نے اپنا پیشہ ہی یہ بنا رکھا تھا کہ سود لیتا رہے۔ کہتے ہیں جب وہ مرا تو عجیب حادثہ پیش آیا۔ جب گورکن اس کے لئے قبر کھودنے لگا تو جہاں سے بھی پھاوڑا لگا کر مٹی اکھاڑی جاتی وہاں سے ان گنت بچھو اور سانپ نکلنے لگتے۔ ایسا کوئی چار چھ مرتبہ ہوا۔ لوگ بری طرح گھبرا گئے اور ایک دوسرے سے پوچھنے لگے کہ بھئی یہ کیا ماجرا ہے۔؟ پھر کسی نے بتایا کہ مرحوم سود بہت کھایا کرتے تھے۔ اس کا بدلہ اللہ کے ہاں تو ملے گا ہی ملے گا۔ یہاں دنیا میں بھی مل گیا۔

جانے کیوں اس دن گلابے بھی اس محفل میں آ شریک ہوا تھا۔ سب توسن رہ گئے مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا۔ بیٹھا یونہی بیڑی پر بیڑی سلگاتا رہا اور ساروں پر دھنویں کے بگولے چھوڑتا رہا۔

مگر مولوی صاحب کا یہ کہنا تھا کہ اس واقعے کو سن کر گلابے بھی ذرا ساکت ہو گیا تھا اور یقین ہے۔ کہ وہ اپنی راہ بدل دیگا۔

راہ تو وہ کیا بدلتا اور اوچھی حرکتیں کرنے لگا۔ اور اس دن تو سارا گاؤں اس پر تھو تھو کرنے لگا۔

ہوا کیا۔ رحیم خاں پھوپھا کی بیٹی برکت لوا کی شادی تھی۔ ہمارے گاؤں کا بھی عجیب حال ہے۔ چاہے کھانے کو پیسہ نہ ہو، فاقے ہو رہے ہوں، ننگے جسم سے رہتے ہوں۔ مگر جہاں شادی بیاہ کا مسئلہ آیا اور یہ لوگ بہہ نکلے۔ پھر نہ یہ دیکھیں کہ پیسہ کہاں سے آئے گا۔؟ نہ یہ سوچیں کہ ادائیگی کی کیا صورت نکلے گی۔؟ بس سمدھیانے میں نام اونچا رہے ورنہ برائی کیا منہ پر تھوکیں گے۔

زبین پھوپھی کے پاس نہ تو اتنے زیور ہی تھے کہ گہن رکھ کر پیسہ جمع کرتیں، نہ گھر میں سونے چاندی کے برتنوں کی اونچی ڈھیک ہی تھی۔ کہ توڑ جوڑ کر کے بیچ باچ کر کام چلا لیتیں۔ اور برکت بوا کی شادی تو ہونی ہی تھی۔

رحیم خاں پھوپھا گلا بے کے پاس گئے۔ مگر اب کی سی انہوں نے سود پر نہیں بلکہ بطور قرض حسنہ کچھ روپوں کا مطالبہ کیا۔

پھر اس کے بعد کی کارروائی کسی کو نہیں معلوم۔ ہوا اتنا ہی کہ کچھ ہی روز بعد برکت بوا کی لاش مسجد والے کنوئیں میں تیرتی ملی۔ اور پھر کچھ ہی روز بعد یہ بات بھی پھوٹ گئی کہ گلا بے نے کہا کہ "قرض تو بغیر سود کے میں دیئے دیتا ہوں، مگر ہاں۔ مجھے اپنے دوستوں کا بڑا خیال رہتا ہے۔"

دارا گلا بے کا یار غار تھا۔ اور تیری میری لڑکیوں کو تاکتا پھرتا تھا۔ برکت بوا پر اس کی بہت دنوں سے نگاہ تھی۔

بھلا رحیم خاں پھوپھا کہاں پیسہ ادھار لینے چلے تھے۔ جب وہ ان صورتوں میں بٹنے والا تھا۔ مگر برکت بوا کے کان تو بہرے نہیں تھے۔ چار لوگوں کی زبان پر جب کھلم کھلا ایسی بات پھرے تو کون جی گردے والا زندہ رہنے کے بارے میں سوچ سکتا ہے۔ چلو باپ کو فکروں سے نجات دلا دی۔ اور کہاں تو دلہن بننے میں ہزاروں کا حساب پڑتا تھا کہ اب مٹھی بھر پھولوں میں سہاگ چڑھ گیا۔

گلاب خاں کے مرنے کی ہزاروں لوگ دعائیں مانگتے ہوں گے۔ مگر کسی میں ہمت نہ تھی کہ اسے جا کر ٹھکانے لگا دیتا۔ اس کا اپنا

اتنا لمبا چوڑا حلقہ تھا کہ کسی کو اس کے خلاف چوں کرنے کی بھی ہمت نہ تھی۔

زمینداروں کے بیٹے کے ختنے تھے۔ گاؤں کی تمام لڑکیوں کو زمیندارن نے رت جگے کی دعوت دی تھی۔ اس دن اماں کی طبیعت سنبھلی تو میری جان کو آنے لگیں۔ "جا تو بھی چلی جا۔"

اب لاکھ لاکھ کہتی ہوں کہ "نہ میں نہ جاؤں گی۔ ماں تو گھر میں بیمار پڑی رہے اور بیٹی رت جگے منائے۔ مجھ سے نہ ہوگا ایسا۔ کیا نہ جاؤنگی تو گناہ ہو جائے گا۔؟"

بولیں۔ "نہ بیٹیا بڑے لوگوں سے بگاڑ کرنا اچھا نہ ہوگا۔ وہ ضرور پوچھے گی کہ 'سب تو آئیں، بی بی کیوں نہ آئی۔؟" یقین کون کریگا کہ میرا جی برا تھا۔ جا ابھی ابھی جا۔ ابھی تو چراغ بھی نہیں جلے ہیں۔"

بس اماں کے کہنے پر جی نہ چاہتے ہوئے بھی اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہرے پتوں والا کرتا شلوار پہن، ہری ہی جالی کا دوپٹہ اوڑھا اور کاجل لگا کر دروازے سے باہر آئی۔ نکل آنگن میں موگرے کے پھولوں کے پودے تھے۔ ایک ٹہنی پر ایک ساتھ چار چھ پھولوں کا گچھا مہک رہا تھا۔ اسے توڑ کر کان کے پاس اڑس لیا۔ الماری کے آئینے میں اپنا منہ دیکھا تو لاج سی آ گئی۔ یہ ہرا ہرا جوڑا پہن، جو کسی کی دلہن بن، میں کہاں چلی تھی۔؟ ("کاش ایسے میں نورے تجھے دیکھ لیتا۔" دل نے چپکے سے سرگوشی کی۔)

چلتے چلتے جب میں مسجد کے سامنے پہنچی تو گلابے مونچھوں پر تاؤ دیتا بیٹھا تھا۔ اس دن کے بعد سے گلابے نے کبھی مجھ پر ڈھونکے نہیں لگائے

تھے۔ اور نہ کبھی شرارت ہی کی تھی۔ مگر اس دن جانے کیا بات تھی، اندھیرا دیکھ کر اس کی ہمت بڑھی یا یونہی کمینگی سر پر سوار تھی۔ کہ ہنسنے لگا۔

"اوہو۔ ہو ہو ہو۔ کیا بہار ہے۔"

میں جلدی جلدی چلنے لگی تو ڈھٹائی سے بولا۔

"اس دن تو بڑی تیزی دکھائی۔ آئیٹما۔؟"

عورت کی خاموشی مرد کو بہادر بنا دیتی ہے۔ میں نے خاموش رہنا مناسب نہ سمجھا۔ ایسے سجاؤ میں، جیسے میں اسے کچھ بھی نہیں سمجھتی تیزی سے بولی۔

"آج بھی دکھا سکتی ہوں۔ اپنے آپ کو سمجھتا کیا ہے کمینے۔؟"

"تیرا ہونے والا دولہا۔" اس نے جھٹ سے جواب دیا۔

میں نے پاس پڑی اینٹ اٹھائی اور اس کے سر پر پھینک کر بھاگ کھڑی ہوئی۔

"اچھا اچھا۔ کسی دن اکیلے میں سمجھ لوں گا۔" پیچھے سے گلابے چلا کر بولا۔

یوں بھاگنے کو تو میں بھاگ گئی، مگر میرا دل بری طرح کانپ اٹھا۔ آج تک گلابے نے ایسی کوئی بات نہ کہی تھی۔ یہ تو گاؤں کا معاملہ ہے جہاں سرِ شام ہی آسمان جھونپڑوں پر جھک آتا ہے، تاریکی پھیل جاتی ہے۔ اکیلے دکیلے ہزاروں بار ہزاروں ہی جگہ آنا جانا رہتا ہے۔ اپنے جانے پہچانے راستوں پر بھلا کون ہمیشہ ہی کسی کا ساتھ ڈھونڈتا ہے۔؟ کام پڑا اور چل نکلے۔ اب تو کہیں اکیلے جاتے بھی ڈر لگے گا۔ کس ڈھٹائی سے اس نے کہا تھا۔

"اچھا اچھا — کسی دن اکیلے میں سمجھ لوں گا۔"

میں نے گھر سے باہر نکلنا ہی چھوڑ دیا۔ یا ایسے ہی بہت کام پڑ جاتا تو کسی نہ کسی کا ساتھ ڈھونڈھ لیتی۔ اب تک میں گلابے کی جوتوں اور پتھروں سے مرمت کر تی آئی تھی۔ مگر اس نے ایسا ڈرا دیا تھا کہ میری ساری بہادری رستہ بھول گئی۔ آخر کو لڑکی کی ذات تھی نا۔ اب میں جلد جلد چاہتی تھی کہ میری شادی ہو جائے۔ مرد کا سہارا بڑا مضبوط ہے۔ یوں باپ بھی مرد ہوتا ہے اور شوہر بھی، مگر ان میں بھی بڑا فرق ہے۔ وقت پڑنے پر شوہر آستین چڑھا لیتا ہے چاہے اس میں اس کی جان ہی چلی جائے۔ باپ صرف پگڑی میں منہ ہی چھپا سکتا ہے۔ بیٹی کی بدنامی کا سہن بڑا کٹھن ہے۔

یوں گلابے پکا غنڈہ تھا۔ مگر پھر بھی اس کی ہمت نہ پڑتی کہ کسی کی بیا بتا کو یوں سر راہ چھیڑے۔ مگر شادی میں تو ابھی دن باقی تھے۔ اگر میری شادی ہو جاتی تو اماں کی دیکھ بھال کرنے والا کون رہ جاتا وہ تو ابھی تب ہو رہی تھیں۔ یوں دیکھا جائے تو کون ماں باپ محض اس لئے بیٹیوں کو سنبھال رکھتے ہیں۔ کہ ان سے تیمارداری کروانی پھر یا۔ اصل رکاوٹ تو روپے کی تھی۔ ہم اپنا بھرم قائم رکھنے کو بیماری کا بہانہ عام کر رکھا تھا۔ بابا اس انتظار میں تھے کہ اب کی فصل اٹھے تو میرے پھیرے کھلیں۔ ادھر ادھر سے قرض مل سکتا تھا۔ مگر قرض کے نام پہ بابا لاحول پڑھتے تھے۔

گھر میں پڑے پڑے مجھے بس اتنا ہی کام تھا کہ نورے کے بارے میں سوچتی رہوں۔ اور یوں میں خود ارادہ کر کے تھوڑی ہی سوچتی

کو بیٹھیتی تھی۔ وہ تو خیالات ہی آپ ہی آپ چلے آتے تھے۔ اپنے گھر بار اپنی زندگی، اپنے بچوں کی کسے تمنا اور آرزو نہیں ہوتی۔ ؟ میں بھی ایک عورت ہوں۔ میرے بھی وہی احساسات اور جذبات ہیں جو دنیا کی اور ساری محبت کرنے والی عورتوں کے۔ میں دن رات اسی ادھیڑ بن میں رہتی تھی۔ نورے کو یوں خوش رکھوں گی، بچوں کے یہ نام رکھوں گی۔ میں سوچتی تھی پہلی بار بیٹی ہوئی تو ہاجرہ نام رکھونگی۔ میں سوچتی تھی۔ اور بیٹا ہوا تو۔ ؟ بیٹا ہوا تو یہ حق نورے کو پہنچے گا۔ کہ اپنے بیٹے کا جو نام چاہے رکھے۔ میں کون باپ بیٹوں کے بیچ میں دخل دینے والی۔ ؟ ہاں بیٹیاں میرے ہاتھوں پلیں گی۔ بڑھیں گی۔ ان پر میرا حق ہوگا۔

کئی ہفتے بیت گئے تھے کہ نورے کی صورت دیکھنے کو نہ ملی تھی۔ رہ رہ کے یاد ستاتی تھی، پر وہ رہتا بھی کتنی دور تھا۔ گاؤں کے کونے پر ان لوگوں کی کھیتی باڑی تھی۔ کون جاتا۔ ؟ سکینہ کے ہاتھ سوکھا پھول بھیجنے کی بھی ہمت ہوگئی تھی۔ سوکھے پھول کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ" تیری جدائی میں دیکھ یہ دل یوں کمہلا کر رہ گیا ہے۔" پھر کوئی نہ کوئی جوابی کارروائی عمل میں آہی جاتی۔ مگر نورا خاموش تھا۔ کیا اسے میری یاد نہیں آتی۔ ؟

ایک دن سہ پہر کو میں گیہوں پھٹکتی بیٹھی تھی۔ کہ سکینہ چوری چوری گھر میں آئی۔ پہلے تو اس نے اِدھر اُدھر دیکھا، اور پھر ایک گولی سے میرے آگے پھینک دی۔

پریم تیر ـــ دل دھڑک اٹھا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے وہ گولی

اٹھالی۔

"آج آدھے کا چاند ہے۔ بہت زوردار چاندنی بھی نہ ہوگی۔ ملگجے اجالے میں نمبردار کے پیپل تلے آجانا۔ ہاں عشاء کی اذان کے وقت — نورے۔"

میں نے سکینہ کو سر سے اشارہ کر دیا۔ "ہاں۔" وہ الٹے پیروں بھاگ گئی۔

جب نمازی مسجد میں جمع ہو گئے تو میں پیپل تلے تھی۔ ریشمی تہبند، ریشمی کرتا۔ سر پر تیل چپڑا ہوا۔ بل کھاتی ہوئی مونچھیں۔ جس کا اتنا مضبوط اور تنومند شوہر ہو اسے کاہے کا ڈر۔ ؟ نورے نے شرارت اور بے صبری سے مجھے کھینچنا چاہا۔ مگر میں دور سرک گئی۔ "میں تجھ سے لاکھ بار کہہ چکی ہوں یہ سب دھندا شادی سے پہلے نہیں چلے گا۔"

نورے ہنسنے لگا۔ "دو چار دن میں پرانی کپاس کے گاڑے لے کر شہر جا رہا ہوں۔ پتہ نہیں وہاں سے کب لوٹوں۔" اس کی آواز مدھم پڑ گئی۔

"کل بھی آؤ گے نہیں۔ ؟" میں ذرا آزردہ ہو کر بولی۔

"تو آجانا، میں بھی کوشش کر کے آجاؤں گا۔"

پیپل کے پتوں میں چاند لپ جھپ کر رہا تھا۔ رکی رکی سی ہوا تھی۔ ایک بدلی نے چاند کو ڈھانپ دیا۔ میں نے غم سے بھری آواز میں کہا۔ نورے۔ !"

نورے کچھ نہ بولا۔

چاند پھر چمک رہا تھا۔ تیچے سرسرا رہے تھے۔ جذبات سے بھری

آواز میں نورے بولا ۔

"بی بی ۔!"

بی بی کچھ نہ بولی ۔

(ہم دونوں ایک دوسرے کو کس بری طرح چاہتے ہیں خدایا) میں نے جھک کر نورے کو دیکھا ۔ ذرا زرد نظر آرہا تھا ۔

"تو اس لئے اداس ہو گیا کہ میں نے تجھے پیار کرنے کی اجازت نہیں دی ۔"

وہ کچھ نہ بولا ۔

"میں تیری ہوں نورے، صرف تیری ہوں ۔" میں پاگل بن کر بول رہی تھی ۔ "اور تو بھی میرا ہے، صرف میرا ہے ۔ میں محبت کرنا اور کروانا چاہتی ہوں ۔ اگر میں تجھ سے محبت نہ کروں تو تو مجھے جو چاہے سزا دے لے ۔ اور اگر تو میری طرف سے منہ موڑے تو میں تیرا خون پی جاؤں گی ۔"

نورے نے مجھے دیکھا تو میں ہنس رہی تھی ۔ "ہاں نورے عورت محبت کے معاملے میں بڑی پاگل ہوتی ہے ۔ تو میرا ہی ہے نا ۔ ؟"

"تو میری ہی ہے نا ۔ ؟" بے صبرا میری طرف ہنستے ہوئے لپک رہا تھا، مگر میں بھاگ کھڑی ہوئی ۔

دوسرے دن ۔

بادا گھر سے نماز کو نکلے اور میں پیا ملن کو ۔ جانے کدھر سے گھرے گھرے بادل اُمڈ آئے تھے ۔ کہ چاند چھپ گیا ۔ "چلو یہ بھی اچھا ہی ہوا ۔" میں نے دل ہی میں سوچا ۔ "آج یہ چوڑیاں اتنی زور زور سے کیوں

چھنک رہی ہیں۔؟" میں نے اردگرد دوپٹہ لپیٹ لیا۔ "اف! دو دن بعد نورے چلا جائے گا، مگر محبت کہاں جائے گی۔؟ وہ تو دل ہی میں رہتی ہے۔" مالیدے کی پوٹلی میں نے سینے سے لگالی۔ "نورے کو مالیدہ کتنا پسند ہے۔!" ("اور تو کتنی پسند ہے؟")

میرا دل خوشی سے دھک دھک کرنے لگا۔ نورے وہاں موجود تھا۔ پیچھے سے جا کر میں نے بڑی محبت سے کہا۔

" نورے تیری بی بی آ گئی۔"

شاید کچھ سوچتا بیٹھا تھا کہ پہلے تو چونک گیا۔ پھر ذرا بھاری سی آواز سے بولا۔

" آ گئی بی بی۔!"

"ہاں تجھ سے وعدہ جو تھا۔ مگر تیری آواز بھاری کیوں ہے۔؟ کیا روتا رہا ہے؟ محض اتنی سی بات کے لیے کہ آٹھ چار روز کے لیے باہر جاتا ہے۔؟ رونا مجھے چاہیئے کہ تجھے۔؟ رونا تو عورتوں کو سہاتا ہے" میں تنے سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ وہ دھیمی دھیمی ہنسی ہنستا رہا۔ پھر اجنبی سے لہجہ میں بولا۔

" تجھے میری محبت آتی ہے۔؟"

اب میرے ہنسنے کی باری تھی۔

"سچ بول۔ ہنسکر بات مت ٹال۔"

" روز وہی بات دہراتا ہے۔ لے سن! تیری محبت آتی ہے۔ بہت آتی ہے۔ اتنی کہ تو چاہے تو میں اپنی آنکھیں تک تیرے کہے پہ پھوڑ ڈالوں۔ تو کہے تو اپنا گوشت تک تیرے لئے کاٹ کر پکا دوں۔"

"تیری محبت سانچی ہے۔؟"

"بالکل۔!"

"اور تجھے یقین ہے کہ میں بھی تجھ سے اسی طرح محبت کرتا ہوں۔"

"بھلا یہ بھی کوئی پوچھنے جیسی بات ہوئی۔؟"

"اور اگر میں یہ سناؤں کہ مجھے تجھ سے محبت نہیں، چپ کھیل کھیل رہا ہوں تو۔؟"

"تو میں کہوں گی نورا مذاق کی جون میں ہے۔"

"اور اگر میں یہ کہوں کہ میں ابھی جھما رنڈی کے ہاں سے آرہا ہوں تو۔؟"

بس ایک لمحے کو رکی۔"تو اتنا نیچ نہیں ہو سکتا۔"

"پھر بھی یہ سوچ لے کہ اگر میں نیچ ہی ہوں۔ تو۔؟"

"مگر ایسا نہیں ہو سکتا۔" بس مضبوطی سے بولی۔

"اور جو ہو گیا تو۔؟"

"ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔ جو لوگ سانچی محبت کرتے ہیں وہ، اپنی محبوبہ کے سوا کسی کو دیکھتے بھی نہیں۔ اور تو نے آج تک سوائے اپنی بی بی کے اور کسی کو نہیں چاہا۔"

بس مانتی سے نکل کر آگے بڑھی۔ پنوں میں چاند ہلا اور نورے کی آواز بدل گئی۔

"محبت کے بارے میں تیرا یہی خیال ہے تو یہ سمجھ لے کہ مجھے تجھ سے سانچی محبت ہے۔ کیونکہ میں نے بہت سی لڑکیوں کو چھیڑا ضرور ہے۔ مگر انگلی کسی کو نہیں لگائی۔ میں تو بس تجھی کو چاہتا ہوں۔"

"گلابے۔" سناٹے میں میری آواز دور تک پہنچتی چلی گئی اور مالیڈ بکھر گیا۔

"اچھا اچھا، کسی دن اکیلے میں سمجھ لوں گا۔" ایک ناگ پھن پھن کرتا کہیں سے نکلا اور میرے انگ کو ڈس گیا۔

میری آنکھیں پھیل کر گلابے پر جم گئیں۔

"میں تو یونہی پیپل تلے چلا آیا کرتا تھا۔ آج، یہ مجھے معلوم نہ تھا کہ میاں بی بی بھی مل جائے گی۔" وہ بھاری سی آواز میں ہنسا۔" اور تو جو اتنی محبت والی ہے تو میری آواز کا فرق بھی نہ جان سکی۔ ڈیل ڈول تو خیر ہم دونوں کے ملتے ہی ہیں۔"

میری آنکھیں اسی طرح پھٹی رہیں۔

گلابے آزردہ سی ہنسی ہنس رہا تھا۔ اکدم اس نے لپک کر مجھے دونوں ہاتھوں پر اٹھا لیا اور تیز تیز قدموں سے چلنے لگا۔ بہت دور پر اس نے مجھے دھیرے سے اتار کر کھڑا کر دیا۔ جانو میں پھول تھی۔ کہ ذرا سے دھکے سے پنکھڑی پنکھڑی ہو جاتی۔

"تو نورے سے محبت کرتی ہے نا بی بی۔؟"

میری آنکھیں پلکیں جھپکانا بھول گئی تھیں۔ میں اسی طرح اسے دیکھتی رہی۔ وہ ذرا بھاری اور ڈوبتی آواز سے بولا۔

"تو نورے سے محبت کرتی ہے، اور میں محبت کرنے والوں سے محبت کرتا ہوں۔ تو یہ نہ سمجھ بی بی کہ میں تیرے ہونٹ چوم لونگا۔ یا تیری عزت لوٹ لوں گا۔ میں تو یہ چاہوں گا کہ تجھے تیرا یار مل جائے۔ تجھے بہت سی خوشیاں مل جائیں۔ سارے ہی محبت کرنے والے کہیں

انہوں کا برا چاہا کرتے ہیں بی بی۔ مگر۔ مگر بی بی تیرا دل چاہے تو اس جھونپڑی میں جھانک کر دیکھ لے۔ تو نے ابھی پیپل تلے کہا تھا نا کہ جو لوگ سچی محبت کرتے ہیں وہ اپنی محبوبہ کے سوا کسی کو دیکھتے تک نہیں۔!"

بڑی دیر بعد وہ آنسوؤں میں ڈوبی آواز میں بولا۔" میں نے تو آج تک کبھی خدا کو بھی سجدہ نہیں کیا، مگر دل چاہتا ہے کہ آج تجھے سجدہ کروں بی بی۔ تو اپنی محبت میں کتنی اٹل اور کتنی اونچی ہے۔" اس نے اپنا بھاری بھرکم وجود میرے سامنے جھکا دیا۔

"بول بیٹی تجھے اتنے اتنے مہر کے عوض نور خان پسند ہے۔"
میں نے طے کیا ہے فضول رونے دھونے اور شرمانے کی بجائے صاف کہہ دوں گی۔

"نہیں۔ مجھے یہ شادی پسند نہیں۔"
اس کے بعد جو گڑبڑ ہو گی۔ جو ہنگامے ہوں گے میں ان سے بخوبی واقف ہوں، مگر میرے دل میں ڈر نہیں ہے۔ ایسی بے حیا لڑکی کو بعد میں کون قبول کرے گا۔؟ مجھے اس کا بھی خوف نہیں ہے۔
ہاں میں نے ہر ہر طرح سے سوچ لیا ہے کہ میں وہی کروں گی جو میرے دل نے مجھے سمجھایا ہے۔

میں گلاب سے بیاہ کر رہی ہوں۔

شہر ممنوع

آگ میں پھول

بات صرف اتنی تھی کہ طاہر میاں نے حویلی کے کسی کونے کھدرے میں نہاتے میں شبو کی پیٹھ دیکھ لی تھی اور روایتی شہزادوں کی طرح ایک جھوڑ ہزار جان سے عاشق ہو گئے تھے۔ لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ برقرار تھی کہ طاہر میاں کی تو بچپن ہی سے ٹھیکرے کی منگنی طے پا چکی تھی۔ اب اس کا کیا ذکر کہ طاہر میاں تو ولایت پلٹ ڈاکٹر تھے اور ان کی ہونے والی دلہن بیچاری خیر سے الف سے اللہ اور بے سے بکری تک بھی نہ جانتی تھی۔ اور جانتی بھی کیسے بیچاری۔؟ اس خاندان میں پڑھانے لکھانے کا سودا ابھی کس کے سر میں تھا۔ وہ تو کہو طاہر میاں کی ماں ایسی تھیں جو غیر خاندان سے بیاہ کر لائی گئی تھیں اور کچھ نہ کچھ پڑھنا لکھنا جانتی تھیں۔ ویسے اس خاندان کا دستور تو یہ تھا کہ تھوڑا بہت بیٹوں کو پڑھا دیا جاتا اور آجا کے ساری جہالت ماؤں اور بیٹیوں کے حصے میں رہ جاتی تھی۔ طاہر میاں کی اماں دوسرے کنٹم کی تھیں۔ اگر ہاتھ بھر لمبی کوئی ڈگری ساتھ نہ تھی تو یہ بھی نہ تھا کہ تاگھر والا حویلی پر کھڑا رہے اور وہ انگریزی کے دو جملے تک نہ پڑھ سکیں۔ اور اس دن تو

پوری حویلی میں ان کی دھاک بیٹھ گئی تھی۔ جب گاؤں سے تار آیا۔ اتفاق کی بات ہی سمجھو اسے، پورا مردانہ محرم کے علم دیکھنے گیا ہوا تھا۔ یہ بیچاری درد دل سے بے حال پڑی تھیں۔ تار والے نے آواز دی۔ انہوں نے دستخط کر کے تار لیا اور پڑھا۔
خسر اللہ کو پیارے ہو گئے تھے ان کے۔ دربان کو دوڑایا گیا اور سب یونہی سجا گئے دوڑتے چلے آئے۔ نندوں نے طعنہ دیا۔ ساس نے اپنا ساس پن دکھایا۔
"اے دو بول کیا پڑھنے آ گئے موئے، الٹا سیدھا جو منہ میں آیا بک دیا۔"
بیچاری منہ سے تو کیا بولتیں، ہاں تار پکڑ ماموں میاں کی آنکھوں کے سامنے کر دیا۔
اور پھر طاہر میاں کی اماں کہ خاندان بھر میں رولق دلہن کے نام سے باجتی تھیں۔ تھیں بھی واقعی رولق دلہن ــ خاندان کا نام انہی کی اولاد سے روشن ہوتا تھا، لاکھ سر پٹخا پٹخنے والوں نے، مگر انہوں نے طاہر میاں کو بسم اللہ کہہ کر داخل مکتب کر ہی دیا۔ تعلیم کی خوبو خود بہ ستی۔ بھلا اولاد کو کیسے نہ پڑھاتیں۔ یہ رولق دلہن کی ساس تو ان پر خوب بگڑی تھیں ایک بار لکھنا پڑھنا تو انہیں آتا ہی تھا۔ دنیا زمانے کے اخبار و رسائل بھی نظر سے گزرتے تھے۔ اپنے میکے سے ایک خط۔ بڑا ادبی قسم کا۔ انہوں نے نند نور جہاں بیگم کے نام لکھا۔
" میرے لئے پیغام۔ شرمندگی۔ وہ تمہارا ننھا منا بھتیجا، جاوید میاں، روز مجھ سے فرمائش کرتا تھا جینا ماموں لا دو۔ میں

کر ہوں جبلی کب اس کی خواہش پوری کر سکی ۔ اسے تو مجھے نیچا دکھانا تھا۔ خود ہی چندا ماموں کو پکڑ لے چل دیا۔"

گیارہویں شریف میں اسے چار ماہ اوپر چار سال کا ہونا تھا۔ دادی نے بڑے ارمانوں سے بسم اللہ پڑھانے کا جشن کر رکھا تھا۔ ریشمی جوڑا سلوایا۔ گھوڑے کا پورا گہنا بنوایا اور تمام پوتوں کے ساتھ وہاں پہنچیں تو جادید میاں یہاں دکھتے ہیں نہ وہاں۔

"اے دلہن! دلہنوں کی طرح ماہوں بٹھا دیا کیا تم نے میرے جیدن میاں کو۔" دادی نے لاڈ سے پوچھا۔

آنکھوں میں آنسو بھر کر رولتی دلہن بولیں۔

"اوئی، آپ کو میرا وہ خط نہیں ملا جس میں میں نے اپنے پیارے کی موت کی خبر دی تھی آپ کو۔"

اسی ماں کے خون کا اثر بھلا طاہر میاں میں نہ آتا تو کس میں آتا۔؟

یہ اتنی بڑی ساری حویلی، خاندان بھر کے لوگ اسی میں گھسے پلے پڑتے تھے۔ چھوکرے چھوکریوں کا وہ ہجوم کہ کوئی اجنبی جو آئے تو صاف یہی کہہ دے کہ شادی رچی ہے یا پھر محرم کے علم اٹھنے والے ہیں۔ اور ایسے میں پڑھائی تو کیا خاک وصول ہوتی کہ اس کا دستور بھی نہ تھا، مگر یہ طاہر میاں تھے کہ اپنی ہی اللہ پے جلتے۔ ساتھ سیکڑ چار پہر۔ دوپہر جب دیکھو تب پورا تانڈو بجانے میں جتا لاتا اور آپ چار پلنگ ادھر ادھر کھڑے کر کے ایک کمرہ سا بنا لیتے۔ پھر دادا کے کمرے سے دھجرے دھجرے لا لاکاتے ہوئے ایک کرسی اور نانا میاں کی ہاتھی دانت کے دستے والی چھڑی

اور بیٹی بھی ایسی کہ ناک کا ٹھسکا نہ آنکھ کا پتہ۔ اور پھر ادھر طاہر
میاں جیسے کہ اندھیرے آجائے گھڑ کر وہ گھورا یا جگمگا اٹھے۔ دو
گال گویا دہکتے چاند سورج تھے۔ کیا جوڑ تھا کہ بیٹھے تھے دیکھنے والے
بھی۔ باپ تو پھر بھی دلہن کا کہا مان جاتے۔ مگر ساس سسر نے اپنی
ہی کر کے چھوڑی۔ اب رونق دلہن تھیں یہ صدا قرار کیا جا رہا ہے۔

"اے نند کی بیٹی ماتھو رونق دلہن۔ یہی تو دن ہوتے ہیں کہ
اپنے والوں کو سمیٹا جاتا ہے۔" رونق دلہن نے نند کی بیٹی کی طرف
دیکھا اور پھر طاہر میاں کی طرف۔ بولیں۔

"اماں جان۔! آپ بھی غضب ہی کرتی ہیں بس۔ بھلا یہ بھی
کوئی جوڑ ہوا۔ ؟"

دلہن تو مان بھی جاتیں صورت شکل اللہ کی دی ہوئی ہے،
مگر جانتی تھیں تعلیم کے نام سے کوری ہی رہیگی لڑکی۔ بس زبان ہلانا
غضب ہو گیا۔ اے لو اماں جان نے تو پاس پڑی سلیم شاہی جوتی
اٹھائی اور وہ وہ جوتے مارے ہیں اپنے آپ کو کہ دلہن بیچاری ڈر سے
کانپ گئیں۔ بھلا انہوں نے کاہے کو دیکھے ہوں گے ایسے تماشے! اور
پھر اماں جان نے کوسنوں کی بوچھار کر دی اپنے پیاروں پر۔

"ارے گورا تجھے بھر کا ہوتا تو چلا جاتا۔ مگر تجھے کی کفنی ہی کافی
ہوتی۔ یہ دن کیوں دیکھتی کہ بیٹے ہوتے۔ میرے جیتے جی نات کا
بیل تباہ پھر رہا ہے۔"

اور اللہ گواہ ہے رونق دلہن نے کبھی بھولے سے بھی ذرا بڑھا کر
اپنے میاں سے کوئی بات منوائی ہو۔ وہ تو آپ بھولی ہوئی تھیں، جو

میاں نے کہہ دی وہی سن لی ۔ ہاں ایک برائی لاکھوں کی تھی کہ کتاب پڑھنا آتا تھا ۔ اور قلم چلانا بھی ۔ اور اسی مارے تو پورے خاندان میں تھو تھو تھی کہ " اے زمانہ تو دیکھو کیا آن لگا ہے ۔ وہ حویلی والے جعفر میاں کی بہو کا ڈھنگ دیکھا ۔ ؟ تحریریں بھیجتی ہے اپنے میکے والوں کو ۔ غیر کُنبہ سے بہوئیں لاؤ گے تو یہی کچھ ہوگا ۔ ! "

بہو نے جو یہ آندھی اپنے سر چلتی دیکھی تو گھبرا کے میاں کی طرف دیکھا ۔ " کیوں جی ۔ ! بیٹیا آپ کا ۔ بیٹی آپ کی ۔ مانگ کیوں نہیں لیتے ۔ "

اور میاں نے اس انداز میں کہ جیسے کوئی میت کے سرہانے کھڑے ہو کر انا للہ و انا الیہ راجعون پڑھے ۔۔۔ کہا ۔۔۔ " اماں جان شمسو کی بیٹی میرے طاہر کو دیدیجئے گا ۔ ؟ " اور اماں جان نے جھوٹ موٹ کے آنسو اپنے پلو میں جذب کئے اور وہیں بیٹھے بیٹھے ناریل پھوڑ دیا ۔

اے لو بات پکی بھی ہو گئی ۔ ۔

اب بڑی ہو کر نجم النساء ایسی بری بھی نہ تھی ۔ اور پھر جوانی کا زمانہ تو وہ ہوتا ہے کہ لنگور بھی حور نظر آتے ہیں ۔ اور پھر نجم النساء نے تو خوب ہی ہاتھ پیر نکالے تھے ۔ اب رہی صورت کی بات ، تو وہ اللہ کی دین ہے ۔ کسی کو یوسفِ ثانی بنا دے اور کسی کو ایلے تولے جیسا ۔ ویسے ایمان کی پوچھو تو نجم النساء کا ذرا رنگ ہی سانولا تھا ۔ اور آنکھ ناک نوجوانی میں اپنی اپنی جگہ درست ہی نظر آ رہی تھی ۔ مگر یہ ضرور تھا کہ طاہر میاں کے بازو بیٹھا کر دیکھا جاتا تو اندھا بھی

ٹٹول کر کہہ اٹھتا۔

"جوڑی جوڑ کی نہیں ۔"

کہاں تو طاہر میاں بغداد کے خوب رو شہزادے کی طرح اونچے چوڑے، سجاری بھرکم اور یہ حبشن شہزادی کی کنیز کی طرح بھی سہانی ضرور، مگر پھیکی پھیکی سی۔ بن نمک کی روٹی میں جو مزہ ہوتا ہے وہی نجم النسا رکی صورت سے ظاہر تھا۔ اور پھر لیں تو نہد ریا کو بھی اوڑھنا پہنا دو تو سندر بالکتی ہے، اور یہ تو آدم زاد ہی تھیں۔

سعادت مندی تو ماں کی طرف سے ورثے میں ملی تھی۔ طاہر میاں نے حویلی کی چلمنوں میں سے دو ایک بار یونہی جھپکتے لپکتے میں نجم النسا کو دیکھا بھی، مگر اپنے [illegible] کہ راتوں کی نیند ہی اڑ گئی ہوں اور دن کو خواب نظر آنے لگے ہوں۔ بس دیکھا۔ مگر نہ دیکھنے کے برابر۔ اتنا ضرور جانتے تھے کہ شادی انہی سے ہونی ہے۔ ہاتھ پاؤں چلاتے تو شاید کچھ بات بھی بنتی، مگر اس کی بھی ضرورت انہیں محسوس نہ ہوئی۔

اب تو بس یہ معمول تھا۔ صبح سویرے ہی اٹھے، حویلی کے ساتھ والے باغیچے میں ذرا چہل قدمی کی۔ نہا دھو نا شتہ کیا، چائے پی۔ کوٹ کاندھے پہ ڈالا، اسٹیتھسکوپ گلے میں لٹکایا، کار میں بیٹھے، یہ جا وہ جا۔ اب جاڑے جا رہے تھے۔ گرمیوں کا زمانہ تھا۔ ہلکی ہلکی سردیاں تھیں۔ گرما کی آمد آمد تھی۔ رضائیاں تان تان کر کمروں میں گھس گھس کر سونے والے بھی دالانوں کی طرف کھسکتے آ رہے تھے۔ اور یہی زمانہ اماں جان کی نظروں میں وہ زمانہ ہوتا ہے کہ شادیاں رچائی جائیں بھرے

جاڑوں میں شادیاں رچ ناتو اماں جان کو کیسی دھجا یا۔ کہتیں۔
"ارے دلہنوں پر ذرا تو رنگت نہیں ہوتی۔ سردی کے جاڑوں سے اچھی خاصی صورت ہولی جو تی سوا تدبن جاتی ہے۔"
اور گرمیوں کی شادی انہیں یوں ناپسند تھی کہ مہاوں کے چھوڑ جھکے سے دلہن اپنے پسینے میں آپ نہا جاتی ہے۔ اور مصنے بگڑ جاتی ہے۔ اپنی بڑی بیٹی کی شادی وہ بھولی تو نہ تھیں کہ پیچاری رات بھر میں دو دو تین تین مرتبہ بے ہوش ہو ہو گئی تھیں۔ اماں جان تو گرمی گرمی کا رونا روتی تھیں اور کہنے والیاں منہ میں پلو ٹھونس ٹھونس کر کہتی تھیں کہ گرمی ورمی کچھ نہ تھی، ان کے میاں نجے کہ ان پر ستی ہوتے جاتے تھے اور تو اور ہونٹوں کی مسی تک چوس ڈالی تھی۔
ولایت سے آکر بھی طاہر میاں کا ڈھنگ نہ بدلا تھا۔ وہی تھے، بالکل وہی۔ ورنہ آنے والے ساتھ میں ایک میم تو اٹکا ہی لاتے ہیں اور اوپر سے پورے صاحب بہادر کہ ماں باپ، بھائی بہن سے بھی وہی کٹ پٹ۔ مگر طاہر میاں وہی موم کی ناک تھے اور ماں اور دادی کو یقین تھا کہ عمر ان کے ساتھ سلیم لشم گزر ہی جائے گی حویلی والوں کے متعلق تو پرانی بات تھی کہ خصم جھوڑ کے مگر خصم نہ چھوڑے۔ شادی کی تاریخ مقرر کرنے والوں کا منہ تو کھلا ہوا ہی ہے اور ایسے موقعوں کی انہیں فکر رہتی ہے کہ کوئی کمی نہ ہو اور دو منہ چلائیں۔
لال لال مسند پر ایک طرف حیدر میاں، دوسری طرف طاہر

میاں، بیچ میں رونق دلہن اور پھر دس پانچ سہاگنیں۔ ؟ اور بڑے کرنے پر اماں جان۔ اور حویلی بھر کی لڑکیاں بالیاں تو ہر دم رہتی ہی تھیں کہ موقع ملے اور وہ اپنے دوپٹوں میں منہ چھپا چھپا کو ہنسیں۔ اماں جان گھُڑکیں اور وہ ناز و انداز سے لڑکوں کی طرف دیکھ دیکھ کر لجائیں۔

اب جو تاریخ کی بات اٹھی تو طے ہونے میں ہی نہیں آتی۔ اماں کچھ کہتیں اور بیٹے کچھ کہتے اور بہو سب سے الگ ہی سنائیں۔

"اے یہ تاریخ تو نحس ہے۔ دیکھتے نہیں جو میاں کی دلہن چوتھے مہینے ہی رانڈ ہو گئی۔"

"اوئی دور پار، اللہ نہ کرے کوئی مدار میں سر جوڑی کرے۔"

اماں جان بکنے جھکنے پر اتر آئیں تو طاہر میاں کو ٹھٹھول سوجھی۔

"کیوں دادی اماں! اگر تیرہ تاریخ رکھیں تو۔ ؟"

دادی اماں نے سوکھے مارے ہاتھ سے ان کا منہ بند کر دیا۔

"لڑکے تیری مت ماری گئی ہے۔! اب سے دہرانا تو ذرا۔ کبھی کسی نے منہ سے بھی نکالی ہو گی تین تیرہ، نوباش کی بات ؟ ہاں اب سے جو کہا ہو تو یا تو نہیں یا میں نہیں۔"

"ارے واہ دادی اماں غضب کرتی ہیں آپ بھی۔ بھلا ہو گا کیا۔ ؟ ایک تجربہ ہی سہی۔"

"ارے چل ہٹ۔" اور اماں جان نے کانوں میں انگلیاں دے لیں۔

کہاں تو طاہر میاں مذاق کی جون میں تھے کہ اک دم تیکھے ہو کر

بولے۔

"امی میری سمجھ میں نہیں آتا ہمارے خاندان سے یہ جہالت دور کیوں نہیں ہوتی۔ اب بھلا تیرہ تاریخ اور بیس تاریخ میں کیا رکھا ہے۔؟"

بہو نے ساس کی طرف دیکھا۔ ساس نے بیٹے کی طرف۔ دادی پھر چلائیں۔

"اے رہنے دے تیری تعلیم۔ ہم تو اپنی سی کرینگے۔"

"سب دن خدا کے بنائے ہوئے ہیں، کسی بندے نے تو نہیں بنائے نا۔ اگر میری شادی ہوگی تو جمادی الثانی کی اسی تیرہ تاریخ کو، ورنہ نہیں۔ لات مارتا ہوں ایسی جہالت بھری شادی پر۔"

اور وہ مسند الٹاگئے، جوتا کھٹ کھٹاتے اپنے کمرے کو ہولئے۔

ایک بار طاہر میاں نے انگلینڈ جاتے وقت ضد کی تھی، اور ایسی ضد کی تھی کہ دادی کو ناکوں چنے چبوادیئے تھے۔ بس یہی کہتے تھے جاؤں گا اور ضرور جاؤں گا۔ ایک طرف تو چچا ودں، ماموؤں اور دادی، نانی کی پلٹن تھی۔ دوسری طرف یہ اور لے دے کے رونق دلہن۔

"میاں تم کوئی لونڈی سا تھ باندھ لاؤ گے، پھر ہم کیا کریں گے۔؟" چچا نے کھلم کھلا مخالفت کی وجہ بیان کر دی۔

"آپ نے مجھے بچہ سمجھ رکھا ہے۔" طاہر میاں جھلا کے بولے۔

"ارے میاں بچے نہیں سمجھا تبھی تو کہتے ہیں ۔ اور کیا بچے ساتھ میں میمیں لایا کرتے ہیں۔؟ جوان ہی تو لاتے ہیں۔"

چار دن دانہ پانی بند رہا اور جیت انہیں طاہر میاں کی ہوئی تھی۔ اور ہوئی۔ معلوم تھا کون سی ماں کا بیٹا ہے۔ دادی نے پرستی آنکھوں سے بیٹے کو دیکھا۔

"موا جنم کا ضدی ہے۔ اسے حیدر میاں رکھ دو تیرہ ہی تاریخ۔ گھر لئے گا اس کالے ٹکا، ہمارا کیا ہے۔ ؟ آج مرے کل دوسرا دن۔ ہاں مگر سن لینا آنے والی سر پکڑ کر روئے گی۔"

شادی جمادی الثانی کی تیرہ کو طے پاگئی۔ اس دن شمس النسا ر کے پاس مٹھائی، گیارہ اشرفیاں اور نجم النسا ر کے لئے ایک جوڑا بھیجا گیا۔ سرجوڑی کا۔ زرتار کا کمڑا دوپٹہ جس پہ جھم جھم کرتا روپہلی ٹھپہ ٹکا ہوا تھا۔ تار بانے کی ہری ہری چولی کرتی۔ کمخواب کا آڑا، پاجامہ۔ ادھر بے بسی جوابی کارروائی ہوئی اور اس دھوم دھڑکے میں رات کے دس ساڑھے دس بج گئے۔ طاہر میاں لاکھ ناں ناں بھی کرتے رہے مگر چھٹکارا بھلا کیسے مل جاتا۔ ! حویلی میں انہی موقعوں پر تو لڑکے لڑکیوں کو اودھم مچانے اور نظر بازی کرنے کا موقع ملتا ہے۔ طاہر میاں پھولوں کی جھالریں ہٹاتے اپنے کمرے کو بھاگے۔ بلا گرمیوں کے دن تھے۔ وہاں بھی وحشت ہو رہی تھی۔ پٹ پٹا کر پچھواڑے کی انگنائی کی طرف دوڑے، جہاں سکون ملنے کی امید تھی، مگر یہ کہاں معلوم تھا کہ وہیں سکون لٹ جائے گا۔

اماں جان اپنے اصولوں کی تیزی پابند تھیں۔ جو چاہتیں وہی کرتیں۔ لوگوں کا کہنا سننا تو ایک طرف رہا ___ اللہ جنت نصیب کرے اپنے میاں کی بھی نہیں سنی۔ حویلی بھر میں وہی وہ پاجتی تھیں۔ بڑی

وضع داری کی تھیں۔ ایک اصول ان کا یہ بھی تھا کہ نوکروں کو جانور
سمجھا جاتا تھا۔ ہر قسم کی زیادتی نوکروں کے لئے روا تھی۔ نوکر حویلی
کے باورچی خانے میں پکا ہوا کھانا نہیں کھا سکتے تھے۔ جو بھنگی حماموں
میں نہیں نہا سکتے تھے۔ کمروں سے ملحق دالانوں میں نہیں سو سکتے تھے۔
پچھواڑے بنوا دی کھپریلیں پر چھپر تڑے تھے جہاں ان کی سیج ہوتی۔ جاڑوں
گرمیوں کی کوئی تخصیص نہ تھی۔ ویسے حویلی کے سرکار لوگ اتنے مہربان
تھے کہ نوکرانیوں اور ماماؤں کو اپنے کمروں میں بلا بلا کر پناہ دیتے تھے۔
اپنے حماموں میں نہانے کی اجازت دیتے تھے۔ اب یہ اللہ کو معلوم
یا ان کے دلوں کو کہ اس میں ان کا اپنا کوئی فائدہ تھا یا نہیں، مگر
تھے بڑے مہربان۔!

اتنی بڑی حویلی جو سدا آباد رہتی تھی اس میں اتنا سکون تو تھا
ہی نہ تھا کہ دن میں کسی کونے کھدرے میں بیٹھ کر چپ چاپ نہا لیا جائے۔
اسی لئے چھوکریاں عموماً راتوں کو مہندی کی باڑھوں میں دوپٹے تان
کر نہا لیتیں کہ اس وقت کسی خطرے کا اندیشہ نہ ہوتا۔

طاہر میاں پچھواڑے کی انگنائی کی طرف چل دیئے۔ پہلے تو
جا کر اک دم بیچوں بیچ کھڑے ہو گئے، گویا چوری کر کے آئے ہوں
اور سکون ملنے پر دم لے رہے ہوں۔ پھر جب ہوش ٹھکانے ہوئے
تو چہل قدمی شروع کی۔

کیا غضب ہیں یہ [illegible] ستاروں بھری [illegible] جھلملاتے جاتے اور
ٹمٹماتے جاتے۔ آسمان پر چاند تھا نہ تارے [illegible] دور درختوں میں ہوا کے
ٹھنڈے ٹھنڈے جھونکے۔ جیسے ہی مہندی کی پتلی ٹہنیوں کی ہلکی ہلکی

خوشبو تھی۔ ہنگاموں سے دور۔ طاہر میاں کو اسی سکون اور فضاء کی ضرورت تھی۔ کتے کی طرح ناک اٹھا کر انہوں نے مہندی کی خوشبو اپنی ناک میں بھر لینی چاہی۔ اسی لمحے انہیں احساس ہوا کہ پیچھے سے شڑاپ شڑاپ آواز آ رہی ہے۔ جیسے کوئی لوٹے سے بدن پر پانی ڈالے۔ کونے میں مہندی کی گھنی جھاڑی تھی۔

"اونہہ! ہوگا کوئی۔ مجھے کیا پڑی ہے کہ جھانکتا پھروں۔"

پھر دو ہی تین قدم۔۔

اتنے میں ایک سریلی سی آواز آئی۔ طاہر میاں اگر شاعر ہوتے تو اسے ضرور ہی کوئی اچھوتی تشبیہہ سوچتے اور شعر میں ڈھال لیتے۔

"ٹونے رے بدن۔
چھیڑے رے پون۔
ٹھنڈا ٹھنڈا پانی مورے۔۔۔۔۔"

آگے چل کر آواز ڈوب ڈوب جاتی تھی۔ غالباً نہانے والی پانی کے بدن پر گرنے کی کیفیت کو گیت کے بولوں میں بیان کر رہی تھی۔

طاہر میاں نے دو چار ترسے ترسے قدم ڈالے اور مہندی کی ڈالیوں میں منہ گھسا کر ادھر جھانکا، اور بس جھانکتے ہی رہ گئے۔ گوری گوری گوری، پیٹھ پہ بال، کیسے لمبے سنپولیوں ایسے بال، بھیگے بھیگے، قطرہ قطرہ پانی ٹپکتا ہوا، گویا موتی ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر رہے ہوں۔ سنہری ماتھے پہ بال جو پیٹھ سے چپک کر پیٹھ کا ایک حصہ ہو گئے تھے۔ سیمیں ہاتھ اٹھا ہوا۔ ہاتھ میں کانسی کا بد وضع لوٹا۔ لوٹے میں سے گرتا

ہوا پانی۔ منہ میں گیت۔ اور گیت کے بول۔

"چھیڑے رے پون۔

جیسے نردئی سجن۔

ٹھنڈا ٹھنڈا پانی مورے......"

پاس دھری ہوئی سنبھلوئی میں لوٹا ڈولتا۔ ابھرتا۔ پھر دیپ
صندل کی ڈال اب ہاتھ اٹھتا اور شرڑا پ سے سارا پانی سر سے
بہتا ہوا پورے بدن پر گر جاتا۔

مہندی کی جھاڑی سرسرائی اور نہلانے والی ٹھٹھی۔

"اوئی میرے مولا۔" پاس پڑی چادر کو اٹھا سیدھا لپیٹی
لپٹاتی مڑ مڑ کے دیکھتی وہ اک دم دالان والے چھوٹے نمرے میں گم
ہو گئی۔

مہندی کی ڈال اب تک ہاتھ میں تھی اور طاہر میاں کو تو
صرف اتنا یاد تھا کہ نہانے والی نے جب پلٹ کر دیکھا تھا تو اس
کا مکھڑا چاند ایسا تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی بادام ایسی تھیں۔ گالوں
پر کشمیری باغ کے سیبوں کا دھوکا ہوا تھا۔ اور ایک جھٹکے
سے جب اس کے بال منہ پر آ گرے تھے تو اسی لمحے چاند بھی بدلیوں
میں جا چھپا تھا۔

اور یہ سب کچھ ایک لمحے میں ہوا تھا۔ اور اسی ایک لمحے میں
صدیاں بیت گئی تھیں۔

اور شاید مدت بعد ایسا موقع آیا کہ طاہر میاں اس دن صبح
ہاسپٹل نہیں گئے

حویلی میں ماماؤں، کنیزوں اور چھوکریوں کی کمی نہ تھی۔ اور پھر حویلی سے لگا ہوا امام باڑہ بھی تھا۔ دن کی روشنی میں بھی وہاں کھیل کھیلے جاتے اور رات تو خیر تاریک ہوتی ہی ہے۔

تپہ نہیں کون سے درخت کا پھل تھی شبو، مگر تھی تاروں میں چاند۔ اور اسی چاند کی چمک نے طاہر میاں کی آنکھوں کو کھبلا کر رکھ دیا تھا۔ ڈاکٹر تھے۔ ہزاروں کا علاج کیا اور کر رہے تھے۔ اب جو دل پہ ہاتھ رکھ

کر پڑے تو کوئی حکمت کام نہ آئی۔

اماں جان کا ایک اصول یہ بھی تھا، اور اچھا ہی اصول تھا۔ کہ جہاں حویلی میں کوئی چھوکری جوان ہوئی اس کے ہاتھ پیلے کر دیئے اس پر بھی کھیل کھیلے تو اس کی نیکی بدی اس کے ساتھ۔

اللہ رکھی کی شادی اماں جان نے تیرہویں ہی برس کر دی تھی۔ کمبخت کے ہاتھ پیر ایسے تھے کہ بیس برس کی معلوم پڑتی۔ نصیب تو کسی کے بس کی بات نہیں۔ شادی کے تھوڑے ہی دنوں بعد مرد چل بسا۔ وہ آ کے پھر اماں جان کے گلے ہی پڑی۔ حویلی میں ایک خانساماں بھی تھا۔ اچھا تھا بے چارہ ہاں رنڈوا ضرور تھا۔ اماں جان نے چاہا دونوں کے سر جوڑ دیں، مگر اللہ رکھی نے ہاں نہ کی۔

"ہمارے تکدیر کی بات نہ تھی بیگم صاحب! اب تو ہم یونہی اچھے ہیں۔"

جوانی اور چاندنی ۔ سات پردوں میں سے بھی چھٹی پڑتی ہیں۔ اللہ رکھی کی جوانی بھی ایسی ویسی نہ تھی۔ چلتی تو زمین ہلتی۔ بیٹھتی

تو چار پائی تک پر چھپوں دیتی۔ کون آنکھوں پھوڑا ایسا تھا۔ کہ ایسے دمکتے چمکتے ہیرے کو دیکھتا اور ان پہ تاج کی ڈیوٹ نہ بنا لیتا۔ بڑی پارسائی بھی تو ایسے موقعوں پر کام آتی۔

اماں جان کا یہ کبھی دستور تھا کہ جہاں حویلی میں کسی چھوکری چاکری کی جنائی ہوئی اور یہ جا پہنچیں موقعۂ واردات پر۔ حویلی والی مسجد کے امام صاحب کو بلوا کر کان میں اذان پڑھواتیں۔ بڑی سی ایک کتاب تھی۔ رجسٹر تھا۔ اس میں بچے کی ماں اور باپ کا نام درج کروائیں۔

یہ بہت پرانا دستور تھا اور ایسی کئی کتابیں پٹی پڑی تھیں۔

اللہ رکھی میٹھے بتاشے گٹکنے لگی۔ چلتی لوپوں جیسے بوجھ سر پہ آن پڑا ہو۔ میٹھی لوریوں پسر پسر کر جیسے مہینوں کی تھکی ہوئی ہو۔ مرد کا کیا چھپ بھی جاتا ہے۔ مگر عورت کا کیا چھپ نہیں سکتا۔ کس کم نے یہ تحفہ عطا کیا تھا۔؟ یہ تو اسی کا دل جانے۔ مگر دالان والے چبوترے پر ایک دن جب ہائے ہائے مچی تو اماں جان جا پہنچیں اور بس ششدر کر ہی رہ گئیں۔ اذان تو کان میں جوں توں پڑھ گئی۔ مگر باپ کے نام پر اللہ رکھی کی زبان بند ہو گئی۔

"اری بول چھنال اس کا باپ کون ہے۔؟"

"اس حرام کی پوٹ کو جنتے ہوئے تجھے شرم نہ آئی۔؟"

کس کی مت ماری گئی تھی کہ جرم قبولتا۔ دو منو ہی آنسو تھے۔ کہ چپکے چلے آتے تھے۔ مگر آنسوؤں نے کب کسی کا راز کھولا ہے۔؟

حرام کی پوٹ تو پڑھتی گئی۔ چھنال، حرامزادی جیسے ناموں سے نوازی گئی۔ چھ سال کی تھی کہ ماں مر گئی۔ ماں مری تھا اس ذلت ایسی

بلک بلک کر روتی تھی کہ کلیجہ پھٹا پڑتا تھا۔ جب سے جہاں ہاتھ کچھ
کر بیٹھا، وہیں بیٹھ گئی۔ رسالہ دیا سو گئی۔ اماں جان تو اس کے نام کا ٹیکا
کمانے ہی کرنے والے تو گویا نہ کر گزرے تھے۔ مگر یہ ضرور تھا کہ کتاب
میں سبھی کے نام میں ولدیت کے درج تھے۔ یہی پیار دلا بیٹھی تھی کہ
صہبا بنی پھرتی تھی۔

جوانی آئی تو وہ رنگ روپ نکلا کہ گلاب کی کلیوں کو بھی مات
کر دیا۔ کلیاں تو پھر بھی مرجھا جاتی ہیں، اس کی جوانی تو سدا بہار تھی۔
کلیوں پر شبنم پڑتی ہے تو پھیل جاتی ہے، اس کے بدن پر گر کر تو شبنم
کو بھی پھیلنے کا یارا نہ رہ جاتا۔ بنجارن جیسے موٹے جھوٹے کپڑے
ململی چادر اور چاندی کے یہ بڑے بڑے لٹکتے جھمکتے بالے پہنے چلتی
تو دیکھنے والے دیکھتے اور پھر نگاہ نہ ہٹتی۔ طاہر میاں کی نگاہ بھی تو
ایسی پڑی تھی کہ جم کر ہی رہ گئی تھی۔ اور طاہر میاں نے اسے دیکھا کس
روپ میں تھا۔

اس انداز سے بدن سکوڑے بیٹھی تھی کہ آجا کے بس پیٹھ ہی
پیٹھ نظر آتی تھی۔ یا پھر عمر خیام کی صراحی جیسی گردن کا وہ پچھلا
حصہ جہاں بالوں نے جال سا بچھا رکھا تھا۔ یا پھر وہ پھیلی ہوئی
چاندنی بھرے بھرے ہاتھ۔ جن میں کاسنی کا ٹیڑھا میڑھا کٹورا
تھا۔!!

چوتھے دن طاہر میاں نے ہسپتال کا رخ کیا۔ ایسے مرے مرے
بیٹھے تھے جیسے جان ہی نہ ہو بدن میں۔ دوسرا ساتھی ڈاکٹر تو تندہی
سے عورتوں کو دیکھنے میں مشغول تھا، یہ یونہی جیسے اونگھتے اونگھتے

چھٹیاں بیتا کر رہے تھے۔

اک دم اس نے پکارا۔ "بھئی طاہر دیکھنا ذرا۔ ایسے کہیں آجاتا تو بڑی مشکل ہو جاتی ہے۔ بتاتی ہی نہیں کچھ یہ لڑکی۔ بس پیٹ پکڑے کھڑی ہے۔"

طاہر میاں نے ادھر اچٹتی سی نگاہ پھینکی اور اک دم جنم جنم کی نیند سے جاگ پڑے اور پانی کی لہر دل میں ہلکورے لیتا ہوا گیت ان کے ذہن کے افق پر ابھرنے لگا۔

"ٹوٹے رہے بدن۔
چھوٹے رہے لوت۔
جیسے نردی سجن
ٹھنڈا ٹھنڈا پانی مورے......"

گھر پہنچ کر طاہر میاں نے چھو نردل کا رخ کیا۔" وہ بیمار ہے تو پھر یہ ڈاکٹری کس کام کی ؟" کوٹ کا ندھے پر، اسٹیتھسکوپ گلے میں۔

" ارے بھئی شہر میں بیماریاں پھیل رہی ہیں، کوئی بیمار تو نہیں یہاں۔؟ سارے نوکر سٹ پٹا گئے۔ سرکار لوگوں نے اتنا کرم تو کبھی نہ کیا ہوگا۔ چھوٹے میاں خود اپنے قدموں چل کر آئے۔ وہ تو اپنا دل ہی بچھا دیتے۔ دوڑ دوڑ کر آئے اور سنانے لگے اپنی اپنی۔

ایک سوکھی سڑی سی وقت کی ماری بڑھیا کے کاندھے سے لگی لگی۔

وہ بھی آئی۔

" اے میاں۔! تمہارے صدقے، دیکھو تو ذرا۔ اللہ ماری کا جگر ہی ٹھیک نہیں۔ ساری رات کھا دیوے پچکے ہے۔"

"تیرا نام کیا ہے۔؟"

"شبو۔" جیسے بانسری بج اٹھی

حویلی میں گل شبو کے جتنے پودے تھے سب اسی لمحے اپنی تازگی اور بہار کھو بیٹھے۔

"شادی ہو گئی تیری۔؟"

وہ تو دوہری ہی ہو گئی اس سوال پر۔ بدن چرا کر طاہر میاں کو ایسے کورے کورے دیدوں سے دیکھا کہ طاہر میاں دوسری بار مر مر گئے۔

کیا ہے۔ جاڑوں میں کہ ہلکی ہلکی سردی اور مہکی مہکی گرمی مل جل کر موسم کو عجیب پر کیف بنا دیتی ہے، یہی لہکا ہوا موسم طاہر میاں کو جیسے انگاروں میں لا ڈالتا۔

بڑے پیر کی نیاز کو اماں جان سال کے سال بڑے دھوم دھام سے کرتیں۔ اس دن تو طاہر میاں کو بھی ہاسٹل سے چھٹی لینی پڑتی۔ پھر ان دنوں تو طاہر میاں چھٹی پر ہی تھے۔ شادی میں چار دن ہی تو رہ گئے تھے۔ شادی اور نیاز کی گڑبڑنے مل کر پوری حویلی میں ہنگامہ بپا کر دیا تھا۔ اماں نے اب کے یہ جتن کیا کہ ایک ہی بار دو کام سلجھ جائیں۔

شادی کے دن دانے کھلانے کے ساتھ نیاز کی دیگ بھی اترنی تھی۔ لپ جھپ۔ سرسر۔ آنچل ہی آنچل، رنگین جیسے قوس قزح۔ سارا دن دن یہی گڑبڑ رہی۔ طاہر میاں تو دل پکڑے بیٹھے تھے۔

دولہا دلہن کا منہ جھوٹا کرانے، ملیدے کی رکابی پکڑے شبو دالان سے نکلی تو اک دم لڑکھڑا گئی۔

"بھ..... بھ..... بھوت۔" وہ پوری طاقت سے چلائی۔

بھوت ووت کچھ بھی نہ تھا۔ طاہر میاں تھے۔ لیلا کے مجنوں بنے طاہر میاں اندھیرے اجالے کو نے کونے اسے کھوجتے پھرتے تھے۔ ملبہ ہے وہیں چبوترے پر بکھر گیا اور اکدم طاہر میاں نے اسے بانہوں میں سمیٹ لیا۔

"چھوٹے میاں۔!" اس نے بوکھلا کر پوچھا۔

"ہاں ہاں۔ میں نہانے کے لئے ادھر ہی چلا تھا۔ ابھی نہ سنبھالتا تو ہڈی پسلی چورا ہو جاتی۔ دیکھتی نہیں چبوترہ کتنا اونچا ہے۔؟ اور پھر تو ہے بھی تو بڑی موٹی سی۔ تیہ بھی نہ چلتا۔"

اتنی ساری باتوں کے جواب میں وہاں بس سالنوں کی میٹھی میٹھی آواز۔

"اچھا۔! تیری شادی ہو گئی رہی۔؟"

"اونہوں۔" اس نے پتلی سی گردن کو زور کا جھٹکا دیا۔

"پھر اس دن شرما کیوں رہی تھی۔؟"

"ہونے والی جو ہے۔؟"

"ہائیں! مگر کس کے ساتھ۔؟"

"کلو کے باپ ساتھ۔" وہ رونی آواز سے بولی۔

ستون کی آڑ سے کھینچ کر طاہر میاں اسے بھرپور اجالے میں لے آئے۔

"ایں! کلو کے باپ کے ساتھ، یا کلو کے ساتھ۔؟"

"اونہوں۔" وہ جھجکا کر بولی۔ "کلو کے باپ کے ساتھ!"

"ارے اس بڈھے کے ساتھ۔؟ کلو خود تو تیس چالیس کا ہے،

پھر اس کا باپ ؟ مگر اسی کے ساتھ کیوں۔؟"

"نانی نے لگائی ہے ہماری بات، ہم کیا کریں۔؟"

"ہونہہ۔!" طاہر میاں نے اس کا منہ چڑایا۔" نانی نے لگائی ہے ہماری بات! تو تو کچھ نہیں کرسکتی۔؟"

اس نے بس آنکھیں اٹھا کر ہی تو دیکھا تھا۔ اور اس لمحے طاہر میاں کو پہلی بار یہ احساس ہوا کہ عورت کی آنکھوں میں مظلومیت کے آنسو ہوں تو مرد آگ میں بھی کود سکتا ہے۔

"تجھے پسند ہے کلو کا باپ۔؟"

"مرے سور کا جنا اور ہمارا کال پیچھے۔ آتے جاتے رانی کہہ کہہ کر چھیڑتے ہے ہمیں۔"

"ہوں تو یہ بات ہے۔"

"اچھا جانے دے یہ ذکر، یہ بتا یہ پلیٹ میں کیا لئے جا رہی تھی تو۔؟"

"اے ہے اِتا بھی نہیں مالوم۔ شادی کے دن دولہا دلہن کا منہ نہیں جھوٹا ان۔؟"

"اس سے کیا ہوتا ہے؟" طاہر میاں نے بن کر پوچھا۔

"کیا ہوتا ہے بس....." اور شبو لاجونتی بن گئی

"رشتہ پکا ہو جاتا ہے۔"

شبو اپنی چادر میں دوہری ہو گئی اور طاہر میاں آگ میں کود پڑے کہ اس پھول کو بچا لیں۔ اِدھر اُدھر ہاتھ مار کر انہوں نے چبوترے پر بکھرا ہوا ملیدہ سمیٹا اور نوالہ بنا کر شبو کے منہ میں ٹھونس دیا۔

شہرِ ممنوع

تِل

سارا جھگڑا یہ تھا کہ نوری کی گوری گوری پنڈلی پر ایک ننھا سا کالا تل تھا۔ مگر یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ بہتوں کی پنڈلیوں پر تل ہوتے ہیں۔

اصل جھگڑا یہ تھا کہ مدن میاں نے نوری کی پنڈلی کا تل دیکھ لیا تھا۔ اصل جھگڑا یہ بھی نہ تھا۔ بات دراصل یوں تھی کہ نوری کی پنڈلی کے تل سے مدن میاں نے اور بھی کئی سلسلے ملائے۔ کچھ یوں سوچا کہ ہوسکتا ہے نوری کے اور بھی کئی جگہ تل ہوں۔ مثلاً کھلے گلے کے کرتے میں سے جو گوری گردن نظر آتی ہے۔ اس کے اتار پر، کسی خوبصورت چھوٹے نشیب میں کوئی چمچاتا تل ہو۔ اور بس اِدھر اُدھر کے خیال جو آتے چلے گئے تو انہوں نے کچھ سوچ کے اپنی ماں کو راضی کیا اور پندرہ ہی دنوں کے اندر اندر چٹ منگنی پٹ بیاہ کروا لیا۔

اور یہ سب کچھ ہوتا بھی ناں اگر اس دن مدن میاں کا ادبدا کے نماز پڑھنے کو جی نہ چاہ جاتا۔ لگ بھگ چار پانچ بجے کے انداز میں انہوں نے عصر کی نماز کے لئے لوٹا اٹھایا، پانی بھرا اور وضو بنانے بیٹھے

آنگن جا بیٹھے۔ آنگن کے بازو دیوار تھی۔ دیوار سے لگ کے بیر کا چھتنار درخت تھا۔ جس پر دنادن پتھر برس رہے تھے۔ ایک بیر ٹپ سے آکر ان کے سر پہ لگا۔ انہوں نے سر تھوڑا لیا۔ دوسرا بیر چٹ سے آکر ان کی پیٹھ پر گرا۔ انہوں نے تن تنا کر منہ پھیر کر آدھ گالی کہنی ہی چاہی تھی کہ تڑ سے ایک بیر ان کی ناک پر آگرا۔ اب تو ان کا ڈھول چھلک گیا۔ چلا کر بولے۔

"کون تیس مار خانم ہے یہ۔ ٹانگ سیدھی کر دوں گا اگی آکے۔"

معلوم تھا گھر میں سوائے لڑکیوں کے ایسی سنی کوئی نہیں مچاتا۔ دھوپوں کی سن سناتی دوپہریں ہوں یا جاڑوں کی برفیلی چاندنیاں یہ چھوکریاں سدا اکڑکڑے لگاتی پھرتیں۔

مدن میاں کے جواب میں ادھر سے ٹھن ٹھناتی ہوئی نوری آئی۔ نیلی شلوار جس کے پائنچے چڑھائے ہوئے۔ لال کھلے گلے کا کرتا۔ لال اوڑھنی۔ آتے ہی بولی۔

"ہاں ہاں جھڑ جائیں گے بیر۔ تمہارا کیا جاتا ہے جی۔ بڑے آئے ٹانگ سیدھی کرنے والے۔"

"اچھا ــ تیری اتنی بڑی زبان۔ ٹھہر تو سہی۔"

مدن میاں بڑی گرمی میں آستینیں چڑھاتے ہوئے نوری پر لپکے۔ سوچا ہوگا نوری آتا دیکھ کر بھاگ کھڑی ہوگی، مگر وہ تو ویسی ہی تنی کھڑی رہی۔ انہوں نے اس کی چٹیا گھسیٹ لی۔

"اب بول ــ کرے گی زبان درازی ــ ایں ــ ؟"

"ادں۔ ادں ــ" وہ چلائی ــ "بڑے کہیں کے آئے۔ اس دن

بچی بے کے اتا مارا اور آج بھی چٹیا نوچ ڈالی ۔ ابھی اماں سے جا کہتی ہوں ۔"

مدن میاں سٹ پٹا گئے ۔ یہ بہر کالے چھوکری اب خالہ بی سے جانے کیا کیا جا لگائے ۔ ذرا نرم پڑ کر بولے ۔

"کہاں مارا تمہارے میاں نے ۔؟"

"ہاں ہاں ۔ اس دن ہم آنگن میں "چڑی چھپا کا" کھیل رہے تھے تو کس نے یہ اتنا بڑا اینڈا پھینک کے مارا تھا ۔؟" اکدم دو بکھی ہو کر بولی ۔ "کیوں جی یہ آنگن تمہارے باپ کا ہے ۔؟"

مدن میاں صاف مکر گئے ۔"جھوٹ بکتی ہے ۔ میں نے تجھے تو کیا آج تک کسی نوکر کے بھی پتھر نہ مارا ہوگا ۔"

"اوں ۔ جھوٹے کہیں کے ۔ یہ دیکھو تو ۔" اور اس نے جھوٹ اپنی نیلی شلوار کا پائنچہ گھٹنوں تک چڑھا لیا ۔

"یہ دیکھو ۔ یہ نیلا نیلا نشان ۔ پتھر کی چوٹ کچھ کم نہیں ہوتی ۔ جی ۔ ہاں ۔!"

وہ کمبخت تو پتھر کی چوٹ بتا رہی تھی اور میاں دل چوٹ کھا گیا ۔ بڑی اُجلی اُجلی ۔ دُھلی دُھلی سی پنڈلی تھی ۔ اور غروب ہوتے سورج کی پیلی پیلی دھوپوں میں نہا کر تو سونا جیسی بن گئی تھی ۔ نیل دیل کچھ بھی نہ تھا ۔ ہاں ایک تل ضرور چمک رہا تھا ۔ کالا کالا ۔

اور قبل اس کے کہ مدن میاں کچھ سنبھلتے یا کسی حیلے بہانے سے ابھی تھوڑی دیر اس کی پنڈلی ہی دیکھتے رہتے ، وہ پیر پٹختی ۔ تینوں بیر بہٹی جیسی لال لال اوڑھنی کا آنچل اڑاتی یہ جا ، وہ جا ۔

مدن میاں کئی منٹ تک تو وہاں کھڑے رہے۔ عصر کا وقت ٹلا جا رہا تھا۔ ہڑبڑا کر نماز کو چل دیئے۔

ایک ننھی شہزادی

"ہا۔ بیچاری۔" دادی بی کو شہزادی پر شدید ترس آیا۔ بمر وقتہ بیچ کر وہ ساکت ہی ہو گئیں۔

"تو آگے ہوا کیا۔؟" کسی نے بیچ میں ٹوکا دیا۔

"ارے ہوتا کیا۔ بدنصیبوں جلی کی قسمت میں تو ٹھوکریں ہی لکھی تھیں۔ کبھی تو بھول کے مسکرانا نصیب نہ ہوا اس کو۔!"

"سبحان اللہ، دادی بی۔ آپ تو ایسے ترس کھا رہی ہیں وہ سچ مچ کی ہی شہزادی تھی جیسے۔ پھر آگے سنائیے نا۔"

"کیا سناؤں۔؟ مجھے نیند آ رہی ہے اب۔" دادی بی نے منہ پھاڑ کر جمائی لی۔

"دادی بی اگر آپ نے کہانی پوری نہ کی نا تو یاد رکھیے ہم کل آپ کا پاندان چھپا دیں گے، پھر لیٹی رہیے گا دن بھر جمائیاں۔" ہاں۔"

دادی بی نے پھر ڈوری پکڑ لی۔

"اسے ہے بڑی کرموں جلی تھی۔ پیدا ہوتے وقت کوئی منحوس تارا کھڑا ہو گا نصیبوں تو۔ اب آج کے راجہ کو بھی سوجھا کہ نہ سہی کوئی شہزادہ، کسی وزیر زادے سے ہی نکاح پڑھوا دیں۔ اسے کرتی بھی کیا بیچاری! بال جو پکے جا رہے تھے شہزادی کے۔ ادھر رانی چپکے چپکے

راجہ کی جان کھائے جاتی۔

"اجی سنتے ہو۔! لڑکی دکھائی نہیں دیتی سامنے۔؟ جیسے سفید دانت ہیں ایسے ہی سفید بال بھی ہولیں، تب اٹھانا۔ ہاں آگئے تم جانو؛ "مگر راجہ کہاں سنتا اس کی بات۔ وہ تو محل میں بھی بھولے بسرے ہی آتا۔"

"تو دادی بی،" بیچ میں شبو ماں نے بات کاٹی، "آخر اس غریب شاہزادی کی شادی ہوئی بھی کسی سے۔؟"

"اے لو اور سنو ـــ کہانی کا انجام پہلے ہی سے سنا دیا تو کیا مزہ رہا۔؟ دیا ایسی نصیبوں کی پوری بیچاری۔

"ہاں تو رانی نے سوچا کہ یوں تو بات نہیں بنتی۔ ایسا کریں گے۔ کہ ایک دن ...."

اسحاق میاں نے ٹوپی پلنگ کی پٹی پر دھری، اچکن اتار کے کھونٹی سے ٹانگی اور بڑی چچی سے بولے۔

"اجی سنتی ہو بھابی جان۔! وہ مدن میاں نے اپنی خلیری بہن نوری سے شادی رچالی۔"

"ہائیں۔ ؟کیا کہتے ہو میاں۔؟" وہ نیند میں جھپکیاں لیتی پڑی تھیں۔ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ "ایسے کیسے ہو سکتا ہے بھلا۔؟"

"ہو سکنے کی بات تو چلتے ہی دیکھئے۔ ہو چکا ہے۔!"

بڑی چچی چڑ کر بولیں۔ "موئی گُن کی نہ ڈھنگ کی کس بات پہ دیکھے گئے۔ صاحبزادے! سارا دن تو گلی کے پوتوں کے ساتھ ہڑدنگ مچاتی پھرتی ہے۔ لو کیا زمانہ آلگا ہے۔ بچپن کی نسبت بغیر

پر چھے گئے تو ذ مینیکی۔ سوئی نسبت نہ ہوئی پتنگ ہو گئی جب دل چاہا اتار لی۔ مگر یہ ہوا کیسے۔؟"

"سجانی جان ۔۔ اب پسلی کا جو رستا مل گیا۔ جو ہوا سو ہوا، مگر اب ہماری شجو ماں کا کیا ہوگا۔؟ اور پھر شجو ماں کی وجہ سے ربو ماں کا کیا بنے گا۔؟ ربو کے سسرال والے تو یوں ہی ایک ٹانگ پکھڑے ہیں۔ جیسے تیسے انہیں تھاپ دے دے کر روکے ہوئے تھے، اب تو وہ صاف کہہ دینگے ۔" نہ بابا، ہم اور انتظار نہیں کر سکتے۔ ایسے کیا ہیرے جڑے ہیں تمہاری بیٹی میں، کیوں جھوٹ کہتا ہوں۔؟"

بڑی چچی نے بڑی حسرت سے شجو ماں کی طرف دیکھا، جو بد نصیب شہزادی کی کہانی آنکھوں میں نمی لئے سن رہی تھی۔

گرتی دیوار

ابھی شجو ماں بغدادی قاعدہ ہی پڑھتی تھی کہ مدن میاں سے بات پکی ہو گئی۔ ربو، جو شجو ماں کے لگ بھگ تین برس بعد پیدا ہوئی تھی، ابھی بالکل ہی گڑیا جیسی تھی۔ مگر وہ بھی اپنے چچا کے بیٹے کو منگی ہوئی تھی۔ ادھر بغدادی قاعدہ سامنے دھرا ہوتا اور ادھر شجو ماں کی مدن میاں سے نوکا جھونکی چلتی رہتی۔ پہاڑے یاد ہوتے رہتے اور مدن میاں سے ٹھولا ٹھالی چلتی رہتی۔ دیکھنے والے دیکھتے اور ہنس دیتے۔ بڑی چچی کہتیں۔ "اے تمہارے وقتوں میں ایسا نہیں ہوتا تھا۔

اسی لئے ہنسی آتی ہے نا۔ ہمارے ماموں تو اپنی ہونیوالی دلہن کو گود میں اٹھائے پھرتے تھے۔ ہاں اور کیا! اور بھئی یہ تو ہونا ہی چاہئیے۔ میاں بی بی کی عمروں اور کچھ نہیں تو دس برس کا فرق تو ہو۔ ورنہ یہ کیا ہے۔ وہ بی بی صاحبہ کے تو دانت بھی کھل کھلے ہو گئے اور میاں ہیں کہ وہی تنی ہوئی کاٹھی اور کوے کے پروں ایسا سر لئے گھوم رہے ہیں۔ اکی سے تو ناچاتی بڑھتی ہے۔ میاں تو دیکھنے میں جوان اور بی بی بوڑھی۔ یوں نظروں سے بی بی گرے تو رنڈی کی منڈی تو تیار رہے ہی۔ مرد کی کاٹھی کو عورت کہاں پائے۔ ؟"

مدن میاں اور شمجو مان کا بھی اچھا خاصہ فرق تھا۔ سب کے ساتھ شمجو مان بھی اپنا بھولا بھولا منہ اٹھا کر انہیں مدن بھائی کہتی، مگر کوئی نہ کوئی اسے ٹہوکا دے ہی دیتا۔

"اری کل جبھی! بھائی پکارتی ہے ہونیوالے دولہے کو۔" اب شمجو مان کو تو یہ معلوم نہ تھا کہ دولہا کیا ہوتا ہے، مگر اتنا ضرور معلوم تھا کہ دولہے کے نام پر شرمایا جاتا ہے۔ بس وہ گٹھری سی بن جاتی۔

مدن میاں وکالت پڑھ رہے تھے۔ گویا بڑی انہونی بات کر رہے تھے، مگر ساس سسرے خوش تھے۔ پڑھے لکھے داماد تو ان دنوں بولتی سپاری اور ہنستی بونگ کی طرح عنقا تھے۔ اب یہ تو اپنے اپنے نصیب کی بات ہے کہ شمجو مان کو تو وکیل دولہا ملے اور ربو بیچاری کو جاہل جٹ، گنوار کالٹھ۔ ماں تو یہی سوچ کر نڈھال ہوئی جاتیں کہ کیسے یہ سوٹ نبھے گی۔؟ کیونکہ اور کچھ نہ سہی، مگر، ربو جبر سے بغدادی قاعدہ اور کلام مجید تو پڑھ ہی چکی تھی۔ دو کتابیں اردو کی۔

اور پھر دس بارہ تک پہاڑے بھی تو یاد تھے اسے۔!

ادھر شجو ماں نے سولہویں میں اور ربو نے تیرھویں میں قدم رکھا نہیں کہ ادھر سے ربو کے سسرال والوں نے ادھم مچا دی۔

"اے بہن دیکھو تو سہی! جان جوان بیٹی یوں ہی بٹھال رکھی ہے۔ آخر کب اٹھانے کا ارادہ ہے۔؟"

پیغام تو دونوں ہی کے موجود تھے۔ مگر مدن میاں کی اماں کہتی تھیں، اماں کیا کہتی تھیں، خود مدن میاں کہتے تھے کہ پہلے ایل۔ایل بی کی خلعت پہن لیں۔ پھر کرلیں گے شادی وادی بھی۔ ربو کے سسرال والوں نے کیا کیا کھائیاں نہیں کھالیں۔؟

"اے ہم تو پچھتائے ان کے گھر کی بیٹی اٹھاکر۔ نوج کوئی اس عمر کو ٹل جانے دے۔ اب تو ٹانگ سے باندھ رکھا ہے، پھر ڈھلتی ہیں اٹھانا۔"

بڑی چچی نے انہیں بڑی صلاحیت سے ٹلا دے دیئے۔"بات کرنے میں تین برس نکل جائیں گے۔ پھر دیکھو دو منڈھے ساتھ ہی ساتھ چڑھیں گے۔ اے بہن! تم انہی ہی والی ہو۔ ذرا سوچو تو سہی چھوٹی کو دواع کرکے بڑی کو نہ اٹھایا تو کہنے والے کیا تھوکیں گے۔ میرے منہ پر کہ ہوگا بڑی میں کوئی عیب تبھی تو چھوٹی کو اٹھا دیا۔ اب اللہ سمجھے تم لوگوں سے کیا پردہ۔ بس ایک یہی مجبوری ہے۔ اور اتنا تو تمہیں معلوم ہے بہن کہ کرنے دھرنے والی اکیلی میں ہی میں ہوں!"

یہ بڑی چچی کے میاں سید رزاق بھی بڑے گنوں کے تھے۔ اب بڑھاپے میں آکر بڑے سیدھے بن گئے تو کیا ہوا۔ ؟ کیا کیا جلا پے

انہوں نے بڑی جیجی کو نہیں دیئے۔ بس کھولتے پانی میں ڈال کر چوش تو نہیں دیا۔ باقی سب کھیل کھیل ڈالے۔ ساس نندیں تو بیٹے بھائی کے کرتوت سے کاہے پردہ اٹھاتیں۔ مگر چھوٹی نند نے بھولپن سے ایک بار کہا بھی تھا کہ "بھائی میاں نے گوری بھاوج کے چکر کے بھی لگائے تھے دست پناہ سے۔"

اب جھوٹ سچ تو اللہ ہی جانے کہ اس جھنجٹ کے پیچھے کیا گل کھلے ہوئے تھے۔ بات۔ وہی ایک بات۔ عشق و محبت کی یہ وارداتیں آج کل سے نہیں، اس گھڑی سے چلی آرہی ہیں جب کہ آدم نے بی بی حوا کی کھوج کی تھی۔ یہ رزاق میاں اپنی ماں کی گوری چٹی، پکے پان جیسی اجلی بھابی کے لئے وقف تھے۔ اب مین دل پر کس کا بس چلا ہے۔

یہ کھیتوں پر نگرانی کے لئے جاتے تھے۔ وہیں جھونپڑیا پر کلوے کسان کی لونڈیا سے آنکھ لڑ گئی۔ ان کا تو لیا گیا، پر بس پیچھے وہ فرد ایک حرامی پلے کی ماں بن گئی۔ اس کو تھاپ پر تھاپ دیئے جاتے تھے کہ بس شادی کر دوں گا تو تجھی سے، ورنہ زہر کھا لوں گا۔ اس بیچاری کو تو یوں ہی برادری والوں نے نکال باہر کیا تھا۔ کرتی بھی کیا۔

اب ادھر ماں باپ نے شادی کی بات اٹھائی۔ پہلے والے تو اپنی بات کے پورے ہوتے تھے۔ رزاق میاں کی ایک نہ چلی۔ باپ نے یہ کہہ کر منہ بند کر دیا کہ "اسلام میں چار چار جائز ہیں۔ ارے میاں محبت ہو گیا تو اس سے نکاح پڑھوا لینا۔" مگر کھلے بندوں جیجی تو انہوں نے بھی نہ دی۔ سید تھے، بات کیسے گرنے دیتے۔ بڑی جیجی بیاہ کر بھی آگئیں۔ مگر میاں کے تیور وہی رہے اب

بھی لپ چھپ کر جھونپڑیا پر جاتے۔ مگر مارے باندھے کے چار چھ
بچے بڑی چچی سے بھی ہو گئے۔ یہ بیچاری بڑی صابر تھیں کبھی منہ
سے نہ پھوٹتیں۔ جو جو پڑی وہ جھیل گئیں۔ کبھی بھولے بسرے ایک
حرف شکایت کا زبان پر لاتیں بھی تو سننے والیاں یوں اچھالتیں۔

"اے واہ، یہ اچھی سنائی بوا۔ کیا محبت نہیں، پیار پریت
نہیں تو پھر یہ بچے کیسے ہوئے۔؟"

بڑی چچی ایک بار تو جل کر بول گئیں اے بچوں کا نہ کہو۔
بچے تو کتے بلیوں کے بھی ہو جاتے ہیں۔ ہما را کیا ہے۔؟"

پورے سسرال میں وہ تھڑی تھڑ ہوئی کہ بڑی دلہن نے
تو اپنے بچوں کو کتے بلیوں کے مقابل بٹھا دیا۔ ایمان کی بات تو یہ
تھی کہ کتے بلیوں کی بھی تو اپنی مرضی ہوتی ہوگی۔ یہاں تو یہ حال
تھا دادا حضرت زبردستی اندر بھیج کر باہر سے کنڈی چڑھا
دیتے اور مارے باندھے کی جوں توں رزاق میاں کو رات بی بی کے
ساتھ بسر کرنی ہی پڑتی۔ مگر سورج شام کو تو ڈھلنا ہی ہے۔ دن بھر
کتنا ہی جگمگ لے۔ اب تو رزاق میاں راستے پر آ گئے تھے۔ جھونپڑیا
والی سے بھی نیچے اوپر تین تین بچے ہوئے، مگر چچوڑی ہوئی ہڈی کو
کون دسترخوان کی زینت بنا لیتا ہے۔؟ دودھ جیسا بے داغ اور
سنگ مرمر ایسا چمکیلا اور سفید جسم جب تک ساتھ دے گیا، دے
گیا۔ پھر وہ آپ ہی آپ دل سے، نظروں سے اتر گئی۔ گاؤں کے
حاکم تھے، کس کی مت ماری گئی تھی کہ فضول پہ چوں کرتا پھرتا۔
یوں تو دلہن کے سسرال والے اس گھڑی مان گئے۔ مگر

ادھر مدن میاں نے وہ ترقی پسندی دکھائی کہ بڑی چچی کے ہاتھوں
کے طوطے اڑ گئے۔ اب تو کوئی ڈھور ڈھکان بھی نہ تھا۔ منگی ہوئی لڑکی
کا پیغام ٹوٹ جاتا میاں تو ایسا سمجھا جاتا کہ حرام کا پلہ جننے والی اس
سے اونچی تھی۔ لوگ باگ یہی تو پوچھتے کہ آخر ایسی کون سی خرابی تھی
کہ ٹھیکرے کی مانگ ٹوٹ گئی۔ پھر وہ بخیر کف والے ہی بیاہ لے جائیں۔
لے جائیں۔ اونچے والے تو بھول کے بھی نہ کرتے۔ بلکہ موقع ملے تو ادر
پردے اٹھالتے۔ اور یہاں تو سوال بڑی بیٹی کا آپڑا تھا۔ رلو ہوتی
تو ایک بات بھی تھی۔ وہ پھر بھی چھوٹی تھی۔ پہلے تو شجو ماں بولی
ہی بڑی اور اس پر سے پیام بھی جاتا رہا۔ بڑی چچی تو حواس ہولے
بھی پاگل ہو کر رہ گئیں۔ ملو پیار لپاڑ کے مدن میاں کی کڑیل جوانی
کو کوسے دیتیں۔ پھر آ جا کے نوری پر صلواتیں پڑتیں۔

"اے بی ہمیں سب معلوم ہے۔ آج کل موا یہی چلن ہو گیا ہے۔
کھلے بندوں، چڑھا دے کے سبلوں کی طرح جوان ہیلاٹ لڑکیاں
چھوڑ دیتے ہیں۔ آپ ہی لڑکوں کی نگاہ دبڑے گی اور من مانی کرینگے۔
کیا ہم نے دیکھا نہیں اتنی بڑی سنڈی کی سنڈی آنگن بیچ کدکڑے
لگاتی پھرتی تھی۔ اب میں کہوں خالہ کا چھوکرا ہوا تو کیا غضب ہو گیا
ہے تو نامحرم۔ معلوم ہے بی، یہ سب چال پہلے ہی چلی ہوئی تھی۔"

اب یہ تو اوپر والے کو ہی معلوم تھا کہ چال واقعی چلی ہوئی تھی
یا اچانک ہی وہ سیاہ تل شجو بان کی تقدیر کی بلا ہی بن کر ان کے
دھچکو کھا گیا! مگر کوسنوں سے ہونا بھی کیا تھا۔ چڑا تو ہاتھ سے
اڑ گیا تھا۔

سنہار نے کاگا ــــ تیرے پیروں باندھوں سونے کا دھاگا۔
میرے بھاگوں کوئی مہمان آتا ہو تو تو اڑجا۔
"ہائے! بیچاری شہزادی روزانہ محل کے پیچھے پہ کھڑی ہو کر یہ آواز لگاتی۔ سیکڑوں کوے منڈیر پہ بیٹھے کے بیٹھے ہی رہتے، کوئی کبھی تو نہ اڑتا۔"
"ہائے ــ تو دادی بی ایسا کہنے سے کیا ہوتا ہوگا بھلا۔؟"
یہ ربو بیچ میں دادی بی کو ٹوک ٹوک دیتی تھی۔
"پھر مجھے ٹوک دیا نا۔! ادی کلموہی، کوے کو پکار کر، اس کے پیروں سونے کے دھاگے باندھنے کا لالچ دیکر اس سے پوچھو 'میرے گھر کوئی مہمان آنیوالا ہے۔؟' اگر اڑ جائے تو سمجھو بالم کو سندیسہ پہنچانے اڑ گیا، اور بیٹھا ہی رہے تو سمجھو بالم ٹالم کوئی ہے ہی نہیں۔ اڑے کبھی تو سندیسہ کیسے دے؟ ہاں، اب سے بیچ میں نہیں بولنا۔ تو بس بیچاری شہزادی کھڑے کھڑے تھک جاتی۔ مگر اس کے نصیب کھلتے تھے نہ کھلے۔ اور بیچاری کو شہر ممنوع میں جانے کی اجازت کبھی نہ ملی۔ اللہ کا نام ٹھہرا، اس کا کام بھی بڑا۔ ایک دن..."
"یہ شہر ممنوع کیا ہوتا ہے دادی بی۔؟" سنجو مان نے بہت ہی سادگی سے سوال کیا۔
دادی بی نے یوں ٹوکے جانے پر گھور کر دیکھا۔ مگر چونکہ سنجو مان بہت کم کوئی سوال کرتی تھی۔ اس لئے پیار سے بولیں۔
"اے تم میں سمجھ بھی کیا! بادشاہ کی مملکت میں ایک بڑا سا باغ نما شہر ہوتا تھا۔ بڑا رنگ برنگا۔ وہاں صرف وہی لوگ جاسکتے

تھے جن کی شادیاں ہو چکی ہوں۔ اور پھر وہ جوڑے وہاں ایک رات گزار کر واپس آ جاتے تھے۔ اور پھر وہ شہران کے لئے شہر ممنوع نہ رہ جاتا تھا۔"

"تو وادی ہی وہاں کنواری لڑکیاں نہ جا سکتی ہوں گی۔"

"لو اور سنو! وہاں بھلا کنواریوں کا کام۔ ؛ شہر ممنوع جو نام پڑا تو تم ایسی کنواریوں کی وجہ سے ہی پڑا بھلی بنتی ہوتی" لو کیا بیاہی۔ کیا ان بیاہی، سبھی ڈھول اڑاتی پھرتیں۔ ؛ مگر وہ تو شہر ممنوع تھا۔

"تو یہ ہے، بیچ بیچ میں سور شتے پڑ جاتے ہیں۔ ہاں تو اللہ کا کرنا ہوا یہ کہ ۔ ۔ ۔ ۔"

اسحاق میاں ہمیشہ کلائمیکس کے لگ بھگ پہنچ کر ایک آدھ زوردار ہوائی چھوڑ دیا کرتے تھے۔ ٹوپی پلنگ کی پٹی پر دھری اچکن اتار کر کھونٹی سے ٹانگی اور بولے۔

"اجی سنتی ہو بھابی جان! وہ جمو میاں کے ابا ملے تھے۔ ربو کی شادی کے بارے میں کہہ رہے تھے۔ یہ بھی صاف صاف سنا دیا کہ اگر جلدی ہی شادی نہ کی تو جھوپام ٹوٹا ہوا ہے۔"

"ہائیں۔ ۔!" بڑی بچی چھالیاں اسی لے رہی تھیں، ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں۔ "ایسے کیسے ہو سکتا ہے بھلا۔ ؟"

"ہو سکنے کی بات چلت دو۔ اور جو ہو گیا تو سر پکڑ کر جھینکنی رہنا۔ میں کہتا ہوں کر ہی دو نا ربو کے ہاتھ پیلے۔ اب اس بے چاری کے لچھن بدتر ہو گئے۔ تم ہی سوچو ایک تو پہلے ہی سکھی سی ہے۔

سی سبھی چھاتی پر مونگ دے گی۔ کیوں جھوٹ کہتا ہوں میں ؟"

"ناں میاں — تم جھوٹ کاہے کو کہو گے! مگر یہ تو سوچو جو بڑی ہے۔ آنکھوں ہوتے دیکھے گی کہ چھوٹی گھر یا ربرت رہی ہے۔ بچے جھلا رہی ہے تو اس کے دل پر کیا بیتے گی ۔ ؟"

"بھابی جان اتنا تو میں بھی سمجھتا ہوں، مگر تم ذرا گہرائی میں تو جھانکو۔ ایک کے ساتھ دوسری کی بھی زندگی تباہ کرنا کہاں کی ایسی دانشمندی ہے۔ اس کے نصیبوں کا بھی کوئی بلخ کا شہزادہ آ ہی جائے گا۔ ہم ایک گن فکر کرتے ہیں تو اوپر والا ہزار گنا کرتا ہے۔ ہاں آگے تم سمجھو۔ اور یہ بھی نہ ہوا تو بیٹھی رہے گی تمہارے کولہے سے لگ کر۔ شکر ہیں دب کر کوڑا مر نہیں جاتا۔"

"کہتے تو ٹھیک ہو میاں۔ ابھی تو اللہ ہی جانے اور کیا کیا دیکھنا اور سننا پڑے۔ کنواری بیٹی اور پہاڑ کو تولو۔ پھر بھی پہاڑ ہی اوپر اوپر اٹھتا چلا جائے۔ یہ پلڑا بڑا بھاری ہوتا ہے میاں۔"

اندھیرا

بچپن سے شجو ماں یہی سنتی آئی تھی کہ دو منڈوے ساتھ ساتھ نہ پڑیں گے۔ وہ ساتھ ہی ساتھ ہلدی چڑھے گی، مہندی لگے گی اور دونوں ساتھ ساتھ ڈولی بیچ چڑھیں گی۔ یہاں تو بیچ ہی میں کٹ کے رہ گئی۔ سال تو شجو ماں کے بیت گئے۔ بڑے ٹھنڈے دل سے سنا کہ بو کی شادی ہو رہی ہے جس کا ابھی صرف سولہواں

تھا ادھر بیاہ شجو ماں تو اٹھا رہ داں بھی پہلا تکنے کی سوچ رہی تھی۔ سر حد کا نے جب کانے شجو ماں نے ربو کی کرتی ہیں مچکے کا سرا لگایا اور ٹپ سے دو آنسو اس کی آنکھوں سے نکل کر اس کی گود میں گر پڑے ۔ وہ تو اچھا ہوا کسی نے یہ جگنو چمکنے دیکھے نہیں ورنہ کہنے والوں کے منہ تو بند نہیں ہیں ۔ کچھ بھی اڑ جاتی ۔

" اونی بہن کا سکھ دیکھا نہیں جا رہا ۔ "

" منہ زور جوانی ہے ۔ سنبھالی نہیں جا رہی ہو گی ۔ "

وہ تو پہلا تیر تھا جو اس کے دل کو چھید گیا ۔ اب تو یہاں دن رات دھڑا دھڑ چولیاں سل رہی ہیں ۔ اس پر با کھڑ دتی ٹہنک رہی ہے کھڑے دو پٹے چنے جا رہے ہیں اور کرن ٹنک رہی ہے ۔ کرتے قطع کئے جا رہے ہیں اور گلے مونڈھے ٹنک رہے ہیں ۔ اور ان سب کاموں میں شجو ماں آگے آگے ہے ۔ ربو تو دن رات پلنگ توڑتی یا پھر سکھی سہیلیوں سے کھسر پھسر کرتی رہتی ۔ سارا کام شجو ماں کے سر تھا ۔ گھر کیا ں بھی سن رہی ہے ۔ جا بے جا پڑ تال بھی پڑ رہی ہے ۔

" اسے ہے شجو ماں ! یہ دیکھو مونڈھے کے پاس سے لبر بڑھی جا رہی ہے ۔ "

" اے بی تمہیں آنکھیں نہیں ۔ ؟ یہ بانکڑی میں نے تمہیں کرتی پر لگانے کے لئے دی تھی ۔ ؟ "

سر پر دن گزرے جا رہے تھے جیسے پڑھائی پر اکے جھونکے ۔ دیکھتے دیکھتے شادی کا دن بھی آ گیا ۔ شجو ماں نے اچھے با وجود

دولہا میاں کی سلامی کی تھالی سجائی۔ ادھر بیو دلہن بنی بیٹھی تھی۔
اور آج کتنے دنوں بعد پھر شجو ماں کی آنکھیں برسے جا رہی تھیں۔
کون جانے یہ آنسو بہن کی جدائی پر تھے یا اپنی بدنصیبی پر!

مہمان بیبیاں اتر رہی تھیں، جان بوجھ کر بڑی چچی کے پاس رکتیں اور پوچھتیں۔ "اری بہن، ہم تو سدا سے سنتے آ رہے تھے کہ دو منڈوے پڑیں گے۔ ہوا کیا۔؟"

"اے بہن، یہی وہ تمہاری بڑی بیٹی ہے جس کا ناطہ ٹوٹ گیا؟"

بڑی چچی چولی بنی ادھر ادھر منہ چھپا رہیں۔ بہانوں سے منہ پھیر پھیر کے آنکھیں پونچھتیں۔ اور ادھر شجو ماں پھرکی بنی سارا کام نمٹا رہی تھی — ہر احساس سے عاری۔ ابھی جہیز کے کمرے میں ساڑیاں لا رہی ہے جماتی تھی تو ابھی باورچی خانے میں کھانے والوں کی خبر لینے جا پہنچی۔ ابھی پھلواری سے سہرے پھول لے رہی ہے تو ابھی عوددان میں انگارے لئے روہو کے بال سکھانے لپک رہی ہے۔

شجو ماں کی نیند سے آنکھ کھلی تو کب کھلی، جب میراثن نے ڈھولک پر تھاپ دی۔

"ماروں بنے جلوہ دو منٹ یا دا
جلدی گھر کو جانے دو"

سلامی کی تھالی لئے وہ پھر چلی جا رہی تھی۔ ایک دم اس کے قدم ٹھٹھک گئے ساتھ کی ہی سہیلیاں سب دولہا میاں [illegible] میاں آ رہے [illegible] کو سالی پھر [illegible]

تھا اور اب تو گود بھی بھری پڑی تھی، ربو کو ٹھیل رہی تھی ۔
"اری شنتی ہے۔ جلوے میں اتنی بھی دیر نہ ہو۔ ادھر نیے میاں انتظار جو فرما رہے ہیں ۔ !"
ربو گٹھری تو تھی ہی، اور بھی سمٹ گئی ۔
"اری یہ سب چالیں ہیں۔" کوئی دوسری بولی۔ "ہم سب سمجھتے ہیں۔ دل میں تو لڈو پھوٹ رہے ہوں گے کہ کب جائے اور کب دولہے میاں کو اپنے ہاتھوں پان بنا کر کھلائے۔"
شبجو ماں کے قدم سو سو من کے ہو گئے ۔
"تجھے قسم ہے ربو جو دو گھنٹے خوشامد نہ کروائی ہو۔ ارے یہ رات ایک بار ہی تو آتی ہے۔"
چھن..... چھن..... چھن..... تھالی گر گئی، اور سلامی کے روپے، پورے کے پورے، مع چکنی، الائچی، لونگ کے برآمدے میں بکھر بکھر گئے ۔
پھر شبجو ماں کو معلوم نہ ہو سکا کہ کب ربو کی رخصتی ہوئی۔ واقعی تاروں کی چھاؤں میں ہوئی یا ابھرتے تاروں میں ہو کر وہ جلد ہی خوشامد کروانے چلی گئی۔ مگر جب شبجو ماں کو ہوش آیا تو اس کی آنکھوں تلے سیاہ گھیرے تھے۔ دل چلتے میں رہ رہ کے زور زور سے دھڑک اٹھتا۔ چکر آتے تھے۔ اور ادھر ربو تھی کہ شادی کو ڈیڑھ دو ماہ بھی نہ ہوئے تھے۔ جہالیاں بھی پوری نہ ہوئی تھیں، شرم بھی نہ ٹوٹی تھی ساس نندوں سے کہ گھونگھٹ کا پردہ اٹھا کر وہ ابکائیاں لینے اور قے کرنے لگی۔

ربو کے میاں شہر میں کوئی کاروبار کرتے تھے۔ ہفتے میں چار دن باہر گزارتے، چار دن گھر پر رہتے۔ داماد آتے تو شجو بی ان کا کمرہ سلیقے سے سجاتی۔ لاکھ صفائی، جھاڑ جھٹک کرتی مگر ربو صبح اٹھتی تو وہی مچھروں کا رونا لے کر۔ گال سہلاتی ہوئی زیرِ لب مسکراتی ہوئی۔

"اپی جان، غضب ہے اللہ کا! یہ مچھر کاہے سے ٹوٹ پڑے ہیں۔؟"

سلیمن ایک دن دیدے مٹکا کر بولی۔ "ہاں شجو بی بی، سچ مچ یہ مچھر تو بہ ہے! اتنا بڑا مچھر ہے، ایک دو نہیں پورے بتیس دانت ہیں اس کے منہ میں۔ اور کمبخت جب ڈنک لگاتے گا تو چہرہ پہ، گالوں پر، ہونٹوں پر۔ کیوں ہے نا ربو بی بی۔؟"

ربو بی بی مسکرا کر اور بنکر شرماتی ہوئی اسے مارنے کو لپکیں اور شجو ماں کی آنکھوں میں رات کی بھرپور رسیا ہیاں تیر تیر گئیں۔

"شجو ماں کو کب تک یوں ہی بٹھائے رکھو گی۔ ڈھیں کر ڈالو نا بہن۔"

"اللہ رکھے چھوٹی تو جیو جھلانے کو ہو رہی ہے۔ اور بڑی ابھی تک بیٹھی ہی ہے۔"

کہنے جانے والیاں جان بوجھ کر، جان جان کر، سوئیاں سی چبھوتیں اور بڑی بھی کا منہ نہ اٹھتا کہ ایک لفظ بھی زبان سے نکال سکیں۔

"سلیمن، توبہ ہے! واقعی شکر کیوں مچھروں ملوٹے میں۔!"

دیکھتی نہیں دیکو ا ایکا ایکی پیرا بکائی چلی آرہی ہے۔"

"اجی بی بی، میرا ایکائی بھیکا کھانے سے نہیں رکنے والی۔ ہماری بی بی کی اللہ رکھے گود ہری ہونے والی ہے۔" سلیمن ہاتھ چلا چلا کر بولنے لگی۔

شجو بان اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں حیرت لیے کبھی ربو کا منہ دیکھتی تو کبھی سلیمن کا۔ دوسرا قدم جو اس کا اٹھا تو وہ مشین پر جا بیٹھی۔ دبلے پتلے کانپتے ہاتھوں سے اس نے پھول دار گلابی ریشم اٹھایا اور چھوٹے چھوٹے کرنے قطع کرنے لگی۔

بڑھاپا

بلی اور وقت چلتے ہیں تو پاؤں کی آواز نہیں پیدا ہوتی، مگر چلتے دونوں ہی ہیں۔ وقت دبے پاؤں گزرتا چلا گیا، بالکل دبے پاؤں بلی کتنی ہی اونچائی سے گرے، پنجوں کے بل گرتی ہے۔ آواز نہیں پیدا ہوتی۔ وقت اور زمانے کے کوڑے بھی دل پر کیسے ہی برسیں آواز نہیں پیدا ہوتی۔ ہاں آنکھیں ضرور دھندلا جاتی ہیں اور بالوں پر راکھ جم جاتی ہے۔

باورچی خانے سے شجو بان نکلی تو سلیمن بولی۔

"بی بی، سر تو جھاڑ لیجیے، راکھ جم گئی ہے۔" شجو بان کا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ مگر یہ آخری تیر تھا چکے سے، یوں ہی شجو بان نے آئینہ تھا نہ کبھی زمانے اس کی آنکھوں کے آگے سے گزرتے چلے گئے۔

گزرتے جاتے اور بے نظر آنے والے قدموں کی سفید بستیوں
دھول چھوڑ گئے ہوا اور کوئی مناسب مقام نہ پا کر شجو ماں کے سر پر جم گئی۔
وقت گزرتا ہے تو اپنے ساتھ وہ ولولے اور ارمان بھی لے
جاتا ہے جن سے دل کی بستی آباد ہوتی ہے۔ مگر شجو ماں کا دل کیسا نگر
تھا کہ کبھی تو ویران نہ ہوا۔ آگے سے، پچھواڑے سے، جہاں موقع
ملتا وہ گھر کے پیچھے پر چڑھ جاتی اور گھگھیا گھگھیا کر ایک ایک
کوے سے مخاطب ہوتی۔

"کالا رے کاگا تیرے پیروں باندھوں سونے کا دھاگا
میرے سجن گھر کوئی مہمان ہو تو تو اُڑ جا"

مگر سونے کی پائل کا لالچ بھی انہیں نہ رجھاتا۔ مزے سے
بیٹھے کائیں کائیں کئے جاتے۔ کوئی تو ایسا نہ تھا جو اُڑ کر بالم کا سندیسہ
لاتا اور اس شہرِ ممنوع کے دروازے اس کے لئے کھل جاتے۔

"ہا — بیچاری۔" دادی بی کی شہزادی کو اب تک بھی
شہزادہ نہ ملا تھا۔ وہ اپنی مخصوص ادا سے اب بھی پان چباتے
ہوئے "ہائے — بیچاری شہزادی۔" کہہ کر پھر سے کہانی شروع
کر دیتیں۔

کبھی کبھی شجو ماں محسوس کرتی کہ اس کہانی کی شہزادی اور
کوئی نہیں، وہ خود ہے۔ جسے کبھی شہزادہ نہیں ملا۔ نہیں ملے گا۔
ملال میں ڈوب کے کبھی کبھی وہ چاہتی کہ اس کہانی کا انجام پوچھ لے۔
"دادی بی، آخر اس شہزادی کے لئے شہرِ ممنوع کے
دروازے کھلے؟" مگر زبان تک آ کر وہ آس بھی دھواں بن کے

اڑجاتی تھی جس کے سہارے وہ جی رہی تھی۔ شجو ماں کے منہ کا تالا کبھی نہ کھل سکا۔

"ہائے بیچاری شہزادی۔ دیکھتے ہی دیکھتے زمانہ گزرا، اور ایسا گزرا کہ شہزادی کے بالوں پر برف سی پڑ گئی۔"

شجو ماں نے گھبرا کر اپنا مرجھاتے پھول ایسا چہرہ پاندان میں لگے آئینے میں دیکھا۔

"دادی بی ــــ" وہ چلا اٹھی۔ "کوئی دوسری کہانی سناؤ۔ دوسری کہانی۔ دادی بی یہ کہانی تو برسوں سے ادھوری ہے۔ شہزادی کو شہزادہ نہیں ملے گا۔ کبھی نہیں ملے گا۔ مجھے معلوم ہے مجھے سب معلوم ہے دادی بی۔" اور وہ تکیہ میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

سہارا

بچپن میں شجو ماں نے بغدادی قاعدہ پڑھا تھا پھر اردو کی اور چار چھ کتابیں پڑھ ڈالیں۔ ماموں، چچا سے پہلے نورفت، رفتن کی گردان پڑھی، پھر شیخ سعدی کی "گلستان" "بوستان" بھی پڑھ ڈالیں۔ ماں نے منع بھی نہ کیا، کیونکہ معلوم تھا کہ ہونیوالے دولہے میاں بھی پڑھ رہے ہیں۔ دو سے شروع کیا اور بیس تک پہاڑے بھی رٹ ڈالے، مگر یہ کیا معلوم تھا کہ تختہ ہی الٹ جائیگا۔ اور پڑھا لکھا سب خاک میں مل جائے گا۔ اب گھر میں بیٹھے بیٹھے کوئی کام تو تھا نہیں، اسحاق چچا کی بیٹیوں کو الف بے کی تختی

یاد کروانی شروع کی۔ اسحاق چچا کی بیٹیوں کی ساتھ کھیلنے والیاں بھی تھیں، وہ بھی پاس آکر بیٹھنے لگیں بپھر ہونے ہوتے بیا بھا شجو ماں کی اچھی خاصی جماعت جڑ گئی۔ دس برس کے ادھر کے لڑکے بھی آنے لگے اور یوں ادھر ادھر کے ملا کے بیس پچیس بچے ہو گئے اور شجو ماں "باقاعدہ" "آپا جی" بن گئیں۔ بڑے پیار سے وہ ہر ایک کو بغیر گھر کے جھڑکے پڑھاتی۔ دل تو سدا کا پھوڑا تھا دکھتا ہوا۔ جس کا دل دکھا ہو گا وہ کسی کو کیا کچھ کہے گا۔!

سارے بچے ایسے ہل مل گئے گویا آپا جی سے برسوں کی جان پہچان ہو۔ پڑھانے کا وقت صبح دس بجے سے پانچ بجے تک تھا، مگر ادھر صبح ہوئی نہیں کہ اکدم دو دو تین تین بچوں کی ٹکڑیاں آنی شروع ہو جاتیں۔ اور سب آ آکے دیوان خانے میں بیٹھے جاتے۔ اور شام کو پانچ تو کیا سات آٹھ بھی بج جاتے تو بچے جانے کا نام نہ لیتے۔ اتنے دل جمعی سے پڑھنے لگے اور گھر والوں کو بھجوانے وقت اتنے ڈھیٹ بن جاتے کہ شجو ماں کو مجبوراً رات کو بھی پڑھانا پڑا۔ جس میں دادی بی کی کہانی بھی شامل ہوتی۔

اتنی مصروفیت میں بھی شجو ماں کو کوئی خیال ایسا بھی تھا کہ کبھی بھلائے نہ بھولتا۔ اور یوں، جیسے وہ بھی نماز روزے کی طرح زندگی کا ایک اہم فریضہ ہو۔ آپ ہی آپ وہ چپکے پڑھا کرتی۔ کیسی بھولی اللہ بھولے ہوئے پکارتی۔

"... لگا ہے کا کا تیرے پیروں پاندھوں سونے کا دھاگا۔"

کونے کھدروں میں چھپتے۔ "کائیں، کائیں، کائیں" — مگر وہیں بیٹھے
رہتے۔ بالم کا سندیسہ کبھی نہ آیا اور اب تو بیچو ماں کی آنکھیں بھی
روتے روتے دھندلا گئی تھیں۔ ایک طرف آنسو تھے، ایک
طرف انتظار۔ کس کا انتظار؟ یہ تو اسے خود بھی معلوم نہ تھا۔ بس
روئے جاتی اور پکارے جاتی۔

"تو تو اڑ جا — کاگا رے کاگا"

مگر کووں کو بیچو کی منڈیر ایسی بھائی تھی کہ اڑنا تو دور رہا
پر بھی نہ پھٹ پھٹاتے۔

"ہائے — بیچاری شہزادی! بری کرموں جلی تھی بیچاری۔
راجہ رانی کی تو کبھی بنی نہیں۔ ارے جس کے سر پہ باپ کا سایہ
ہو اسے کاہے کا ڈر؟ یہ پیڑ چھاؤں تو ایسی ہوتی ہے کہ ساری
بلائیں اپنے سر لے لے۔ مگر راجہ تو بس اپنی ہی جگ مست تھے۔ انہیں
کیا فکر! بیچاری باپ کے ہوتے بھی یتیم ہی تھی۔"

"وہ کیوں دادی بی؟" جماعت کی کوئی معصوم سی بچی
پوچھ بیٹھتی۔

دادی بھی گھورتیں۔ "پھر ٹوکا دیا نا مجھے۔ ارے راجہ کی
پسند کی رانی کہاں تھی۔ وہیں تبھی سے یہ کھوٹ چلی آتی تھی۔" پھر
دادی بی اس خیال سے بیگانہ کہ سامعین ننھے منے بچے ہیں بکے
چلی جاتیں۔

"اور کھوٹ بھی ایسی ویسی تھی! ارے اللہ سب رکھے دو
چار بچے ہی کیسے ہو گئے۔ سو ہو گئے، ورنہ اب تو یہ حال تھا کہ راجہ

جن اپنی ماں سے باقاعدہ ماں بیٹوں جیسا برتاؤ رکھتے۔ ہاتھ تک نہ لگاتے۔ ارے بازو تک نہ بیٹھتے، تو بچوں کچوں کا کیا سوال؟ مزید ثبوت کو وہ سب کی طرف گردن گھما گھما کر دیکھتیں اور بولتیں۔

"ارے پاس آکے بیٹھیں گے ہی نہیں تو بھرا اولاد کیسے پیدا ہو جاتی۔ ہاں تو پھر یہ دوری اتنی بڑھی، اتنی بڑھی کہ راجہ باہر کے ہو کر رہ گئے اور رانی اندر کی۔ اب ماں کو جتنا درد بیٹی کا تھا اتنا باپ کو کہاں تھا۔ وہ ماں گھلتی رہتی مگر فکر دور نہ ہوتی۔

"ہاں، تو پچھلی بار یہ کہاں تک کہی تھی کہانی۔؟

"ہاں، تو اللہ کا نام بڑا۔ اس کا کام بھی بڑا۔ ایک دن اللہ کا کرنا کیا ہوا کہ ایک مصیبت کا مارا کوئی شہزادہ، شہزادی کے محل تک آنکلا۔"

شجو بان ربو کی چوتھی بیٹی کے لئے اون کے موزے بن رہی تھی اکدم چونک پڑی۔ سلائیاں اور اون کا گولا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑا۔ اس کا منہ مارے حیرت کے کھلا رہ گیا تھا۔ کیا شہر ممنوع کے دروازے اس کے لئے، شہزادی کے لئے کھل سکتے ہیں؟

"تو دربان نے آکے اطلاع دی کہ کوئی شہزادہ مصیبت کا مارا آیا کھڑا ہے اور شہزادی کی خدمت میں باریابی چاہتا ہے۔ شہزادی نے اسے خاص اپنے حرم میں بلوا لیا۔"

"اور اس نے شہزادے سے پردہ نہیں کیا۔؟" عائشہ بول اٹھی جواب دسویں میں تھی اور اسے بار بار سینے پر دوپٹہ رکھنے کی تاکید اور گلی میں نکلنے کی ممانعت کی جاتی تھی۔

"اے تو بی بی اب شہزادی خود جو اتنی سمجھدار تھی، بھلا ایسے پردے چھروسے کی کیا ضرورت؟ ہاں تو سبھی شہزادی نے شہزادے کو بلا ہی لیا، مگر شہزادی کو یقین نہ ہوا کہ یہ شہزادہ ہو سکتا ہے۔ کیوں کہ اس کے بدن پر پھٹے پرانے کپڑے تھے اور سفر سے اس کی صورت بھی بری ہو گئی تھی۔ بال بھی بڑھ گئے تھے شہزادہ تو کیا ہاں صورت سے فقیر ہی ضرور لگتا تھا۔"

دادی بی نے خود ہی زور کا قہقہہ لگایا اور سب کی طرف دیکھا۔ بچے بھی ہنسنے لگے، مگر شجو ماں منہ کھولے کہانی کے آگے بڑھنے کا انتظار کرتی رہی۔

"اب تم جانو شہزادی سو عقل مندوں کی ایک عقل مند۔ اس نے سوچا۔ اونہوں، ایسے نہیں۔ اس کا امتحان لیا جائے کہ واقعی یہ شہزادہ ہے۔ بس تو شہزادی نے نوکروں کو حکم دیا کہ راتوں رات کپڑا خرید لائیں — ہر ہر قسم کا کپڑا — اور اس کے گدے تیار کریں۔ بس سبھی نوکر خریدی کے لئے دوڑے پورے شہر دل میں ستر رنگوں کا کپڑا ملا جھٹ پٹ اس کے گدے تیار کئے گئے۔ شہزادے کو نہلا دھلا کر کپڑے بدلوائے گئے اور پھر شہزادی نے بطور خاص یہ اہتمام کیا کہ اپنے ہاتھوں بستر لگوایا۔ معلوم ہے کیا بستر۔؟"

دادی بی کی کہانیوں میں دل پھر کے ناقابلِ یقین باتیں ہوتی تھیں، پھر بھی سب بڑے چاؤ سے سنتے۔

"ہاں تو بستر کیا تھا؟ معلوم ہے شہزادی نے ایک کے اوپر دوسرا، دوسرے پر تیسرا، تیسرے پر چوتھا — ایسے ستر گدے

[illegible] پلا کر سلوا دیئے اور ان کے نیچے چنے کا ایک دانہ رکھ کر [illegible]

"نیچے کا دانہ! وہ کیوں۔" وہ [illegible] حیرت سے بولا۔

"ارے آگے سنو نا۔ بیچ بیچ میں منہ [illegible]

تو بھئی شہزادی نے چنے کا دانہ ستر گدوں کے نیچے [illegible]

ہوئی، سب سو گئے۔ صبح ہوئی، شہزادہ [illegible]

کپڑے بدلے اور شہزادے کی خبر لینے اس کے کمرے میں جا پہنچی۔

پوچھا۔

"کیوں جی، آپ کی رات کیسی گزری۔"

"شہزادے نے سر جھکا کر جواب دیا۔ جی رات تو آپ کی بدولت

اچھی ہی گزری، مگر....، اور اتنا کہہ کر وہ رک گیا۔

"مگر کیا۔" شہزادی نے پوچھا۔

"مگر کوئی چیز رات بھر میری پیٹھ میں چبھتی رہی ہے اور میں

سمجھتا ہوں اس کی وجہ سے میری پیٹھ میں نیل بھی پڑ گیا ہوگا۔"

"شہزادی نے اس کی قمیض الٹ کر دیکھی تو واقعی پیٹھ پر نیلی

پھڑی تھی۔ تب شہزادی کو یقین آگیا کہ واقعی یہ سچا شہزادہ ہے

کیونکہ شہزادے اور شہزادیاں ہی اتنے نازک مزاج ہوسکتے ہیں

کہ ستر گدوں کے نیچے سے بھی ایک چنا ان کے نیل ڈال دے۔

"جب شہزادی کو پتہ چل گیا کہ یہ سچ مچ کا ہی شہزادہ ہے

اور اس نے جھوٹ موٹ نہیں کہا تھا تو شہزادی کے دل میں شہزادے

کی محبت پیدا ہوگئی۔ شہزادی خود اچھی عمر کی تھی اور شہزادہ بھی

نا [illegible] عمر کا تھا۔ تو نرجا [illegible] کا پورا گھٹنے [illegible] پانی نہیں

پھر ان چڑھتا ہے۔ ادھر شہزادی نے یہ چلن اختیار کیا تھا کہ چوڑیاں زیور اور رنگ برنگی کپڑے دوپٹے پہننا سب ترک کر دیا تھا۔ گویا بیوگی اختیار کی تھی۔ اب تو اس نے رنگ برنگی، جھکا جھول کپڑے پہنے۔ چھم چھاتی، کھن کھناتی چوڑیاں پہنیں۔ جھومر لگایا شہزادے نے بھی یہ سب کچھ دیکھا، اور اس وقت تو بڑا مزا آیا جب ....."

اسحاق میاں نے ٹوپی پلنگ کی پٹی پہ دھری، اچکن اتار کر کھونٹی سے ٹانگی اور بہت تیز لہجے میں بولے۔

"اجی بھابی جان سنتی ہو۔ اغیر کریں تو پھر غیر ہیں، یہ تو اپنے والے ہیں نا۔ کیا کیا اڑاتے پھر رہے ہیں۔ سالے کہتے ہیں....."

اکدم وہ رک سے گئے۔

"کیا کہتے ہیں۔ ؟" بڑی چچی نے ہولا کر پوچھا۔

دیوان خانے میں کرسی پر بیٹھی شبو ماں انہی کی طرف دیکھ رہی تھی، آواز نیچی کر کے بولے۔

"کہتے ہیں زبو سدا اپنے میکے رہتی ہے اور وہاں اس کے میاں کا بھی آنا جانا ہے۔" اور وہ معنی خیز انداز میں خاموش ہو گئے۔

"اور وہ تمہاری میری بہن۔" وہ پھر لعل اٹھے۔ "کمینی کدھر کی، کہتی تھی شبو ماں کی آنکھوں میں یہ حلقے کیسے پڑے ہیں۔ اور کھانا تو بیرانے نام کھاتی ہے۔"

"میاں!" بڑی چچی نے سہمی ہوئی آواز میں کہا، "اللہ ہی ان سے سمجھے تو سمجھے۔ مگر تم ہی کہو میری شبو ماں ایسی ویسی لڑکی ہے۔!"

دیوانی ہی رہی ہے؟" اس نے بھرے دل سے سوچا۔ پھر پچھواڑے کے آنگن میں جا کر اس نے پتھر سے کاسنی کاسنی چوڑیاں کرچی کرچی کر ڈالیں۔ بالوں میں گلابی موباف تھی، اسے پھاڑ پھینکا۔ پھر کمرے میں آ کر زعفرانی اوڑھنی اتار کر سفید کفنی جیسی موٹی ململ کی اوڑھنی اوڑھ لی۔

اتنا ہی ہوتا تو بس نہ تھا، مگر دوسرے دن سارا۔ کیا دھرا اپنی جگہ رہ گیا۔

نصیرالدین کا بھانجا نبرا، نکھٹو تھا۔ پڑھنے لکھنے میں نبرا۔ اسکول میں چھپن مرتبہ تو بٹھایا ہوگا، مگر اٹھ اٹھ کر بھاگ آتا۔ نصیر میاں یا جری کے بھتوں کی طرح اسے دنا دن ٹھوکتے۔ آٹھ چوروں کی مار اس اکیلے کو پڑتی، مگر وہ الف بے کی تختی سے آگے نہ بڑھ سکا۔ نو برس کا ہو رہا تھا۔ نویں برس تو بچے چوتھی پانچویں بھی پاس کر لیتے ہیں۔ شجو ماں کی میٹھی زبان کی ہر جگہ تعریف ہو رہی تھی۔ کہ وہ دو کلاسیں ہو رہی ہیں۔ ماں نے بھائی سے کہا۔

"بٹھا دو گے شاہجہان بیگم کی جماعت میں۔ لگ جائیگا راستہ پہ"

نصیر میاں کے دل کو بھی بھاگئی۔ ستھرے صاف کپڑے پہنا کے بغل میں بستہ دبا کے شجو ماں کے گھر آئے۔ یہ دیوان خانے میں اپنی فوج کو پڑھاتی بیٹھی تھی۔ دروازے پر دستک دی۔ شجو ماں نے ایک منٹ سب بچوں کو ہاتھ بتا کر خاموش کیا اور دستک دینے والے کو کہا۔

"اندر آ جاؤ۔"

[illegible] میاں اور پیچھے پیچھے ماموں نصیر میاں۔

کہ ہم شجو ماں سٹ پٹا کر کھڑی ہو گئی۔ الف بے کا قاعدہ ہاتھ سے گر گیا اور نگاہیں جھکی کی جھکی رہ گئیں۔ سفید آنچل سر پہ لرز رہا تھا اور وہ سہمی سہمی سی کرسی کا ہتھا تھامے کھڑی تھی۔

"یہ ...... بب ..... ب ...... بچے پڑھتا ہی نہیں ...... ب ......
بالکل ..... وہ ہے۔" نصیر میاں کی زبان تالو سے ٹکرا ٹکرا کر رہی تھی۔
"ہم ...... م ...... میں پڑھا لوں گی۔ یہاں تو سبھی ڈھیٹ کرتے ہیں۔" وہ گھبرا کر ہنس پڑی۔

نصیر میاں بھی مسکرا دیئے۔ "جی ہاں ــــ ذرا دھیان سے پڑھا دیجئے گا۔ آپ کی بہت تعریف سنی ہے۔" اور وہ سلام کر کے، جواب کا انتظار کئے بغیر باہر نکل گئے۔

"آپ کی بہت تعریف سنی ہے۔!"
"آپ کی بہت تعریف سنی ہے۔!!"
"آپ کی بہت تعریف سنی ہے۔!!!"
شجو ماں کے دل سے ایسی خوشی پھوٹی کہ وہ پاگل ہوتے ہوتے بچی۔

"ہاں بچو، تم نے بھی میری تعریف سنی ہے؟"
"ہاں آپا جی ــــ آپ بہت ــــ بہوت اچھی ہیں۔" سب آگے پیچھے بول اٹھے۔

یہ نصیر میاں جو تھے، اب تو جیسے کچھ بھی تھے، تھے، مگر جوانی میں ان کا بڑا زور تھا۔ جانے کون سی عینک آنکھوں پر چڑھائے بیٹھے تھے کہ کوئی صورت ٹھیک نہ جچتی۔ یہی وجہ تھی کہ پچیس کے

اوپر پہنچے تو آئے مگر اب تک بھی آدم سے کسی گم نام حوا کو کھوجتے ہیں۔
شاید یوں ہی بھلی بری صورتیں تو آنکھوں سے گزری ہوں گی، مگر دل پہ
کوئی نہ چڑھی۔ بڑی چچی کے قریبی سگوں میں آتے تھے۔

بہت پڑھے لکھے تھے۔ ان کی بیٹھک میں ایسی بڑی بڑی آڑی
چوڑی کتابیں تھیں کہ ضرورت پڑنے پہ چاہو تو تکیہ بنا کر لے لو۔ کہتے
والے سید صاحب کے بیٹے تھے۔ قریبی عزیز داری تھی مگر آنا جانا
سب موقوف تھا۔ بات کچھ بھی تو نہ تھی۔ نصیر میاں کے باپ علی گڑھ
جا کر پڑھ آئے تھے۔ اس زمانے میں علی گڑھ جانا لندن جانے سے کم
نہ تھا۔ اور پھر یہ یوں ہی کورے تو نہ چلے آئے تھے۔ ایم۔ اے، ایل
ایل۔ بی کی لانبی چوڑی ڈگری ساتھ لائے تھے، اور ایک فوٹو بھی تھا۔
کالا کالا جبہ سا پہنے، سر پہ ترچھی ٹوپی لگائے پورے خاندان والوں
میں وہ فوٹو گھومتا پھرا۔ اور کئی لوگوں نے تو کچھ آس بھی باندھ لی،
مگر بیچ میں یہ کتے آن پڑے۔ علی گڑھ سے آتے آتے انور میاں اپنے
ساتھ ایک ولایتی کتا اور کتیا لے آئے تھے، جو ان کے کسی انگریز
دوست نے بطور تحفہ دیئے تھے۔ یہ بڑے بڑے جھبرے کتے کہ
دور سے دیکھو تو شیر سے نظر آتے۔ اس زمانے میں پورے خاندان
پہ دادا حضرت کی حکومت تھی۔ نماز روزے کے وہ بڑے پابند تھے۔
دو دو حج کئے وہ الگ۔ مہینے کے چار پانچ روزے تو کہیں نہیں گئے
تھے۔ ہر جمعہ کو روزہ ہوتا۔ جب انہوں نے دیکھا کہ میاں انور اپنے
ساتھ کتے بھی اٹھا لائے ہیں تو پہلے پہل رولا سے سمجھایا کہ دیکھو میاں
جس گھر میں کتے ہوں رحمت کے فرشتے نہیں آتے۔ فضول نہ پالو

بولتے ۔ "کھانے کے بعد کم بخت کسی کام کا نہیں رہ جاتا ہیں ۔ بڑی نیند آ جاتی ہے آنکھوں میں ۔"

انہی کی اولاد یہ نمبر میاں تھے ۔ جیسا بیج ویسا پودا ۔ ان کے دماغ میں بھی ڈھیر سارا علم بھرا پڑا تھا ۔ عمر کہاں کی کہاں پہنچ رہی تھی ۔ مگر اب تک کنوارے سانڈ بنے پھر رہے تھے ۔

باپ چڑ چڑاتے ۔

"ارے کم بخت تجھے تیرے علم نے یہی سکھایا ہے کہ سونگھ سونگھ کر چھوڑ دے ۔"

ہنس کر رہ جاتے ۔ باپ تو اس عمر میں چھ چھ بچوں کے باپ بھی ہو گئے تھے ، یہ ابھی تک پتنگیں اڑاتے پھرتے تھے ۔ کہتے تھے ۔

"جب تک کنوارے ہو ، بچے ہو ۔ شادی ہوئی کہ بڑھاپے نے آگھیرا ۔" اپنے بھائے اب تک بھی بچے ہی بنے پھر رہے تھے ۔

شام کو چار بجے رؤف میاں گھر لوٹنے لگے تو شجو ماں نے کہلوا بھیجا ۔

"اپنے ماموں میاں کو سلام کہہ دینا ہمارا ۔" رؤف میاں نے گردن اٹھا کر اسے دیکھا اور سر ہلا دیا ۔

یہ سلام کلام یہاں تک بڑھے کہ اب شجو ماں جان جان کر پہاڑے بھول نے لگیں ، حساب غلط کر کر جاتیں تو پھر نمبر میاں ہی ایسے ہوتے جو غلطیاں نکالتے ۔

"واہ بھئی واہ ۔ یہ کوئی حساب ہوا ۔ سولہ دونی بتیس ہوتے ہیں ۔ آپ چھتیس بتا رہی ہیں ۔" یہ جھینپ کر رہ جاتی ۔ مسکرا اٹھیں

پڑے راشن اٹھ گیا تھا۔ چپکوں کے مسکراتی، تھپتھپاتی۔ مگر حیرت
کی بات یہ تھی، شمن سوچتی، کہ ہزار منتوں سے پیار لینے کے باوجود
اکیلی بھی کوا تو ذرا اڑا سکتا۔

اور پھر بڑی ان ہونی سی بات یہ بھی ہوئی کہ شمن نے بقرعید
پر اپنی پسند سے ہری بانکیں چنیں، ان کے آگے پیچھے سرخ رنگ کے
گوٹ چڑھوائے، اور پیسے ادا کر کے منہارن کو جب سلام کیا تو اس
نے بھی دل بھر کے دعائیں دیں۔

”اللہ سہرے کے پھول کھلائے، دلہن بنائے۔ جی کے ارمان
نکالیں۔ ہمارا بھی بھلا ہوئے۔“ اور شمن جو کسی کے بھی منہ سے یہ
دعائیں سن کر سفید پڑ جاتی تھی، شرم سے تپ کر دودھ میں ابلی
گاجر کی طرح کی لال لال ہو گئی۔

اور بڑی بات یہ کہ شمن، جو پورے خاندان میں گھر گھنی مشہور
تھی ٹھیل ٹھیل کر ماں سے کہتی۔

”اماں، آخر انور چچا نے کتنے پال لئے تو کیا گناہ کر ڈالا تھا۔
مذہب تو نہیں بدل لیا تھا نا۔ ؟ اب کرنے والے تو مر کھپ کے مٹی
میں مل گئے۔ فضول آپس کی برائی سے کیا فائدہ ؟ آپ ان کے گھر آتیں
جاتیں کیوں نہیں ۔؟“

نیر میاں جو بھانجے کی خبر لینے آتے تو گھنٹوں خبر ہی لیتے رہتے۔
کبھی کھانا۔ کبھی چائے اور کبھی یہ نہیں تو خالی پان ہی سہی۔ شمن
جو سارہ سی دنیا سے منہ موڑے راہبہ بنی بیٹھی تھی، پھر آدم حوا کی ہنستی
چہکتی دنیا کو پلٹ رہی تھی۔

اور اب تو ایسا بھی ہوا کہ نعیمر میاں کو کھانے پر روک لیا اور خود ہی کوئی میٹھا بنانے لپک پڑی۔

بات چیت کا موضوع بدلتے بدلتے اس پر بھی آگیا۔

"آپ نے شادی کیوں نہیں کی۔؟"

"پسند کی کوئی لڑکی ہی نہ ملی۔ اور جب لڑکی مل گئی تو اپنی عمر ڈھل گئی۔ مگر کوشش کریں گے کہ تقدیر بدل جائے۔" نعیمر میاں مسکرا کر بولے۔ "آپ بھی دعا کیجئے۔"

صاف اشارہ تھا۔ اس سے زیادہ اور کوئی کیا کہہ سکتا ہے؟ شجومان شرما گئی۔ منہ تپ گیا۔ آنکھیں اٹھا کر بولی۔

آپ کوشش کیجئے۔ میں دعا کروں گی آپ کے لئے۔"

پورے خاندان میں اڑ گئی کہ رزاق میاں والوں اور کٹے والے سید صاحب کی آپس میں میل ملاقات ہو گئی۔ اور جو ذرا سنسنی خیز خبریں سننے اور سنانے کے دلدادہ تھے انہوں نے یہ بھی اڑا دیا کہ نعیمر میاں گھنٹوں رزاق میاں کی جوان بیٹی، جوان بیاہی ہے، کے ہاں جا جا کر بیٹھتے ہیں۔ اب آگے اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ سنا ہے کچھ بات بھی ہونیوالی ہے۔

کاھے بات بھی ہونیوالی تھی، مگر تھی تو کنواری ہی شجومان نے اونچ نیچ سمجھانے کے لئے الفاظ ڈھونڈے بھی، مگر ملے نہیں۔ شجومان ایسی ویسی عمر اور حال کی تو تھی نہیں کہ سمجھانے بجھانے کی ضرورت پڑتی۔ پولتیں بھی کیا۔ پھر بھی دبی زبان سے کبھی کبھار کہہ دیا کرتیں۔

"زمانے والوں کے منہ کھلے ہیں بیٹی۔ ہماری پھوپھی بی بیاہی بھری، دو بچوں کی ماں، صاف لگا ہی دیا لگانے والوں نے کرانو میاں سے پھنستی ہیں۔ انو میاں ان کے رشتوں کے بھائی آتے تھے۔"

شجو ماں نے سنا ضرور، مگر یہ نہ سمجھا کہ یہ صاف ان پر ہی چوٹ ہے۔

نصیر میاں کبھی مسکرا مسکرا کر بات کرتے تعلیم یافتہ تھے۔ ڈگری یافتہ تھے۔ ہزاروں میں اٹھنا بیٹھنا تھا۔ بات کرنے میں منہ سے پھول جھڑتے تھے۔ دل کے کھوٹے نہ تھے بیچارے، ورنہ ہزار بار توکفر توڑ تنہائیاں میسر آئیں۔ کوئی جیسے ہوتے تو کچھ تو نیت میں فتور آتا، مگر انہوں نے توکبھی کو ہاتھ تک نہ لگایا۔ پان کبھی یہ بنا کر دیتیں تو کہتے۔

"وہاں میز پر رکھ دیجیئے، ابھی حساب میں الجھا ہوا ہوں۔"

نصیر میاں کی قدر و قیمت انہی باتوں سے شجو ماں کے دل میں دگنی ہو گئی تھی۔

شجو ماں کی دھندلائی آنکھیں، جو نیند سے بیگانہ تھیں، اب سپنے دیکھتیں۔ ایک پھٹے پرانے کپڑوں والا شہزادہ ان کے دروازے پر دستک دے رہا ہے۔ یہ دروازہ کھولتی ہیں۔ وہ چپ چاپ کھڑا مسکراتا ہے۔ پھر یہ مسکراہٹ اتنی پھیل جاتی کہ خواب ٹوٹ جاتا پھر نظر آتا کہ چھجے پر کھڑی کووں کے پیروں میں سونے کی پائلیں باندھ رہی ہے اور ہزاروں کوے اپنے کالے کالے پر پھڑپھڑاتے

سائیں سائیں کرتے اڑے چلے جارہے ہیں۔ پروں کی پھٹ پھٹ اتنی تیز ہوتی کہ شجو ماں کی آنکھ کھل جاتی۔

شہر ممنوع

دادی بی نے ادھر کئی دنوں سے کہانی نہیں سنائی تھی۔ آج وہ پھر پاندان گود میں لئے کہانی سنا رہی تھیں۔

"ہائے بیچاری شہزادی۔ تھی نا نصیبوں کی پوری۔ شہزادے کو ہر طرح ناز و نعمت سے رکھا، کھلایا پلایا، اس کی محبت اپنے دل میں پالی، اور آخر کو وہ دغا دے گیا پیارو، پیٹھا کبوتر کی طرح پھر سے اڑ گیا یہ کہہ کر کہ۔

"چین دیش کی شہزادی نے مجھ سے کہا تھا کہ جب تیرے لوہے کے جوتے گھس جائیں گے تب شادی کرلوں گی، اب اس کے جوتے سفر میں گھس گئے تھے۔ چلو شہزادہ چین دیش کو چلا گیا اور کہانی ختم۔!"

آج اسحاق چچا کلائمیکس میں گڑبڑ پیدا کرنے عین موقع پر نہ ٹپکے۔ بڑے آرام سے آئے، ٹوپی پلنگ کی پٹی پر دھری، اچکن اتار کے کھونٹی سے ٹانگی اور بولے۔

"گیا زوردار شادی کی بھئی۔ دلہن والوں نے مسہری کے ڈنڈے سونے کے دیئے اور سونے کے پازیب کے علاوہ پاندان بھی سونے کا دیا۔"

"کس کی شادی کا ذکر ہے میاں۔؟" بڑی چچی جھپکیاں لیتی

پڑی تھیں، کروٹ بدل کر بولیں۔
"ارے آپ کو نہیں معلوم! نصیر میاں کی شادی سے تو آرہا ہوں۔"
"ہائیں۔!" بڑی چچی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھیں "نصیر میاں کی شادی؟ ہمیں نور قعہ بھی نہیں آئے مگر....."
اسحاق میاں نے بہن کی زور دار گالی دی۔ "وہ کہتے کہ بچے حمید میاں کے ہاتھوں میں انتظام تھا نا۔ وہ تو ہم سے کاٹنے کھاتا ہے۔ مجھے تو جلیل میاں راستے سے پکڑ لے گئے۔"
"کس کی بیٹی کی۔؟" بڑی چچی نے ڈوبتے لہجہ میں پوچھا۔
"غیر کفو کی ہے۔ نواب جانی کی پوتی ہے نا۔ اتنے دنوں سے یہی تو جھنجھٹ چل رہی تھی۔ بڑی کوشش سے ہوا یہ پیام!"
"ہاں، تو بھئی وہ کہانی ختم ہوئی۔ اب یہ دوسری سنو۔ ایک تھا......"
"دادی بی۔!" آنسو بھری آنکھیں لئے، دونوں ہاتھوں سے اپنا دل پکڑے شجو ماں پوری طاقت سے چلا اٹھی، "آپ یہ کہانیاں مت کہا کیجئے۔ آپ اپنا وقت الگ برباد کرتی ہیں اور دوسروں کی زندگیاں بھی تباہ کرتی ہیں۔"
شجو ماں اتنی زور سے چلائی تھی کہ بچوں نے سہم کر اپنے چہرے قاعدوں کی آڑ میں کرلئے۔
"اوئی ــــ میں نے کس کی زندگی تباہ کی۔؟ کہانی جیسی کہانی تھی، شادی۔ اے لو اور سنو۔" اور وہ منہ میں پان دبا کر کٹ

کٹ چھالیہ کاٹنے لگیں۔

اک دم شجو ماں کے سارے بال سفید پڑ گئے۔ چوڑیاں آپ ہی ٹوٹ ٹوٹ کر گر گئیں۔ آنکھیں دھندلا گئیں اور گالوں پہ جھریاں پڑ گئیں۔ اور پھر کانپتے ہاتھوں سے شجو ماں نے بغدادی قاعدہ اٹھایا اور بھرائی ہوئی آواز سے پڑھانے لگی۔

"پڑھو میرے بچو۔!

الف سے انار۔

بے سے بکری۔

تے سے تلوار۔

گلستان سے قبرستان تک

اور اسی رات منو چچا شہر روانہ ہو گئے۔

سوچ رہی ہوں اس کہانی کو کس طرح شروع کروں؟ اگر یہ
کہانی کسی راجہ یا رانی سے متعلق ہوتی تو بلا شبہ میں وہی روایتی اندازِ
بیان اختیار کرتی۔
"ایک تھا راجہ، اس کی تھی ایک رانی۔"
مگر بڑی بات تو یہی ہے کہ یہ راجہ رانی کی کہانی نہیں ہے۔ یہ
میری کہانی ہے۔ یہ میری دادی اماں کی کہانی ہے جو رانی نہیں تھیں۔
عام انسانوں جیسی انسان تھیں۔ جن کے دل میں مامتا تھی، پیار تھا۔
اپنے گھر سے، اپنی زندگی سے، اپنے بچوں سے، اس گھر سے جو کسی زمانے
میں کسی طرح ایک محل سے کم نہ رہا ہو مگر آج ایک کھنڈر ہے۔ یہ کہانی
اسی کھنڈر سے متعلق ہے اور یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں اپنے
امتحان سے فارغ ہو کر گاؤں لوٹی تھی۔
گاڑی "گلستان" میں داخل ہو رہی تھی۔ میں نے یونہی نظر اٹھا
کر بڑے سے پھاٹک کی طرف دیکھا اور میں کانپ کر رہ گئی۔ ہمارا یہ

پرانا مکان، جس میں نہ جانے ہماری کتنی پشتیں زندگی بسر کر چکی تھیں۔ اب اس کی یہ حالت ہو رہی تھی کہ کلس اور مینارے جھڑنے لگے تھے۔ سفیدی جگہ جگہ سے کھرچ گئی تھی اور در و دیوار پر عجیب سی ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ گاڑی بان نے زور سے تیجی چلائی اور بیل دھڑ دھڑ کرتے پھاٹک سے گزر کر "گلستان" میں داخل ہو گئے۔ ٹپ ٹپ دو آنسو میری آنکھوں سے گر پڑے اور میں بوجھل دل لے کر گاڑی سے کود پڑی۔

دادی اماں اپنا پاندان کھولے بیٹھی تھیں۔ سامنے صافی پر ہرے ہرے پان بچھے ہوئے تھے اور وہ بڑے اطمینان سے کتھا چونا تھوپ رہی تھیں۔ سب سے پہلے میری توجہ جس چیز نے کھینچی وہ چاندی کے اس بڑے سے پاندان کی کلھیاں تھیں جن میں برائے نام چھالیہ کی دو تین ڈلیاں اور دس بارہ لونگیں پڑی تھیں۔ ابھی آنکھوں کی نمی خشک بھی نہ ہونے پائی تھی کہ میری آنکھیں پھر سے نم ہو گئیں۔ میں نے دادی اماں کو سلام کیا۔ انہوں نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا اور پھر اٹھ کر زور سے لپٹا لیا۔ ایکدم میں نے محسوس کیا کہ دادی اماں بےحد دبلی ہو گئی ہیں۔ پہلے جب وہ یوں مجھے لپٹا لیا کرتی تھیں تو مجھے کچھ زیادتی کا احساس ان کے نرم اور دبیز بازوؤں سے ہوا کرتا تھا، مگر اس لمحے میں نے محسوس کیا کہ وہ بھرے بھرے بازو اب لکڑی سے زیادہ سخت ہیں۔

"دادی اماں یہ اتنے سارے پان کس لئے بنا رہی ہیں آپ۔؟" میں نے اپنی رقت چھپانے کے لئے بےمعنی سا سوال کر ڈالا۔

دادی اماں کی بوڑھی آنکھیں ایک لمحے کو چمکیں، پھر وہ دھیرے سے مسکرا کر بولیں۔ "سیٹھ صاحب آئے ہیں۔" ان کی مسکراہٹ میں درد گھلا ہوا تھا۔

"سیٹھ صاحب!" میرا ماتھا ٹھنکا اور دل دھڑک کر رہ گیا۔ "کیوں خیر تو ہے۔؟" میں گھبرا کر بولی۔

"مکان کا جھگڑا چل رہا ہے سارا۔" وہ بیزاری سے سروتہ چلاتے ہوئے بولیں۔ میری آنکھوں میں آنسو امنڈ آئے۔ دادی اماں کی کمزور انگلیوں میں اتنی بھی تو سکت نہ رہ گئی تھی کہ چھالیہ ہی کاٹ سکیں۔ میں نے ان کے ہاتھ سے سروتہ لے لیا۔

"لائیے دادی اماں، میں چھالیہ کاٹتی جاؤں اور آپ مجھے یہاں کی باتیں سنائیے۔ اتنے دنوں بعد لوٹی ہوں، میرا دل چاہ رہا ہے خوب سی باتیں سنوں اور سناؤں۔"

"گلستان رہن رکھ دیا گیا ہے۔" دادی اماں نے ابھی جملہ پورا بھی نہ کیا ہوگا کہ سروتہ میرے ہاتھ سے چھوٹ گرا۔

"گلستان رہن رکھ دیا گیا ہے! مگر یہ ہوا کیسے۔؟" میں چیخ اٹھی۔

"سب قسمت کی بات ہے بٹیا۔" اور دادی اماں سر جھکا کر گلوریاں موڑنے لگیں۔

بڑے چچا، منو چچا اور میں اس رات بڑی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ آدھی رات گئے جب میں اپنے بستر پر لیٹی تو نیند میری آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔ بازو والے کمرے میں دادی اماں سو رہی تھیں۔

اس کے بازو والے کمرے میں بڑے چچا، اور داہنے ہاتھ والے کمرے میں منو چچا سو رہے تھے۔ پھوپھی کے کمرے میں بتی جل رہی تھی، مگر تھوڑی دیر بعد وہ بھی بجھ گئی۔ سارا گھر سو رہا تھا اور میں پڑی جاگ رہی تھی۔ میں دھیرے سے اپنے پلنگ پر اٹھ بیٹھی۔ سفر کی تکان سے میں نڈھال تھی، اور یوں اصولاً مجھے اس وقت گہری نیند میں ہونا چاہیئے تھا، مگر گلستان کے ٹوٹے ہوئے کلس میری نگاہوں میں تھے۔ ہماری دوکانیں ہماری زمینیں، ہماری جائداد؟ یہ سب کدھر ملیا میٹ ہو گئیں۔؟ ان کی آمدنی کیا ہو گئی کہ اب یہ نوبت آگئی تھی کہ گھر شکستہ حالت میں پڑا تھا۔ مگر انہیں مرمت کے لئے پیسہ نہ جڑ رہا تھا۔؟ میری آنکھوں میں دھند سی چھانے لگی۔ شاید یہ آنسو ہی تھے۔!

میں نے سرہانے سے قندیل اٹھائی اور دبے پاؤں کمرے سے باہر نکل گئی۔ سب سے پہلے میں بڑے دالان میں گئی۔ رات کے اندھیرے میں بھاری بھرکم ستون بڑے بھیانک لگ رہے تھے۔ میں نے قندیل اوپر اٹھائی اور دیکھا۔ جگہ جگہ سے سفیدی جھڑ چکی ہے اور جھڑ رہی ہے۔ میں نے قندیل پھر نیچے کر لی۔

دیوان خانے کے دروازے پر میلا میلا سا پردہ لٹک رہا تھا۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر پردے کو آہستگی سے تھاما اور اپنے گالوں پر رگڑنے لگی۔ بڑی محویت کے عالم میں میں بہت دیر تک یونہی کھڑی رہی۔ پھر میں نے قندیل اٹھا کر دیکھا۔ پردے میں جگہ جگہ سوراخ ہو رہے تھے اور ایک جگہ بہت بڑا پیوند لگا ہوا تھا۔ میں نے دھیرے

سے پردہ چھوڑ دیا۔ گرد کا ہلکا سا بادل اٹھا اور میں نے منہ میں پلو ٹھونس لیا۔

ایک ہاتھ میں قندیل اٹھائے اور دوسرے ہاتھ سے اپنے پائنچے سنبھالتی ہوئی آگے بڑھی۔ اب سامنے والا کمرہ میری نظروں کی زد میں تھا۔ یہاں ہمیشہ سے ہمارے خاندان کی لڑکیاں مایوں بٹھائی جاتی رہی تھیں۔ یہاں ان کے مہندی لگائی جاتی مسی لگائی جاتی۔ یہاں ان کے سہاگ چڑھتا۔ آرسی مصحف ہوتا اور یہ کمرہ دلہنوں کے ساتھ ساتھ سراپا دلہن بنا رہتا۔ یہاں ریشمی پھولدار اطلس کے سرخ پردے لٹکے ہوتے۔ مالن روزانہ پھولوں کے گجرے اس کے دروازے پر لٹکا جاتی۔ خوشبوؤں اور پھولوں سے مہکا مہکا تا یہ کمرہ! میں نے قندیل اٹھائی۔ دیواریں میلی اور ان میں دراڑیں پڑی ہوئی تھیں۔ پردے سرے سے ندارد اور پھولوں کی خوشبو کی بجائے ایک بدبو کا بھبکا میری ناک میں گیا۔ میں نے قندیل اندر کی اور دوسرے ہی لمحے باہر کھینچ لی۔ دو آنسو میری آنکھوں میں امڈ آئے، جنہیں میں بڑی خوبصورتی سے پی گئی۔ اندر کتنا ملبہ پڑے رکھے تھے۔

پھر دھیرے دھیرے میں قندیل لئے تمام کمروں میں گھومتی رہی۔ میرے غرارے کے پائنچے آہستہ آہستہ یوں سرسرا رہے تھے گویا سسکیاں سی لے رہے ہوں۔ میں دھیرے دھیرے پچھواڑے کے حصے میں نکل آئی جہاں پھولوں کے درخت تھے، پھلوں کے درخت تھے اور نت نئے رنگ برنگے پھولوں کے پودے تھے۔ یہ

جھولے جھولتیں۔ پیا ملن کے گیت گاتیں۔ برہ کے راگ چھیڑتیں اور ہنستیں بولتیں مگر اب پتے سوکھ چلے تھے۔ صرف نیم کا درخت باقی رہا تھا جس کی ایک مضبوط سی ڈال سے ایک بوسیدہ سی رسی لٹک رہی تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اس کی مضبوطی دیکھنی چاہی تو وہ ایک جھٹکے سے میرے ہاتھوں میں آگئی۔ پھولوں کے پودے بے برگ و بار تھے۔ میں نے قندیل چبوترے پر رکھ دی اور خود وہیں بیٹھ گئی۔ اپریل، مئی کا صاف نیلا آسمان میرے پر تھا۔ غم ناک سی ٹھنڈی ہوا تھی۔ اِدھر اُدھر بکھرے ہوئے تارے اور اداس چاند سارا ماحول مجھے گلستان کی بے بسی پر ماتم کرتا نظر آیا۔ میں نے پتھر پر سر ٹکا دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

یہ گھر — یہ محل — یہ گلستاں — ہمارے اسلاف کا بنایا ہوا پرشکوہ مکان — جس میں جانے ہماری کتنی پشتیں گزر گئیں۔ اگر کبھی کوئی اینٹ بھی جھڑ گئی تو ہم نے اپنا خون پانی کر دیا۔ اب اس حالت میں پڑا ہے کہ رہن ہے اور اینٹیں جھڑتی ہیں تو چونا گارا بھی نصیب نہیں ہوتا۔ آج رہن پڑا ہے۔ کل نیلام اٹھے گا۔ اور ہماری عزت، برسوں کی محبت اور اس کے چپے چپے سے کیا ہوا بے لوث پیار مٹ جائیگا۔ اینٹ سے اینٹ بج جائے گی اور پھر کون جانے ہمارا کیا حشر ہو۔ ؟ اور دادی اماں جنہیں بڑے چچا، منو چچا، پھوپھی سے بھی شاید اتنی محبت نہ تھی جتنی اس گھر سے، اس محل سے، جو اب کھنڈر ہوتا جا رہا تھا۔ کیا دادی اماں کو اس کا احساس نہ تھا۔ یا پھر روزانہ دیکھتے دیکھتے وہ اس کی

زبوں حالی کی اتنی عادی ہو گئی تھیں کہ انہیں فرق ہی محسوس نہ ہوتا تھا۔ لگتا۔ تمام کو رہن رکھنے کی غرض وغایت جب مجھے معلوم ہوئی تو ایک لمحے کو میں بھونچکی ہی رہ گئی۔ مکان رہن رکھ کر مکان کی مرمت کو پیسہ حاصل کرنا! اتنی مضحکہ خیز بات تو میں نے کبھی نہ سنی تھی۔

"زمیندار کے قرضوں، لگانوں کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اماں گھر کی مرمت کروانا چاہتی تھیں، اور اسی لئے اسے رہن رکھ دینا پڑا۔" منو چچا کے منہ سے یہ الفاظ سن کر میں باوجود غصے کے بھی مسکرانے سے باز نہ رہ سکی۔ مگر میری مسکراہٹ میں نشتر چھپے ہوئے تھے۔ مگر یہ نشتر میرے ہی سینے میں پیوست ہو گئے۔ جب میں نے دیکھا کہ گلستان کیا سے کیا ہو گیا ہے۔ اتنی طویل مدت کے بعد آج میں گاؤں لوٹی، اور گلستاں کو دیکھا تو پاگل ہو اٹھی۔ بس، جیسے اس مکان سے اپنا کوئی خاص انس کبھی نہ تھا۔ مگر دادی اماں، جو ایک بچے کی طرح اس کے چپے چپے کی دیکھ ریکھ کرتی رہتی تھیں! دادی اماں کے سوکھے بازو، جھریوں بھرا اداس چہرہ اور نم نم سی آنکھیں میری آنکھوں میں گھوم گئیں۔ قندیل ایک لمحے کو زور سے بھڑکی، تھوڑی دیر بھڑکتی رہی اور بجھ کر رہ گئی۔ میرا دل کانپ گیا۔

پرانے وقتوں کی لے دے کے دو چار چیزیں ہی ایسی رہ گئی تھیں جنہیں دادی اماں متاعِ گم شدہ کی یادگار کے طور پر سینے سے لگائے ہوئے تھیں۔ چاندی کا بڑا سا پاندان۔ منو چچا کی ہونیوالی

دلہن کا جیڑا ڈگلو بند۔ ؟ پھوپھی کے دلہا کی انگوٹھی، جس میں سچا ہیرا جڑا ہوا تھا اور خود دادی اماں کے کانوں کی ہیرے کی لونگیں جو دادا ابا نے آج سے سالوں پہلے دادی اماں کا منہ دیکھ کر پہلی رات کو پہنائی تھیں۔ ان چیزوں کا بچ رہنا اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ دادی اماں کو انتہائی عزیز ہیں جنہیں وہ کسی صورت اپنے سے جدا نہیں کرنا چاہتیں۔

پھوپھی بیمار پڑیں، اور ایسی پڑیں کہ ان کے کنوارے اور معصوم سپنے سدا کے لئے بکھر کے رہ گئے۔ جانے وہ کب سے دق میں گھل رہی تھیں۔ بظاہر وہ ہنستیں، بولتیں، کھاتیں، مگر ان کے ہر انداز سے ایک بے نام سا غم ٹپکتا۔ کسی نے سمجھا، کسی نے نہ سمجھا۔ مگر میں سمجھ گئی کہ اس ماحول میں جو بھی ایسا احساس دل لے کر پیدا ہوگا وہ یقیناً دق میں مبتلا ہو جائے گا۔ ان کے دولہا کے لئے جو ہیرے کی انگشتری دادی اماں نے بطور سلامی دینے کے لئے رکھ چھوڑی تھی۔ وہ جوں کی توں رکھی تھی۔ بیماری کے علاج کے لئے کسی نے اس کو توڑنے کے بارے میں سوچا تک بھی نہ تھا۔ اور جب کنوارپنے کی ساری حسرتیں اور ارمان سمیٹے پھوپھی ہمارے خاندانی قبرستان میں جا سوئیں تب بھی کسی نے یہ نہ سوچا کہ انگوٹھی توڑ ہی لیتے تو علاج کر والے کی حسرت تو دل سے نکل جاتی! مگر ان کی موت کے چند ہی دنوں بعد میں نے دیکھا کہ دادی اماں نے وہ انگوٹھی نکالی اور سو میں بیچ آئیں۔ کلاما۔ مٹی، چونا سارے گھر میں بکھرا نظر آنے لگا۔ گلستان کی مرمت ہو رہی تھی۔

دادی اماں کی دیوانگی دیکھ دیکھ کر رونا تو بڑی بات ہے میں ہنس بھی نہ سکتی تھی۔ وہ اس گھر کے پیچھے خود کو لٹا نے پر تلی ہوئی تھیں۔ منو چچا نے بتایا تھا۔ "اماں نے گھر کی ہر چھوٹی بڑی چیز۔ ؛ زیور، برتن، سجاوٹی کپڑے وغیرہ تو ڑ ڈالے ہیں۔ ؛ بیچ ڈالے ہیں۔ ہر سال مرمت کرواتی ہیں مگر گھر پہلے سے بدتر ہوتا جا رہا ہے۔ وہ چاہتی ہیں ان کی آنکھوں کے سامنے یہ گھر نہ بگڑے۔ ؛ یہ اینٹیں نہ ٹوٹ ٹوٹ کر گریں۔ ؛ چونا نہ اکھڑے۔ ؛ مٹی نہ جھڑے۔ مگر بادل پھٹے تو کون پیوند لگا سکتا ہے۔ ؟" منو چچا نے مجھے یہ بھی بتایا کہ پہلے پہل جب اماں کو پتہ چلا کہ مکان رہن رکھ دیا گیا ہے تو بہت تڑپی تھیں مگر جب اس کی مرمت کے لئے ان کے ہاتھ میں نوٹوں کی گڈیاں تھما دی گئیں تو وہ یوں خوش ہو گئیں جیسے مکان رہن سے چھوٹ گیا ہو۔"

یہ تو میں بہر صورت جانتی تھی کہ اب مکان بنیلام رہیگا۔ مگر دادی اماں اسے اب تک پہلوٹھی کے بیٹے کی طرح چاہے جا رہی تھیں۔ مٹی، گارا اور چونا ختم ہو گیا اور مکان کی آدھی مرمت بھی نہ ہو سکی۔!

"دادی اماں گلس تو بالکل برباد ہو گئے ہیں۔" میں نے ادبدا کر اٹھوائی اور دادی اماں کو مخاطب کیا جو اس وقت نیم کے جھاڑ کو پانی دے رہی تھیں۔ دادی اماں روزانہ سارے سوکھے، بن سوکھے مرجھائے جھاڑوں پودوں کو بلا ناغہ پانی دیتیں۔ پھول مسکرانا بھول چکے تھے۔ پتیاں جھومنا بھول چکی تھیں۔ ڈالیاں کبھی اپنے وزن سے نہ لچکتیں۔ مگر دادی اماں اپنے فرض کو پوری پابندی

اور تندہی سے انجام دیتیں۔ پھر بھی جانے کیسی آگ ان کے رگ و پے میں سرایت کر گئی تھی کہ پھولوں پودوں پر بار نہ آتا۔

"کلس برباد ہو گئے۔!" وہ حیرانگی سے بولیں۔ "کہاں دیکھے تو نے؟" مجھے اک دم اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ دادی اماں پینوں کو بلندیوں تک لے جانے پر تلی ہوئی تھیں۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ بلندیاں آپ زمین سے ہمکنار ہونے جھکی چلی آ رہی ہیں۔ انہوں نے اپنی بوڑھی آنکھوں پر سوکھے ہاتھ کا پردہ تانا اور گردن اٹھا کر اوپر دیکھنے لگیں۔ کنگورے جھڑ رہے تھے، کچھ جھڑ چکے تھے۔ اور پیپل کے وہ چمکدار کلس، جو دھوپ میں سونے کے مانند چم چم چمکا کرتے تھے، مدھم پڑ چکے تھے اور دو تین جگہ سے ٹوٹ گئے تھے۔

دادی اماں نے تھیلا وہیں رکھ دیا اور کانپتی ہوئی اندر چلی گئیں۔ دوسرے دن منو چچا کی ہونے والی دلہن کا گلوبند ہاتھ میں لئے نظر آئیں تو میں باوجود کوشش کے اپنے کو سسک سسک کر رونے سے باز نہ رکھ سکی۔

میں نے طے کر لیا کہ اب پڑھنے نہیں جاؤں گی۔ بس بہت پڑھائی ہو چکی۔ وہ ررہ کر میں قطعاً نابلد تو نہ تھی کہ میرے اخراجات کس طرح پورے ہوتے ہیں، مگر اتنی گہرائی سے تو میں نے ہرگز ہرگز نہ سوچا تھا۔

بارشیں شروع ہو چکی تھیں اور گلستان کی ہر اینٹ، ہر پتھر رحم کی درخواست کرتا نظر آتا۔ میں دلہنوں والے کمرے میں تنہائی

تو مجھے وہاں پھوپھی نظر آتیں۔ ہاتھوں میں گجرے، پیروں میں پازیب، پتلی پتلی انگلیوں میں جگمگاتی انگوٹھیاں اور گلے میں وہی جڑاؤ گلوبند سرخ سرخ کپڑے پہنے، وہ جھینپتی جھینپاتی کیسی گڑیا سی لگتیں۔ اور پھر بادل گرجتے، بجلی چمکتی تو مجھے تصور حقیقت کی دنیا میں لا پٹکتا۔ چونا جھڑتا ہوا کمرہ، بوسیدہ دیواریں اور اطلس پردوں کی بجائے کھدر کا پیوند لگا پردہ۔ موتیا اور گلاب کے پھولوں کی خوشبو کے بدلے بدبو کے جھونکے آتے اور پردہ اٹھتا تو میں دیکھتی اندر کتیا اپنے درجن بھر بچوں کے ساتھ بیٹھی ہے۔

میں نے ان دنوں کھانا پینا چھوڑ رکھا تھا۔ زندگی کے بارے میں اتنے منفی پہلو سے میں نے پہلے کبھی نہ سوچا تھا۔

دادی اماں بیمار ہی تھیں، مگر بیماری نے زور پکڑا تو بستر سے لگ گئیں۔ چاندی کا پاندان، گلوبند اور انگوٹھی نواب گلستاں کی بھینٹ چڑھ چکے تھے۔ اب ان کی لوؤں میں ہیرے چمکا کرتے۔ وہ بار بار گرتی دیواروں اور بوسیدہ چھتوں کو دیکھتیں اور اپنے کانوں پہ ہاتھ رکھ لیتیں۔ کانوں پر اس طرح ہاتھ رکھنے کا مطلب میری سمجھ میں کبھی نہ آیا۔ کیا وہ دادا ابا کی پہلی اور آخری نشانی کو ہمیشہ کے لئے بچا رکھنا چاہتی تھیں۔؟ یا پھر وہ اس لئے کانوں پہ ہاتھ رکھ لیتی تھیں کہ اب سے کبھی گلستاں پر کچھ نہ خرچ کرینگی۔ میں ان کے سرہانے بیٹھی ان سے پرانے دور کی باتیں سنتی رہتی جب کہ گلستاں صحیح معنوں میں گلستاں تھا اور یہاں کی ہر چیز صحیح معنوں میں سرسبز۔

"دادی اماں۔ مکان تو رہن پڑا ہوا ہے، پھر آپ اس پر اتنا پیسہ کیوں خرچ کرتی ہیں۔؟" ایک دن میں نے بہت جھنجلا کر دادی اماں سے پوچھا۔

"رہن ہے تو کیا ہوا۔؟" دادی اماں یقین اور اعتماد سے بھرپور ہنسی ہنسیں۔" اری بیٹی آج رہن ہے، کل تو رہن نہیں رہے گا۔!"

میں کانپ اٹھی۔ دادی اماں اس منزل پر پہنچ کر بھی "کل" سے امیدیں وابستہ رکھتی ہیں۔ میرا دل چاہا کہہ دوں۔

"دادی اماں کل کے بھروسہ پر نہ رہیئے۔ آج تو ہم سر چھپائے بیٹھے ہیں، کل کو شاید یہ سہارا بھی نہ رہ جائے۔ گلستاں نیلام ہو جائے گا، پھر کیا ہوگا۔؟" گھر نیلام ہو جائے گا! اس کے آگے میں نہیں سوچ سکتی تھی ـــــ سوچنا بھی نہیں چاہتی تھی۔

"پھر بھی دادی اماں، اتنے پرانے مکان پر اتنا پیسہ اٹھانا ٹھیک نہیں کچھ۔" میں نے پرانی چھت کو گھورتے ہوئے کہا۔

اور دادی اماں تڑپ اٹھیں۔" ٹھیک نہیں تو کیا گھر کو گر جانے دوں۔؟ یہ عزت بنی ہوئی ہے اسی کے سہارے ہے۔ صدیوں کی بنی عزت یوں لٹ گئی تو۔؟" دادی اماں زور زور سے چلّا چلّا کر مجھے سنانے لگیں۔ بڑھاپے کی وجہ سے ان کے کان سن ہو گئے تھے۔ اور وہ بہری ہو گئی تھیں۔ ان کے کان کے پاس منہ لے جا کر بات کہنی پڑتی، تب وہ سنتیں اور جواباً زور زور سے بات کرتیں۔

"میں ذرا اچھی ہو جاؤں، پھر میں مونیا کے پودے لگواؤں گی۔

اور پھاٹک کے پاس جو آم کا پیڑ ہے اس میں کھاد ڈلوانی ہے۔ وہ تو ہم سکا پیڑ تو بالکل برباد ہوا جا رہا ہے۔ منو بیٹے سے میں نے کہا کبھی تھا باغبانی پر کوئی اچھی سی کتاب منگائے۔ تمہارے دادا کو کتنا شوق تھا نئے نئے پودے اور پھلواری کا۔ !"

بادل گرج رہے تھے۔ بجلیاں چمک رہی تھیں۔ میں گھٹنوں میں سر دیئے ساکت و صامت بیٹھی تھی اور دادی اماں باتیں کئے جا رہی تھیں۔" میں آم کے پیڑ میں کھاد ڈلواؤں گی۔ !" یہ کل پرا عتبار۔ !

اور ایک اداس سی شام کو جب سائے تلے میں تنہائی تو پہنچی تو میں نے محسوس کیا اگر میں نے کتاب بند نہیں کر دی اور اس اور بوجھل سائے سے اٹھ نہ جاؤں گی تو پھر کبھی دوبارہ سانس نہ لے سکوں گی۔ آسمان پر جو گھٹا میں چھائیں ان کا سایہ میں اپنی ان گھٹاؤں سے کرتی جو میری آنکھوں میں چھپی بیٹھی تھیں۔

دادی اماں خوابیدہ تھیں۔ گلستان کی دیواروں سے نمی تو ہر دم ہی چھوٹتی رہتی۔ ہر لمحے یہ محسوس ہوتا گویا یہ محل دھڑام سے زمین پر آ رہے گا۔ بارشیں بہت ہو چکی تھیں۔ بوسیدہ دیواروں میں پانی ٹھہر گیا تھا اور آدھی آدھی اونچائی تک دیواریں نم ہو گئی تھیں ہر لمحے اس بات کا خطرہ تھا کہ کوئی نہ کوئی دیوار دھم سے گر پڑے گی۔

ایک دن میں دادی اماں کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔ منو چچا اور بڑے چچا دیوان خانے میں بیٹھے سیٹھ صاحب سے باتیں کر رہے تھے۔ شیخ صاحب بلند آواز سے چیخ رہے تھے اور بار بار میں کانپ

اٹھتی تھی۔ بہن کی تاریخ قریب آ رہی تھی۔ سبشیہ صاحب جتانے کے لئے آتے تھے کہ نیلام اٹھ جائیگا۔ یہیں شرط رکھی گئی تھی اور نہ بھی رکھی جاتی تو انجام ہوتا بھی کیا۔؟

میں دم ساد سے بیٹھی تھی مگر دل کانپ رہا تھا۔ اس لمحے میں نے شکر ادا کیا کہ دادی اماں بہری ہیں۔ اگر وہ یہ سب کچھ سن لیتیں تو۔ ایک دم ادھر سے کسی چیز کے گرنے کی آواز آئی۔ جیسے بہت دور کوئی چیز گری ہو۔ میں نے ادھر اُدھر دیکھنا چاہا مگر کچھ سمجھ نہ سکی کہ کیا چیز گری ہو گی۔ مگر دوسرے ہی لمحے دادی اماں اپنا لبنہ چھوڑ کر اٹھ بیٹھیں۔ "کوئی دیوار گری ہے گلستان کی۔!" وہ اعتبار سے بولیں۔ "دیوار؟" میں حیرت سے بولی۔ دادی اماں بہری تھیں۔ بالکل بہری۔ یہ آواز انہوں نے کدھر سے سن لی۔؟ "آپ کو دھوکا ہوا ہے دادی اماں۔ یہاں تو کوئی بھی آواز سنائی نہ دی۔!"

دادی اماں نے اپنے سفید بالوں کو ہاتھوں سے سہلا کر کہا۔ "یہ بال عمر کے ساتھ ساتھ سفید ہوئے ہیں گڑیا بیٹی۔ میرے دل میں کوئی بیٹھا کہہ رہا ہے کہ کچھ ہوا ضرور ہے۔" اور وہ چپلی پہنتی باہر کو نکل گئیں۔ ان کے اس طرح اٹھ بھاگنے پر میں اتنی حیرت زدہ رہ گئی کہ انہوں سہارا بھی نہ دے سکی۔ ان دنوں دادی اماں کو سہارا دیکر اٹھانا پڑتا تھا اور وہ بغیر سہارے کے ایک قدم بھی نہ چل سکتی تھیں!! ان کے پیچھے میں بھاگی۔ پچھواڑے کے دالان کے قریب وہ جاکر رکیں اور دھم سے بیٹھ گئیں۔ سامنے اینٹوں اور مٹی کا ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ دالان کے سامنے والی دیوار گری تھی۔

دادی اماں کو اٹھا کر پلنگ پر لٹایا گیا تو میں یہ سمجھ رہی تھی کہ اب وہ کبھی نہ اٹھ سکیں گی۔ مگر دوسرے ہی دن میں نے دیکھا کہ وہ پلنگ پر بیٹھی رو رہی تھیں۔ ان کی بوڑھی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے، جنہیں وہ پونچھتیں تو اور زیادہ تیزی سے بہنا شروع ہو جاتے۔ رات ہو چکی تھی۔ آسمان پر چاروں طرف بدلیاں تیر رہی تھیں۔ انہوں نے گھٹاؤں کا روپ دھارن کر لیا اور بوندا باندی ہونے ہوتے زور سے بارش ہونے لگی۔ پھر دادی اماں نے اپنے کانوں پر ہاتھ پھیرے۔ اور دھیرے دھیرے کیلیں کھولنی شروع کیں۔

"وہ دیوار اٹھا دینی چاہیئے منو بٹیا۔ گھر کھنڈر نہ بن کر رہ جائے۔"

برسوں کا اٹوٹ بندھن ٹوٹنے کو جا رہا تھا۔ ان لونگوں میں جو ہیرے جھمک رہے تھے وہ صرف ہیرے ہی نہ تھے۔ اس جھمک میں ہیروں کی چمک بھی تھی اور محبت کی چمک بھی تھی۔ آرزوؤں، ارمانوں اور امیدوں کے اجالے اور چمک بھی تھی۔ یہ دولہا دلہن کا پیار تھا جو ہیروں کی شکل میں جھمک رہا تھا۔ یہ وہ بندھن تھا جسے موت بھی نہ توڑ سکی تھی۔ دادی اماں نے چوڑیاں توڑ دی تھیں۔ چوٹ بکھیر دی تھی۔ رنگین کپڑے اتار دیئے تھے۔ مگر لونگیں ان کے اپنے جسم کا ایک حصہ بن کر ان کے کانوں سے چمٹی رہیں۔ اور آج دادی اماں اس چمک کو اس پیار کو، اس محبت کو بیچ رہی تھیں جو ایک گھر سے کہیں زیادہ قیمتی ہوتی ہے۔ وہ کیلیں کھول رہی تھیں۔ ان کی انگلیاں کانپ رہی تھیں۔ ان کے آنسو بہہ رہے تھے۔ آسمان بھی رو رہا تھا۔ میں بھی رو رہی تھی۔ ہر ذرہ روتا نظر آ رہا تھا۔ یک دم منو چچا نے دادی

اماں کے ہاتھ پکڑ لیے۔

"اماں آپ یہ لونگیں نہیں اتاریں گی۔ کبھی نہیں، کبھی نہیں!"
سائیں سائیں ہوا ایسے چل رہی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا دادی
اماں کی بے بسی پر سسکیاں بھر رہی ہوں۔

"دیوار گر گئی ہے بیٹیا۔" دادی اماں بدقت بول پا رہی تھیں
"دیوار گرتی ہے تو ایک عظمت گر جاتی ہے۔ دیوار گرتی ہے تو عزت
بھی گر جاتی ہے۔ مٹی کے ساتھ ساتھ وہ پیار بھی گر جاتا ہے جو اس
مٹی کے ذرے ذرے میں رچا ہوتا ہے۔ مگر لونگیں اترتی ہیں تو محل
کی دیوار تو کھڑی ہو جاتی ہے۔ عزت بن جاتی ہے۔ پیار کا سر اونچا
ہو جاتا ہے۔ یہ لونگیں تو...." اور وہ پھپھک پڑیں۔

"اماں۔!" منو چچا کو میں نے آج تک روتے نہ دیکھا تھا۔
"ان لونگوں میں بھی پیار رچا ہوا ہے اور ان مٹی کے ذروں
میں بھی پیار رچا ہوا ہے اور ان مٹی کے ذروں میں بھی
تو کون سا پیار زیادہ قیمتی ہے۔؟"

"اماں۔!" منو چچا اٹھ کھڑے ہوئے۔ "میں شہر جاؤں گا
اماں! وہاں نوکری کروں گا اور بہت سارا پیسہ جمع کر کے لوٹوں گا۔
پھر گلستان بھی چھوٹ جائے گا اور آپ اس کی مرمت بھی کروا سکیں
گی۔ میں وعدہ کرتا ہوں، اماں میں ضرور آؤں گا۔"

"تو شہر جائے گا۔؟ نوکری کرنے؟ نہیں بیٹیا، یہ ہمیں زیبا
نہیں۔ ہمارے خاندان میں آج تک کسی نے نوکری نہیں کی۔"

"اماں یہ سب پرانی باتیں ہیں۔ یہ قدریں پرانی ہو چکی ہیں۔

آپ یقین کیجیے میں ضرور آؤں گا۔ مگر اماں آپ یہ لونگیں نہ اتاریئے نوکری کرنا بری بات نہیں ہے۔ میں آؤں گا میری اماں، اور پیسہ لے کر آؤں گا۔ میں ضرور لوٹوں گا اماں۔ کبھی نہ کبھی ضرور واپس آؤں گا۔ اتنا آپ یقین رکھیئے۔" اور اسی رات منو چچا شہر روانہ ہو گئے۔

اب تک گلستاں کی صرف ایک ہی دیوار گری تھی۔
دادی اماں اب تک فریش تھیں۔ اب تو وہ چلنا پھرنا بھی بھول چکی تھیں۔ گھر میں اکثر فاقے ہوتے۔ کبھی کھانا پکتا۔ کبھی نہ پکتا۔ جو کچھ پکتا وہ دال پر مشتمل ہوتا۔ دادی اماں کبھی رات کو بھوکا نہ سونے دیتیں۔ ہر رات دال ہی پکتی، مگر ضرور پکتی۔ دادی اماں، ہر رات دو روٹیاں اور ایک کٹورہ دال اپنے سرہانے والے محراب میں رکھوا لیتیں۔
" میرا منو بٹیا آئے گا۔ کون جانے وہ بھوکا ہی لوٹے! وہ پہلے تو مجھی سے ملنے آئے گا۔ میں اسے سب سے پہلے کھانا کھلاؤں گی۔ پھر بات چیت ہو گی۔" اور روزانہ صبح سویرے میں وہ کھانا کسی فقیر کو دے آتی، جو اکثر گلستاں کے پھاٹک کے سامنے بیٹھے ہوتے۔
منو چچا کے زندگی سے بھرپور خط آتے۔ بڑی بڑی امیدیں بڑے بڑے دلاسے اور ڈھارسیں۔ مگر کسی خط میں تو ایسا لکھا نہ آیا کہ " مجھے نوکری مل گئی ہے۔" یا یہ کہ " میں خوب پیسہ کما رہا ہوں اور جلد ہی لوٹوں گا۔" دادی اماں ان دنوں بڑے سنہرے رو پہلے خواب

دیکھتیں۔ ہر دوسرے تیسرے وہ مجھے بٹھا کر سناتیں۔

"بیٹی میں نے دیکھا منو راجہ اچھے اچھے کپڑے پہن کر موٹر پہ بیٹھ کر گھر آیا ہے۔ موٹر اس کی اپنی ہے۔"

"خواب کی تعبیر سدا الٹی ہوا کرتی ہے۔ تجھے معلوم ہے یہ بات؟"

ایک دن بڑے چچا نے دادی اماں کا خواب سن کر مجھ سے فکر مند لہجہ میں پوچھا۔" اور تجھے شاید یہ بات معلوم نہ ہو کہ پچھلے پہر کے خواب سدا الٹی تعبیر دیتے ہیں۔"

دادی اماں کی صحت گرتی چلی گئی۔

دو روٹیاں اور دال کا کٹورا روزانہ کوئی فقیر لے جاتا رہا۔ منو چچا کے خط اکدم بند ہو گئے۔ دادی اماں ہر آہٹ پہ چونک اٹھتیں۔ "دیکھو تو سہی منو تو نہیں آیا میرا۔" ان دنوں ان کا بہرا پن بالکل دور ہو گیا تھا۔ سرگوشیاں تک سن لیتیں۔ ہم بات کرتے ڈرنے لگے تھے۔

اور ایک دن پھر دادی اماں خواب سنا رہی تھیں۔ "بیٹی اس کے جسم پر چمکیلے کپڑے تھے۔ جوتا اتنا چمکدار کہ اس میں صورت دیکھ لو۔ اس کی کلائی پہ سونے کی گھڑی بندھی تھی۔ وہ اپنی ذاتی موٹر میں بیٹھ کر آیا تھا۔ اور اس کی جیبوں میں نوٹ بھرے ہوئے تھے۔"

"دادی اماں آپ نے یہ خواب کب دیکھا تھا۔" میں نے سہم کر پوچھا۔

"تیسرے پہر کو۔!"

میں کانپ کر رہ گئی۔

"اور میں نے یہ بھی دیکھا کہ گلستان کی دیواریں نئی نئی ہیں۔ بدن

میں پھول پودے جھوم رہے ہیں اور پھاٹک تو آشنا شناسا بنوایا ہے میرے منو بیٹے نے کہ بس دیکھتے رہ جاؤ۔"

میں سن سن کر کانپتی رہی۔

اور پھر کئی دن گزر گئے

زندگی اور بھی مہربان ہو گئی۔

اس اثنا میں ساری دیواریں گر گئیں۔ دیواروں میں پانی جذب ہو گیا تھا۔ کہاں تک سہارتیں۔ صرف پھاٹک باقی رہ گیا۔

اور پھر ہماری زندگی میں وہ دن بھی آیا کہ قرض خواہ ہمارے گلستان کی بولی اٹھا رہے تھے۔ صرف گلستان ہی نیلام نہیں ہو رہا تھا۔ بلکہ ہر اس پیارے پیارے لمحے کی بولی اٹھ رہی تھی جو اس گھر میں بیتا تھا۔ اور یہ لمحہ صرف ایک ہی لمحے تو بتایا نہ تھا۔ یہاں تو اسلاف کی پشتوں کی پشتیں بیتی تھیں۔ زندگی نیلام ہو رہی تھی۔ موت نیلام ہو رہی تھی۔

دادی اماں بستر پہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ "یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ بھلا گلستان کیسے نیلام ہو سکتا ہے۔؟" ان کی سانس پھولنے لگی۔ "میرے جیتے جی تو ایسا نہیں ہو سکتا۔"

بہرے کانوں نے سنا۔ "بولی اٹھاؤ — دو ہزار۔ بولی۔"

دادی اماں ہڑبڑا گئیں۔ انہوں نے جلدی جلدی کیلیں کھولنی شروع کیں۔

"کاش دادی اماں بہری ہوتیں۔" میں نے سوچا۔

گلستان پہ قبرستان کی اداسی چھائی ہوئی تھی۔

"منو بیٹا نہیں آیا۔؟" دادی اماں نے جیسے کہیں دور سے پوچھا۔

سوائے آنسوؤں کے میرے پاس کیا جواب تھا۔ بڑے چچا یوں سر جھکائے کھڑے تھے گویا کوئی بے جان بت ہوں۔

"سیٹھ کو یہ کیلیں دے دو بیٹا، مگر گھر بچا لو۔"

بڑے چچا نے تڑپ کر دیکھا۔ دادی اماں اب تک کیلیں کھول رہی تھیں۔ برسوں پہلے کی پہنی ہوئی لونگیں مضبوطی سے جم گئی تھیں۔

"اماں مکان اتنا سستا نہیں ہے۔" بڑے چچا بے بسی سے بولے۔

"دھڑ — دھڑ —" دادی اماں اور میں بری طرح چونک پڑے۔ بڑے چچا کھڑکی کی طرف دوڑے۔

پھاٹک گر چکا تھا اور منو چچا اب تک نہ لوٹے تھے۔

"بیٹا —" دادی اماں کے منہ سے ایک سہمی ہوئی آواز نکلی اور ان کے ہاتھ کانوں پر سے ہٹ گئے۔ کیلیں کسی حالت میں کھلنے پر تیار نہ ہوتی تھیں۔

"چھ ہزار — چھ ہزار — ہے کوئی بولنے والا۔ ہے — ؟ ؟"

بولی چھ ہزار پر آ کر رک گئی۔

"گلستاں نیلام ہو گیا — باغ اجڑ گیا — بہاریں لٹ گئیں —!"

دادی اماں نے گھبرا کر تکیے پر سر ٹیک دیا اور آنکھیں موند لیں۔ ہمیشہ کے لئے ہی موند لیں۔

صبح کی سفیدی نمودار ہو چکی تھی — اجالا پھیل رہا تھا مگر ہماری قسمت پر سیاہی چھا رہی تھی۔ گھر بک چکا تھا، نیلام ہو چکا تھا۔ اب کیا ہوگا — ؟

دادی اماں کتنے مطمئن انداز سے سو رہی تھیں۔ ایک لمحے کو مجھے

ان کی نیند پر رشک سا آگیا۔

ان کے سرہانے اب تک دال کا کٹورا اور دو روٹیاں رکھی ہوئی ہوئی تھیں۔ بوجھل بوجھل قدموں سے چلتی ہوئی میں پھاٹک تک پہنچی جہاں مٹی اور اینٹوں کا ڈھیر پڑا تھا۔

پھٹے پرانے، میلے کچیلے کپڑے پہنے گلستاں کی طرف پیٹھ کئے ایک فقیر کھڑا تھا۔ دال کا کٹورا اور روٹیاں میں نے اس کی طرف بڑھائیں۔

"لو بھائی کھالو اور مرنے والی کے لئے دعا کرو۔" دوسرے ہی لمحے روٹیاں میرے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑیں۔

یہ منو چچا تھے۔ !!!

⁂

کالے بادل

کھڑ بڑ سے شکور کی آنکھ کھل گئی۔ تکیے سے سر اٹھا کر دیکھا تو حمیدہ کھاٹ کے پاس کھڑی کھڑی، دیوار سے لگے تختہ سے کوئی چیز نکال رہی تھی۔

"کیا کر رہی ہے اتنی رات گئے۔؟" وہ وہیں پڑے پڑے بولا۔

"جلنے پیٹ میں کیا گڑبڑ ہے۔ نہ لیٹا جائے نہ بیٹھا جائے اجوائن کھا رہی ہوں۔"

شکور تیزی سے بستر پر اٹھ بیٹھا۔ "پیٹ میں گڑبڑ ہے۔؟" وہ چیخنے کے سے انداز سے بولا۔

حمیدہ نے حیرت اور ذرا خوف سے پلٹ کر دیکھا۔ "ہاں ہاں! مگر تم اتنا شور کیوں مچا رہے ہو۔؟ کیا پیٹ میں درد ہونا ایسی انہونی بات ہے؟"

وہ اس کی بات ٹال کر بولا۔ "یہ تو بتا تیرا کون سا مہینہ چل رہا ہے؟"

حمیدہ نے ذرا شرما کر سر نیوڑھایا اور سیدھا انگلیوں پر حساب جوڑتی ہوئی بولی۔ "اس چاند کو پورے آٹھ مہینے تو ہو گئے۔"

"تو تیرے حسابوں یہ نواں چل رہا ہے نا۔؟" وہ تشویش سے بولا۔

"ہاں۔" وہ ذرا رک گئی۔ "پھر تمہارا مطلب ؟"

"اری نیک بخت تو ہی تو کہہ رہا ہوں کہ پیٹ میں ساری گڑبڑ بچے کی ہے۔" وہ اچک کر بولا۔ "اری تو کیسی ماں ہے کہ یہ تک پتہ نہیں چلا سکتی کہ درد کا ہے کا ہے۔ ؟"

"ایسے کون سے میں نے دس بارہ بچے جن ڈالے ہیں کہ پتہ چلا لونگی۔" وہ تنک کر بولی۔ "اور تم بھی جانے کیا بک رہے ہو۔ ابھی تو مہینے پورے تو ہوئے بھی نہیں۔"

"رہی عقل کی بودی کی بودی۔ اری پاگل، تو ہی کی چھاؤں پر جائے بس ہے۔ میں تو کہتا ہوں اب گھنٹہ دو گھنٹہ میں ہوتا ہی ہے بچہ تیرا رنگ تو دیکھ پیلا پڑا جا رہا ہے۔" وہ تجربہ کاردانی کے سے انداز سے سر ہلا کر بولا۔

حمیدہ مچل گئی۔ "ہونہہ! رنگ پیلا پڑا جا رہا ہے۔ فاقے جو ٹوٹتے رہتے ہیں آئے دن، اس کا کوئی خیال ہی نہیں۔ اور کیا گالوں پر گلال برسے گا۔ ؟"

اس کی بات نہ سن کر شکو راپنی ہی ہانکے گیا۔ "ارے ارے کیا بری بات ہوئی۔ میرے قبر میں سونے کا دن اور تیرے بچہ جننے کا دن ساتھ ہی ساتھ پڑا۔ بھلا بچے کو چھوڑ کر میرا دل قبر میں کیسے لگے گا۔ ؟"

حمیدہ پیٹ کو دباتی ہوئی چلا پڑی۔ "دیکھو میں کہے دیتی ہوں آج سے تم یہ بیہودہ کام نہیں کرو گے۔ اتنے دن جو کر لیا سو کر لیا، مگر اب تم ایک بچے کے باپ بننے رہے ہو۔ تمہیں میرا کوئی خیال نہیں، اپنے بچے کا تو آئے گا۔"

شکور چاپلوسی سے بولا۔ "میری رانی یہ تو تو نے ٹھیک کہا کہ قبر میں سوؤں نہیں۔ مگر پھر یہ تو بتا کہ کھائیں گے کیا۔ ؟ تو سمجھتی ہے تیرا مردوا ایسا ہی پڑا انہ بیدار رہے۔"

"مجھے نہیں معلوم۔" حمیدہ کا چہرہ اتر گیا۔ "تم نے سدا اپنے دل کی کہی ہے۔ کبھی مجھے یہ سمجھنے کا حق ہی نہیں دیا کہ میں تمہاری کچھ لگتی بھی ہوں۔ مگر اب سے کہتی ہوں اب میں تمہیں قبر کے اندر پاؤں دھرنے ہی نہ دوں گی۔ کوئی حد ہے۔ صورت تو دیکھو۔ آنکھوں میں حلقے۔ گال پچکے ہوئے۔ بدن کمزور، سارے جسم کی رگیں ابھری ہوئیں اور اس پر جب دیکھو تب قبروں کو دوڑے پڑتے ہو۔ مجھے نہیں چاہیے ایسی روٹی۔"

"تو پھر فاقے کرتی رہ۔" شکور زچ ہو کر بولا۔

"ہاں ہاں کروں گی۔ فاقے کروں گی۔ تمہارے ساتھ فاقہ کرنا تو دوزخ میں بھی جنت کے برابر ہے۔"

شکور پیر پٹختا اٹھ کھڑا ہوا۔ "ہونہہ! بڑی جنت والی آئی اب یہ شتر مرغ کا بچہ نہ رہے تو اب پتھر کیا کر کھائے گی۔ ؟ میرا سر یا اپنا۔ ؟"

حمیدہ نے پیار سے اپنا پیٹ پکڑ لیا۔ "شتر مرغ کا بچہ۔ واہ! ایسا کیا تمہیں بھلا لگتا ہے شتر مرغ کہنا۔ تمہیں کیا، میں کچھ بھی کھلاؤں، نہ بھی کھلاؤں تو کیا فرق پڑتا ہے۔ ؟"

"کیا فرق پڑتا ہے۔ ؟ تو کیا بھوکا مارے گی۔ ؟"

حمیدہ مسکرا کر بولی۔ "بچے کا کیوں ماروں گی۔ ارے نہیں تو پیٹ میں ہے۔ ماں جی کر تو دیکھ، پیاس سب مٹنے لگتی ہے تب بھی

فرق نہیں پڑتا۔" وہ کھوئے ہوئے بولی۔ "جب سے میرا ایک جی سے دو جی ہوا ہے یقین کرو مجھے ایسا لگتا ہے کہ بس دنیا زمانے کی ساری خوشیاں مل گئی ہیں۔"

"ہونہہ۔! خوشیاں مل گئی ہیں تبھی یہ منہ سرسوں کا کھیت بنا ہوا ہے۔"

ابھی اس کی بات منہ میں ہی تھی کہ حمیدہ چکرکھا کر گر پڑی شنکور بستر سے اچھل کر اسے سنبھالنے کو بھاگا۔ دونوں ہاتھوں پر اٹھا کر لایا اور کھاٹ پر ڈال کر دھیرج سے بولا۔

"کیسا لگ رہا ہے حمیدہ۔ ؟"

حمیدہ کے دیدے بند ہوئے جا رہے تھے، کراہ کر بولی۔

"جانے کیسا کیسا لگ رہا ہے۔ اس درد کا واسطہ، تم سے ایک وعدہ چاہتی ہوں۔"

"کیا۔؟" شنکور دکھ سے بولا۔

"یہی کہ میری خاطر، اپنے ہونے والے بچے کی خاطر تم آج کے بعد کبھی قبر ہیں نہ اترو گے۔"

یہ بڑا کٹھن لمحہ تھا۔ ایک طرف موت دھیان کی اٹھاکشش میں مبتلا بیوی کا دل اور دوسری طرف پیٹ کا سوال۔ وہ کشمکش و پنج میں رہ گیا۔

"حمیدہ نادان نہ بن۔ تو آج سے پہلے بھی بار بار کہہ چکی ہے اور میں بھی تجھے جواب دے چکا ہوں کہ کہنے ہی میں گھر بیٹھ جاؤں۔ مگر پیٹ بھرنے کا کیا بندوبست ہوگا۔ میرا دروازے تیرے دلبر کی ہی قربس

نے یہ راہ نکالی ہے، ورنہ کیا تو سمجھتی ہے مجھے اپنی جان پیاری نہیں۔ میری جان عزیز نہیں اور کیا یہ ننھا سا بچہ عزیز نہیں۔ مگر۔ مگر۔"

وہ بے بسی سے ہاتھ ملنے لگا۔

پھر اس کا دل ہاتھ میں کر لینے کو آخری وار پھینکا۔ "تو کیا اپنے جگر گوشے کو بھوکا مارے گی۔ جب وہ بھوک سے تلملا تلملا کر تیری سوکھی چھاتیوں پہ ہاتھ مارے گا تو تو کیا کرے گی۔ جب وہ بھوک سے نڈھال ہو ہو کر یونہی مردہ سا ہو کر پڑا رہا کرے گا۔ تو تو اس وقت کیا کرے گی۔" "تو کیسی بات کرتی ہے حمیدہ۔ ماں بننے سے پہلے عقل مند بننا پڑتا ہے۔ مگر تو ماں تو بن رہی ہے۔ عقل کا دور دور پتہ نہیں۔"

حمیدہ نے اپنے کا ربلا پونچھ کر، کراہ کر اس کی صورت دیکھی اور بیچ بیچ بولنے لگی۔ "یہ تمہاری صورت دیکھو۔ پچھلی بار جو تم بیمار پڑے تو آج تک بھی تم نہیں سدھرے۔ میں تو یہ سوچ کر ہی ڈر جاتی ہوں کہ تم پور مٹی کے تلے مسلسل بارہ گھنٹے کیسے کر سکتے ہو!"

تکو پیٹ ٹھونک کر بولا۔ "پیٹ کی خاطر، صرف پیٹ کی خاطر۔"

"آگ لگے ایسے پیٹ کو۔ میں تمہیں سنوں گی۔ اب تم گھر سے قدم تو نکال کر دیکھو ذرا۔" اس کا چہرہ دم بہ دم رنگ بدلتا جا رہا تھا۔

"یہ تو زندگی بھر چلتا ہی رہے گا۔ حمیدہ تو ناحق دل کڑھا رہی ہے۔ دیکھو ایسے وقت غم کھانا اچھا نہ ہوگا۔"

حمیدہ نے آنسو بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا تو وہ نرمی سے بولا۔ "حمیدہ اگر آج سے نو مہینے پہلے تو یہ بات کرتی تو شاید میں مان بھی جاتا۔ مگر اب ۔۔۔ اب" وہ خوشی سے بولنے لگا۔ "تو اور بیا

ایک بچے کے ماں باپ بن رہے ہیں۔ بھلا اس کو کیسے بھول سکیں۔؟
حمیدہ بیٹے کو دبلائے کھاٹ پر اٹھ بیٹھی۔ اس کی سانولی گردن پر پسینے کی دھاریں بہی جا رہی تھیں، آنکھوں میں آنسو چمک رہے تھے، بال جھول کر سامنے آگرے تھے۔ "تو تمہارا کہنا یہ ہے کہ اب تم صرف ننھے جی کی خاطر قبر میں سونے پر مجبور ہو۔"
"ہاں۔" وہ جیسے بات ٹالنے کے لئے بولا۔
"تو — تو۔" حمیدہ نے دو ایک بار تھوک نگلنے کی ناکام کوشش کی۔ پھر بولنے پر آمادہ ہوئی۔ "تو میں ننھے کو ڈاکٹرنی کے ہاتھ بیچ دوں گی۔ ہزار پانچ سو جو مل جائیں گے اس سے تم کوئی دھندہ کر لینا۔ بچوں کا کیا ہے۔ تم سلامت رہے تو اللہ اور دیگا۔" اور وہ ضبط کی کوشش کرتے کرتے پھوٹ پڑی۔
شکور پوری طاقت سے چلایا۔ "کیا کہا ننھے کو بیچ دے گی۔؟ اس سے ہٹ کر کوئی بات نہ سوجھی تجھے۔؟ اس سے اچھا تو یہی ہے کہ گلا اپنے ہاتھوں مار ڈالئے۔ تو جانتی ہے حمیدہ۔" وہ اس کے قریب جھک آیا۔ اس کی آواز بھرا رہی تھی اور آنسو امڈ پڑنے کو بے قرار ہو رہے تھے۔ "تو جانتی ہے نا کہ مجھے بچے کی کتنی آرزو تھی۔ تو نے تو کبھی نہیں کہا۔ مگر شادی کے بعد سے آج تک — آج تک میرا ایک دن بھی ایسا نہ گزرا جب میں نے اپنے پہلو کو ایک بچے سے سونا محسوس نہ کیا ہو۔ میرا جی ان سات برسوں بچے کے لئے کتنا ترسا۔؟ اور اب تو کہتی ہے کہ ہزار پانچ سو کے لئے میرے بچے کو، اپنے بچے کو، اپنی جان کے ایک، جیسے کو، اپنے دل، تیرے میرے خون کو بیچ ڈالے گی۔ بول حمیدہ

تیرا اتنا دل گردہ ہے کہ ایسا سوچ بھی سکے۔ کیا تو چاہتی ہے کہ میں جیتے جی مر جاؤں۔؟"

حمیدہ نے بڑے دکھ کے ساتھ سر اٹھا کر اس کو دیکھا، پھر بڑے دکھ کے ساتھ بولی۔

"مگر اب تمہاری حالت مجھ سے دیکھی نہیں جاتی۔ تین برس سے دم گھونٹتے گھونٹتے تمہاری کیا حالت ہوگئی۔؟ ناک بالنسہ تک نکل آیا ہے۔ میں ایسی نیند کی ماتی بھی نہیں، جانتی ہوں کل رات تم ٹھسک ٹھسک۔ کھانس بھی رہے تھے۔ کیا تمہیں اپنے بچے کا سکھ نہیں دیکھنا تم تو......"

ابھی اس کی بات ادھوری ہی تھی کہ وہ پیٹ پر ہاتھ رکھ کر زور سے چلائی۔ چیخ کی آواز سنکر دالان میں سوئی پچی نیکی آئی۔ شکور نے گھبرا کر حمیدہ کو جلدی سے لٹا دیا اور خود دائی کو لینے چل دیا۔!

"میں کب نہیں کہتا کہ اسے مجھ سے محبت نہیں۔ مگر کیسی اُلٹی پلٹی باتیں سوچتی اور سمجھاتی ہے۔ نوکری ملے گی کہاں۔ شہر تو گیا ہی تھا اور چار برس کارخانے میں نوکری کی بھی۔ اب مزدوروں کے ساتھ میری بھی چھنٹی ہوگئی تو میں بھی کیا کر سکتا تھا۔؟ یہاں گاؤں میں کون پاپڑ نہ بیلے، مگر کیا ملا۔؟ اب تنگ آکر قبر میں سونا ہوں تو یہ سمجھتی ہے کہ جان بوجھ کر مرنے پر تلا ہوں۔ بھلا یہ نہیں سوچتی کہ ایک شوہر ہوں اور اب ایک باپ بھی ہونے والا ہوں۔ کس کا دل اب اس عمر میں مرنے کو چاہتا ہے۔ اور یہ کھانسی ایسا تو

اپنے سجائے رضائی میں منہ چھپائے کھانس رہا تھا اور یاد ہر اسے تو رتی رتی کی خبر رہتی ہے۔ ابھی بول رہی تھی نا کہ میں تمہاری کھانسی کی آواز سن رہی تھی۔ ہونہہ۔ خدا ایسا بے رحم بھی نہیں۔ ارے گاؤں میں رہتے عمر کٹ گئی ہے۔ ہزار بار دیکھا کہ کالے کالے بادل آسمان پر چھائے اور برس گئے۔ تو کیا ہمارے سر کے کالے بادل کبھی نہ برسیں گے۔ برسیں گے کیسے نہیں۔؟ ذرا بات تو سنو۔ کہتی تھی بچہ بیچ ڈالوں گی۔ ایسے کیسے بیچے گی۔؟ اور میں بھی کیا پاگل پن کی باتیں سوچ رہا ہوں۔ بھلا ایک ماں بھی اپنے بچے کو بیچ سکتی ہے۔؟ سب مجھے گرانے کی باتیں ہیں۔ ارے! دائی کا گھر آ بھی گیا اور میں اپنے اوندھے سیدھے خیالات میں ہی غلطاں پیچاں ہوں۔؟

حمیدہ اور شکور ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔ ابھی ابھی دائی سارن غلاظت سمیٹ کر باہر چلی گئی تھی اور اب مامتا کی ساری ٹھنڈک اور اطمینان کے ساتھ حمیدہ اپنے پہلو میں چھوٹے سے بیٹے کو لئے پڑی تھی۔ شکور کے چہرے کی ساری زردی، ساری تھکن اس وقت سرخی اور تازگی سے بدل گئی تھی۔ باہر رات کا سیاہ اور گھیرا اندھیرا چھایا تھا مگر دونوں کے دلوں میں سحر دوپہری کا سورج ناچ رہا تھا۔

"آج سات برس بعد خدا نے یہ دن دکھایا ہے حمیدہ" وہ بھیگی بھیگی آواز میں بولا۔ "میری تو سمجھ میں نہیں آ رہا ہے مالک کا شکر کیسے ادا کروں۔ سچ ہے اوپر والے کے پاس دیر ہے مگر اندھیر نہیں۔"

حمیدہ ابھی دو چار گھنٹوں پہلے کی بات بھولی نہ تھی، اور یہ لہجہ تو ایسا لہجہ تھا کہ سارے گناہ بخش دینے اور سارے راز اگلوا لینے کا لہجہ تھا۔ اس نے ٹھہرے معنی خیز لہجہ میں پوچھا۔

"لاڈ آ رہا ہے بچے کا۔؟"

خوشی سے بھر کر وہ بولا۔" واہ کیا بات پوچھی ہے۔ بھلا اپنے دل پہ ہاتھ رکھ کر پوچھو، خود ہی جواب مل جائے گا۔"

"اگر یہ کچھ مانگے تو۔؟"

"ارے یہ کیا مانگے گا۔؟ اس کی زبان کہاں ہے ابھی۔!" وہ ہنس دیا۔

"بچے کی زبان تو بند رہتی ہے مگر اس کا انگ انگ بولتا رہتا ہے۔ اور اب اس وقت تمہارے لاڈلے کا انگ انگ کہہ رہا ہے، 'بابا مجھے تمہاری زندگی چاہیئے، تمہیں میرے لئے جینا ہے۔ میری ماں کے لئے جینا ہے۔'"

شکور سر سے پیر تک لرز لرز گیا۔" کیسی بات کرتی ہے میمنہ؟" وہ بس اتنا ہی کہہ سکا۔

"سیدھی سادی سی بات ہے جی۔ تم یہ دھندہ چھوڑ دو۔ خدا کوئی نہ کوئی نیند دلیست تو کرہی دیگا۔ کیا ایسا ظالم ہو گیا کہ بھوکا ہی مار دیگا۔!"

ایسے مسرت بھرے دن بھی حمیدہ وہی روزی اور روٹی کا جھگڑا اٹھا رہی تھی۔ وہ ذرا رک کر بولا۔

"اچھا اچھا۔ چھوڑ دیتا ہوں یہ دھندہ۔ ابھی، آج اسی

وقت، اسی لمحہ۔ مگر مجھے روپیوں بھری تھیلی لاکر دے کہ اس سے اور کچھ نہیں تو کپڑے کا ٹھیلا تو چلا سکوں۔"

"اگر میں آٹھ ہی رقم کا بندوبست کر دوں تو چھوڑ دوگے یہ دھندہ سچ کہہ رہے ہو تم۔؟" وہ اعتماد سے بولی۔

"ہاں ہاں اور کتنی بار کہوں کہ......"

اک دم باہر سے ڈھونڈھی والے کی آواز سنائی دینے لگی۔

"آٹھ گیارہ بجے شنکر ناٹک قبر میں سوئے گا اور پورے بارہ گھنٹے بعد باہر نکلے گا۔ زندہ آدمی مردہ۔ قبر بالکل ڈھانک دی جاتی ہے۔ جس کسی کو یقین نہ آئے طبیلے والے میدان میں آجائے۔ تماشہ کی قیمت صرف چار آنہ۔ صرف چار آنہ۔"

حمیدہ کا دل اچھل اچھل کر دھڑکنے لگا۔ شنکر نے ہنس کر بیوی کو دیکھا۔

"اری شنکر کی بیوی ہو کر دل چھوٹا کرتی ہے۔ اب میرے لئے کون بڑی بات رہ گئی ہے۔؟ تین سال سے عادی ہو گیا ہوں، مگر تو ہر بار یوں دل چھوٹا کرنے بیٹھ جاتی ہے جیسے پہلی بار ہو۔ واہ وا۔ کیا بودی عورت ہے بھئی۔"

حمیدہ غم سے بولی۔ "مہینے میں دو دو بار یوں بارہ بارہ گھنٹے کے لئے بند قبر میں سو کر لوگوں کو تماشہ دکھانا اور محض بیس بائیس روپے کی خاطر اجل سے کس نے ایسی عقل سکھائی ہے۔؟"

"پیٹ نے رانی، پیٹ نے۔" وہ حسب معمول پیٹ ٹھونک کر بولا۔

ڈھونڈھی والا واپسی میں پھر حمیدہ کا دل اچھالتا گیا۔ مگر شکور بغیر کچھ نوٹس لئے چدر اٹھا نہانے کو چل دیا۔

دس بجے کے قریب وہ حمیدہ کے پاس آیا اور بچے کو پیار کرتا ہوا بولا۔

"دودھ نہیں اترا ابھی ۔ ؟"

ایک بار تو حمیدہ کا دل بھی کانپ اٹھا، پھر رک کر بولی۔

"ابھی تو نہیں اترا۔ بچی کہتی تھی کھلائی پلائی زیادہ ہو تو جنائی سے پہلے ہی دودھ ٹپکنے لگتا ہے نہیں تو ....." وہ رک گئی۔

"اچھا۔" وہ ہنس کر بولا۔" شام کو واپسی میں تیرے لئے میوہ لیتا آؤں گا۔ اچھا اب جاؤں۔ انتظام کرنے والے میری راہ دیکھ رہے ہوں گے اور پھر مجھے بھی تو آج گھر آنے کی جلدی ہے نا۔" وہ ہنستا ہوا اٹھا اور حمیدہ اور بچے کے گالوں پر ایک ساتھ پیار کرتا ہوا چل دیا۔

شکور کے جوتوں کی پٹ پٹ دور ہوتی گئی اور حمیدہ کا دل آئی رفتار سے تھرتا گیا اور پھر سہم کر آہستگی سے دھڑکنے لگا ۔ دھک۔ دھک ۔ دھک ۔

اس نے پہلو میں پڑے ہوئے بچے کی طرف دیکھا۔ سرخ سرخ چہرہ، کالے کالے بال پیشانی پر بکھر کر رہ گئے تھے۔ سوکھے سوکھے ننھے ننھے ہونٹ۔ وہ دنیا کی ہر حسرت اور غم سے بیگانہ ماں کے پہلو میں سکون کے ساتھ لیٹا ہوا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ اس کا سرخ چہرہ ماں کی آنکھوں سے اوجھل ہوتا گیا اور پھر اس کی جگہ ایک تھیلی

باقی رہ گئی تھیلی۔ جس میں روپے ہی روپے بھرے ہوئے تھے۔

"دیکھ حمیدہ یہ غور کرنے کا وقت نہیں ہے۔ ایسی باتوں پر زیادہ سوچا نہیں کرتے۔ تو جانتی ہے اس وقت تو ایک ایسے خزانے کی مالک ہے کہ پلک جھپکتے میں تیرے پاس پانچ سو روپے ہوں گے اور ذرا یہ سوچ کہ ان پانچسو روپوں سے کیا کیا کام لے سکتی ہے۔ شکور کپڑوں کی دوکان کھول سکتا ہے۔ کھلونوں کی دوکان لگا سکتا ہے۔ چاہے تو کرائے کا ٹھیلا لگا سکتا ہے۔ بس پیسہ ہو۔ پھر سب کچھ ہو سکتا ہے۔ پھر کیا سوچ رہی ہے ۔؟

"ارے بچے کی طرف دیکھتی کیا ہے۔؟ تیرا شکور سلامت رہے ایسے کئی بچے ہو جائیں گے۔ شہر کی ڈاکٹرنی ہر مہینے دوسرے مہینے گاؤں کا پھیرا لگاتی ہی ہے کہ حرامی اور لاوارث بچے خرید لے بھول گئی کیا ناجے چاچا نے اپنا پانچ برس کا بچہ کس مزے سے بیچ دیا۔ ان کے اور بھی چھ بچے تھے! تو کیا فرق پڑتا ہے۔؟ تجھے بھی اور ہو جائیں گے۔ مگر اس وقت تو تجھے اپنے میاں کے لئے روپیہ چاہیئے۔ اس کی صحت، اس کی حالت تجھے دکھائی نہیں دیتی۔؟ بستر میں لیٹے لیٹے رہنے سے اس کا چہرہ کیسے دق زدہ ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کا سینہ جو پہلے اتنا چوڑا چکلا تھا کیسے سمٹ کر رہ گیا ہے۔ اور جب بارہ گھنٹوں بعد تیرے نکل کر آتا ہے تو کیسے مردہ مردہ دکھائی دیتا ہے کہ اب مرا کہ اب مرا سوچنے کا وقت نہیں حمیدہ۔ گزرا ہوا لمحہ کبھی پلٹ کر نہ آیا ہے نہ آتا ہے۔ چل اٹھ پھر سوچ کیا رہی ہے۔ بچے کی یاد آئے گی۔؟ بیوہ سے خالی کوکھ کہیں اچھی ہوتی ہے۔ حمیدہ

پھر یہ کیا ضرور ہے حمیدہ کہ تو خالی کوکھ ہی رہے۔ ایک بار درخت پھل دینا شروع کردے تو پھر رکتا نہیں۔ اب تجھ پہ بہار آرہی ہے، پھر یہ وسوسے کیسے۔ ؟ مسلمان کا بچہ اور عیسائیوں کے ہاتھ پڑ جائے! یہ خدشہ ستا رہا ہے تجھے۔ ؟ ہونہہ! تیرے خدا نے تیرے ساتھ کون بڑا اچھا سلوک کیا ہے کہ تجھے مذہب کی پڑی ہے۔ ارے، سب سے بڑا مذہب پیسہ ہے پیسہ۔ یہاں آکر سارے مذہب وذہب ختم ہو جاتے ہیں۔ عیسائیوں میں رہ کر بھی وہ تیرا بیٹا ہی رہے گا۔ یاد واد کا مت سوچ حمیدہ۔ عورت کے سہاگ پہ بن جائے تو پھر وہ اولاد کو دیکھتی ہے نہ خود اپنی زندگی کو پھر تو کیا سوچ رہی ہے ؟ یہ نہ بھول کہ ایسے موقعے بار بار نہ آئیں گے — تو تھوڑی دیر کو یہ سوچ کر خود کو تسلی دے لے کہ تجھے ابھی ابھی اولاد پیدا ہی نہیں ہوئی ہے۔ جیسی سات سال سے تھی ویسی اب بھی ہے۔ چین نہیں آتا۔ ؟ دل پر پتھر رکھ لے حمیدہ، سب کچھ بھول جائیگی۔ ایک لمحے میں فیصلہ کرلے۔ تجھے اپنی کونسی چیز زیادہ پیاری ہے — پھولوں کی طرح لہکتا مہکتا سہاگ یا بچہ۔ ؟ جیون مرن کا ساتھی یا یہ بھری کوکھ۔ ؟ شوہر یا اولاد۔ ؟ شوہر، جس کے دم سے اولاد ہوتی ہے۔ اولاد شوہر نہیں دلا سکتی، ہاں شوہر...."

حمیدہ نے تڑپ کر کانوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ دل کی آواز کو اور زیادہ سنتے رہنے کی اس میں تاب نہ تھی۔

"مجھے اپنا شوہر زیادہ عزیز ہے مجھے اپنے سہاگ کے پھول زیادہ ۰۰۰ ہیں۔ مجھے — مجھے۔" اس نے اپنا دل دبوچ لیا۔

لڑکھڑاتے قدموں سے وہ اٹھی۔ بچے کی پیدائش کو ابھی کل چار پانچ گھنٹے ہی ہوئے تھے۔ ابھی ننھے کے جسم کی وہ قدرتی نمی سوکھ بھی نہ پائی تھی۔ ابھی اس کی آنکھیں بھی نہ کھلی تھیں۔ ابھی اس نے ماں کی چھاتیوں کا رس بھی نہ پیا تھا اور وہ دور کیا جا رہا تھا۔

حمیدہ نے اپنی ساڑی کے آنچل میں اسے اچھی طرح لپیٹ لیا۔ دروازے سے جھانک کر دیکھا تو چچی باورچی خانے میں بیٹھی پھونکیں مار رہی تھی۔ اس کی پیٹھ صحن کی طرف تھی۔ حمیدہ نے شکر سے سانس لیا اور ڈولتے قدموں سے صحن سے نکل گئی۔ باہر نکل کر اس نے ایک سانس بھری۔ تھوڑی دیر رکی، پھر چلنے لگی۔ لاوارث اور یتیم بچے خرید لے والی ڈاکٹرنی بڑے زمیندار جی کے گھر کے بازو والے لال گھر میں ٹھہرا کرتی تھی۔ حمیدہ نے دھیرے دھیرے ادھر ہی اپنے قدم بڑھانے شروع کر دیئے۔ تھوڑی ہی دور چل کر اس کی سانس پھولنے لگی۔ مگر وہ دل کو سنبھالے (دل، جو اس کے پہلو میں تھا۔ اور دل، جو اس کے سینے سے بھی چمٹا ہوا تھا) بڑھتی ہی گئی۔

سامنے ہی لال دروازہ دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے قدموں میں تیزی آگئی اور وہ کمزوری کے باوجود چل پڑی۔ ورانڈے میں عیسائی ڈاکٹرنی سٹنگ کر رہی تھی۔ حمیدہ کو آتے دیکھ کر اس نے مسکرا کر اون کے گولے اور تیلیاں پاس پڑی تپائی پر رکھ دیں۔ حمیدہ نے منہ سے ایک لفظ بھی نہ کہا، دھیرے سے کری پر اس ننھی سی جان کو لٹا دیا۔ اور ڈاکٹرنی کے آگے ہاتھ پھیلا دیا۔

"میری ممتا کی قیمت۔" بھنچی ہوئی آواز بس اتنا ہی کہہ سکی۔
ڈاکٹرنی نے چشمے کی اوٹ سے اسے دیکھا اور پوچھا۔
"حرام کا ہے۔؟" حمیدہ کے چہرے پر زہر خند مسکراہٹ چھا گئی
"حرام حلال سے فرق نہیں پڑتا مالکن۔ محبت تو وہی رہے گی۔ چاہے ماتھے پر بدنامی کا ٹیکہ ہو یا چڑھاوے کا تیجو۔"
ڈاکٹرنی نے ہنس کر اسے دیکھا، پھر اٹھ کر کرسی تک آئی اور کپڑا اٹھا کر بولی۔
"ارے بیٹیا ہے۔!"
حمیدہ کا دل اچھل کر منہ میں آ گیا۔ مگر وہ منہ سے کچھ نہ بولی۔
"کیا لوگی۔؟" وہ پھر کرسی پر بیٹھتی ہوئی بولی۔
"یہ تیری کیسی خدائی ہے مولا جہاں پیٹ کی اولاد کی بھی بولی اٹھائی جاتی ہے۔؟" حمیدہ نے سوچا اور پھر دھیرے سے بولی۔
"پانچ سو سے کم نہیں، زیادہ جو آپ کے دل میں آئے۔"
ڈاکٹرنی نے ایک لمحے کو اسے دیکھا اور بولی۔
"لیکن تو دیوی مفت میں بھی بچے مل جایا کرتے ہیں۔"
"میں نے اس پر کوئی اعتراض تو نہیں کیا۔ میں اپنی بات کہہ رہی ہوں۔ یہ میری پہلی اولاد ہے، وہ سورج جو سات سال بعد کسی راندھیرے میں چمکا ہے۔ مگر میں پھر اندھیرا اپنا رہی ہوں۔" وہ جھکی اور ڈاکٹرنی کی آنکھوں میں دیکھ کر بولی۔ "مالکن کوئی ماں اپنے بچے کو خود سے جدا نہیں کرنی، نہیں کر سکتی۔ مگر کرنا ہے تو صرف سہاگ کی خاطر۔ میرا شوہر ہر پندرھواڑے قبر میں سوتا ہے، تماشہ بنتا ہے تاکہ پیٹ کما سکے۔ اگر وہ

اور یونہی کرتا رہا تو ایک دن چھوٹ سے مر جائے گا۔ اس کی صحت بالکل تباہ ہو رہی ہے۔ مگر وہ سنتا ہی نہیں۔ میری خاطر، میرے بچے کی خاطر وہ بس یہی چاہتا ہے کہ پیسہ کمائے۔ میں نے سوچا میں بھی تو پیسہ کما سکتی ہوں۔ عورت کیا نہیں کر سکتی مالکن، بس سینے پر پتھر رکھنے کی بات ہے۔" اس کی سانس بوجھل ہو گئی۔

ڈاکٹرنی نے اور کچھ نہیں کہا۔ اٹھ کر کمرے کے اندر چلی گئی اور واپس آئی تو اس کے ہاتھوں میں کڑکڑاتے نوٹوں کا ایک بنڈل تھا۔

حمیدہ نے نوٹوں کو دیکھا اور پھر بڑے بچے کو اور اک دم وہاں سے نظریں ہٹالیں۔ بڑی دیر بعد وہ بولی۔

"مالکن آپ یہاں کب تک رہیں گی۔؟" "میں آج شام کو ہی جا رہی ہوں۔ چار بجے اور بھی میرے ساتھ ہیں۔" وہ اسے مطمئن کرنے کو بولی۔

"آج شام کو ہی!" حمیدہ کا دل ٹوٹ گیا۔

"اچھا ہی تو ہے نا، ورنہ جتنے دن دیکھتی رہوں گی خواہ مخواہ دل اٹکتا رہے گا۔"

حمیدہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنے کو دبوچ لیا۔ ڈاکٹرنی نے اسے دیکھا اور جیسے سمجھ کر بولی۔

"دودھ کا زور ہو رہا ہو تو پلا دو۔"

"نہیں۔" حمیدہ مضبوطی سے بولی۔ "میں اسے دودھ نہیں پلاؤں گی۔"

"کیوں۔؟" ڈاکٹرنی حیرت سے بولی۔

" مالکن ۔ " وہ بھنچی ہوئی آواز سے بولی ۔ " ایک ماں جب اپنے سینے سے اپنی اولاد کو ممتا کا رس پلا دیتی ہے تو یہ محبت بالکل ہی اُوٹ اور نہ بچھڑنے والی ہو جاتی ہے ۔ دودھ کی دھار ماں کی چھاتی سے نکل کر بچے کے منہ میں پڑتی ہے تو دونوں کے بیچ ایک واسطہ ہو جاتا ہے ۔ ایک خاموش معاہدہ کہ میرے بچے میں تجھے سدا یونہی اپنی اچھائیوں کا رس پلاتی رہوں گی ۔ میں ۔ میں اپنے بچے سے ایسا جھوٹا وعدہ کیسے کر لوں مالکن ۔ ؟ " اس کی بے نور آنکھوں سے آنسو جھر جھر بہہ اٹھے ۔

حمیدہ نے دھیرے سے نوٹ تھامے اور پلٹ گئی ۔ دروازے کے پاس جا کر وہ رکی پھر دوڑتی ہوئی بچے کے پاس آ گئی ۔ بچہ بے خبر سو رہا تھا ۔ وہ تڑپ کر بولی ۔

" مالکن آپ اسے کیسے پالیں گی ۔ ؟ کیا پلائیں گی ۔ ؟ "

ڈاکٹرنی ذرا دکھ سے مسکرا کر بولی ۔ " آخر میں بھی ڈاکٹرنی ہوں اور کئی بچے حاصل کر چکی ہوں ، دل چھوٹا نہ کرو ، تمہارا بچہ بالکل اچھا رہیگا ۔ "

" مالکن ۔ " وہ پھر سے بولی ۔ " میں بھی اگر اسٹیشن تک آپ کے ساتھ چلوں تو ۔ ؟ "

" مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے ۔ ہاں تم اپنے دل کا سوچو ۔ "

حمیدہ وہیں گھٹنوں میں سر دبا کر بیٹھ گئی ۔ کتنی دیر گزر گئی ۔ اس کی آنکھوں کے آگے سیاہ دھبے ناچنے لگے ۔ پچھی زچہ اتنی دور کی تھکن ، اور سب سے بڑھ کر بچے کی جدائی ۔ ؟ اس کا بند بند درد کر رہا تھا ۔

گھوڑا گاڑی دروازے سے لگی اور پھر وہ سب اسٹیشن پہنچ گئے۔
"مالکن،" وہ ہچکیاں لے لے کر بولنے لگی، "آپ ڈاکٹرنی ہیں، جانتی ہوں گی کہ ایک ماں کتنے کرڑے دردوں کے ساتھ بچہ پیدا کرتی ہے۔ آپ نے بھی کتنے ہی بچے پیدا کروائے ہوں گے۔ آپ کے پاس بھی عورت کا دل ہے۔ مالکن جب جب ننہا روئے گا میرا دل کٹ کٹ کے بہا کریگا۔ آپ یہ سوچ لیا کریں مالکن کہ وہ میرا نہیں آپ کا ـــ آپ کا ہی بچہ ہے۔"
ریل چھک چھک کرتی دور ہوتی جا رہی تھی۔ حمیدہ کے سینے میں ہلچل سی ہونے لگی۔ دودھ سے لبریز چھاتیاں ننھے منے ہونٹوں کے لمس کو بے قرار تھیں اور پھر ممتا کی ماری دو ندیاں چھل چھل کرتی امڈ ہی پڑیں۔ حمیدہ نے سر پیٹ کر دیکھا۔ اس کا سب کچھ چلا گیا تھا۔ خالی کوکھ اسے رہ رہ کر ڈس رہی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنی چھاتیوں کو جکڑ لیا۔ "میرا بچہ ... !"
ریل چلی گئی اور حمیدہ کتنی ہی دیر تک وہاں کھڑی رہی پھر دھیرے دھیرے اسے ہوش آیا اور گرمیں دو بچوں کی موجودگی کا احساس ہونے لگا۔ وہ شکور کو کیا منہ دکھلائے گی۔؟ سات برس اس نے جس لگن سے ننھے مسافر کی چاہت کی تو کیا اسی دن کے لئے کہ یوں بچھڑ جائے! میں کہہ دوں گی کہ یہ سب تمہارے ہی لئے تو کیا ہے۔ تم جیو میرے سر کے تاج! ایسے کئی پھول کھلا دو گے۔ ایسا ہی نہیں بچے کی یاد ستائے تو ــ لو میں کیا لکھوں گی۔؟ کون جانے کس ولیش کو وہ مسافر گیا ہے۔؟ میں ـــ میں کیا کروں۔؟ کیا سوچوں۔؟

سینہ بیٹھا جا رہا ہے۔

اری دیوانی! تیرے سر پر تو تاج سا جگمگا رہا ہے۔ تیرے سر کا تاج سلامت ہے۔ تجھے اور کیا چاہیئے۔ ؟ کوکھ پھر بھی بھر جائے گی۔ سہاگ بار بار کہاں ملتا ہے۔ ! دیوانی آنسو پونچھ بھی لے، پونچھ بھی لے۔

میلے کے میدان کے گیس ہنڈولے یہاں سے صاف نظر آتے تھے۔ اسٹیشن اور میدان کا فاصلہ ہی ایسا کتنا تھا۔ ؟ جس دن شکور پیدا ہونے والا ہوتا چھوٹا موٹا میلہ ہی وہاں لگ جایا کرتا۔ رات تو ہو ہی گئی تھی، کیوں نہ وہ میدان تک چلی جائے کہ شکور کو ساتھ لے لے۔ گھر پہنچ کر خالی کوکھ دیکھ کر تو اسے بڑا ہی طیش آئے گا۔ یہاں روپے نیا دوں گی تو اسے ذرا سکون مل جائے گا۔

ہاں یہی ٹھیک ہے۔ اور اب یہ آنسو نہیں بہنے چاہئیں۔ اب تو خوشیاں آئیں گی۔ کالے بادل ہٹ گئے، روشنی چھا گئی آ رہی ہے۔ اب کہاں کوکھ پیٹ بھر روتی ہوگی۔ مینہ تو نن بھر گیا۔ اور منا؟ منے چیزوں کا کیا ہے، سال دو سال میں گھر بھر جائے گا۔

خیالات کی رو میں بہتی بہتی وہ عین میدان کے بیچ پہنچ گئی۔ لوگ ہنڈولے جھلانے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ چیخ چلاہٹ تھی۔ وہ اپنے کچے زخموں کو چھپائے سراسیمہ سی کھڑی تھی کہ اکدم کوئی اس کے قریب سے گزرا۔

"ارے کوئی اس کی چچی اور بیوی کو خبر کر دے۔ بے چارہ قبر میں ہی گھٹ کر رہ گیا۔ آخر لاش گھر کیسے پہنچے۔ ؟"

"ہوا کیا۔ ؟" دوسرا آدمی تاسف سے پوچھ رہا تھا۔
"ارے پتہ نہیں بھائی، وہ شکور نائک قبر میں سوتا تھا کہ نہیں تو آج ہمیشہ کے لئے ہی سو گیا۔ صبح ہی کھانسی رہا تھا۔ اور اس کی صحت بھی خراب دکھائی دے رہی تھی، مگر پیٹ برا ہے بھائی، کیا کرتا؟ اور سنا ہے غریب آج ہی ایک بچے کا باپ بھی بنا تھا۔!"

*

سُہاگن

(۱)

سلیمان میاں تو سدا کے بگڑے دل تھے۔ اس میں ان کا اتنا اپنا قصور بھی نہ تھا۔ جتنا کہ ماں باپ کا۔ اور باپ سے بڑھ کر ماں۔ اکلوتی اولاد تھے۔ جو بولتے ماں پورا کر دکھاتیں۔ جوانی آئی مگر ان کے چلن میں کوئی فرق نہ آیا۔ بس وہی کریں گے جو دل میں سمائے گی۔ ماں باپ نے چھوٹے ہی ویسی دے رکھی تھی۔

بھری برسات کے دن۔ نالے میں پانی اچھل اچھل کر گنتی رنگ کا ہوگیا، بھرلئے دار ہوا اور جھرالٹے کا بہاؤ۔ ایسے میں بھلا کوئی یوں تیرنے کو جایا کرتا ہے۔

باہر نکلنے لگے تو ماں نے پوچھا بھی۔ "کہاں جاتے ہو سلو میاں؟"
بولے۔ "ایسے ہی ذرا باہر گھوم کر آتا ہوں اماں۔"

"دوئی ایسے میں کہاں گھومنا ہے میاں۔ سارے میں کیچڑ پٹ ہو رہی ہے۔ ایسے میں گھر بیٹھتے ہیں یا سیر سپاٹے کو جاتے ہیں۔؟"

"آپ تو چاہتی ہیں میں لڑکیوں کی طرح گھر ہی میں بیٹھا رہا کروں۔ بھلا اس موسم میں تیرنے کا جو مزہ ہے وہ پھر کہاں۔" دھڑاک

سے دروازہ کھول باہر نکل گئے۔

صبح سے دوپہر ہوئی، دوپہر سے سہ پہر، سہ پہر سے شام اور پھر کالی گھور اندھیری رات۔

رات کے سناٹے میں محلے والے سلو میاں کی لاش حفیظ میاں کے گھر پہنچا گئے۔

"ہائے میرا لال -!" حفیظ میاں دھاڑے۔

اندھیرے کو ٹٹولتی ہوئی ماں دروازے تک آئیں تو دیکھا کھری چارپائی پر ڈھلی ڈھلائی لاش رکھی ہے۔ اور کچھ ان سے دیکھا نہ جا سکا۔ دھڑ سے چوکھٹ پر گر پڑیں۔

اختر، بھابی کے بچے کو گود میں لئے دودھ روٹی کا چورا کھلا رہی تھی۔ "راجہ کیا کھائے گا -؟"

"ہپّا - منا منہ پھاڑ کر بولا -

"راجہ کیا پیئے گا -؟"

"ممّا -"

"اور راجہ دلہا کیسے بنے گا بھئی -؟"

"ڈھم — ڈھم — ڈھما -" منا دونوں ہاتھوں سے ہو ہو کے تالیاں پیٹنے لگا۔ اختر زور زور سے ہنسنے لگی۔

اک دم باہر سے عزیز میاں لپکے ہوئے آئے۔ ان کے ہاتھوں میں مسلا مسلا یا پوسٹ کارڈ تھا اور چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ اختر کو یوں بے تحاشہ ہنستا دیکھ کر ان کا منہ کھنچ گیا۔ اپنی ساری طاقت سمیٹ کر وہ بڑی مشکل سے پکارے۔

"اجی کہاں ہو۔ ؟ سنتی ہو۔ !"
وہ بوکھلائے بوکھلائے اختر کی اماں کو آوازیں دینے لگے۔
"جی۔" عارفہ بیگم کھلا سر ڈھانپتے ہوئے، ذرا مسکراتے ہوئے باورچی خانے سے نکل آئیں۔
"ذرا انڈے تلوا رہی تھی، ماما تو جلا کر رکھ دیتی ہے۔ توبہ میری آپ بھی یوں چلانے لگتے ہیں کہ آدمی بدحواس ہو جائے مرا۔" ایک دم ان کے ہاتھ کی طرف دیکھ کر بولیں۔
"کس کا کارڈ آیا ہے۔ ؟"
عزیز میاں کہیں بہت دور سے بولے۔ "سلیمان میاں کہیں تیرنے گئے تھے۔" اختر کے کان کھڑے ہو گئے۔ عارفہ بیگم کا منہ ذرا ذرا کھل گیا۔ میاں رک گئے تو بے تابی سے بولیں۔
"ہاں ہاں تو کیا ہوا پھر۔ ؟"
"آدھی رات کو ان کی لاش گھر لائی گئی۔"
"لاش۔ ؟" عارفہ بیگم نے سوئے ہوئے انداز میں کہا۔ "لاش ؟"
سفید آنچل ان کے سر پہ پھڑ پھڑ کرنے لگا۔ اختر کے ہاتھوں سے دودھ روٹی کا نوالہ چھٹ کر رکابی میں جا گرا۔ اک دم عارفہ بیگم دوڑیں اور اختر سے لپٹ کر بین کرنے لگیں۔
"ہائے میری بچی! ہائے میری دلاری۔ ابھی تیرے سہرے کے پھول کھلے بھی نہ تھے کہ بیوہ ہو گئی۔ ہائے!" ماں کے آنسوؤں سے اختر کا منہ دھل رہا تھا اور وہ سہم کر ماں کو دیکھے جا رہی تھی۔ چند ہی لمحوں میں وہ اس قدر بوڑھی ہو گئی تھیں۔

سلو میاں خود تو قبر کی گود میں جا سوئے اور اختر کے نصیبوں کو روگ لگا گئے۔ اختر گیارہویں سال میں تھی۔ زمانہ ہوا سلو میاں سے نسبت طے پا چکی تھی اور اب تو شادی کی تاریخ مقرر ہونے کی گڑبڑ مچ رہی تھی۔ چھوٹی سی دھان پان سی گڑیا۔ یوں تو گیارہ برس پورے ہونے کو آرہے تھے مگر ذرا بھی سمجھ نہ تھی۔ ساس کی بھی خوشی تھی کہ گڑیا ایسی بہو گھر میں چھم چھماتی چلے۔ ادھر ماں کہتی تھیں۔ "کچھ نہیں تو بٹیا کو ہرا دوپٹہ تو اڑھا دوں۔"

اب لاکھ ننھی تھیں بی اختر، مگر یہ تو سمجھ تھی ہی کہ اپنی نسبت لگ چکی ہے۔ خالہ کے بیٹے سلو میاں کبھی چھوٹی خالہ سے عید بقر عید کو ملنے آتے تو اماں پھٹکارتیں۔

"دوئی لڑکی شرم ہے یا نہیں۔؟ اندر جا کر بیٹھ۔ کیا ہونے والے مرد سے دیدے لڑائے گی۔"

اندر جا کر بیٹھ تو جاتیں، مگر دروازے کی جھری سے آنکھ لگ جاتی۔ "کالی ٹوپی، ناسی رنگ کی اچکن، چست پاجامہ۔ ہائے کیا پیارے شہزادے سے لگ رہے ہیں۔ میں مر جاؤں! اماں نے ان کی پیشانی پر کیسے چٹ سے بوسہ لے لیا۔ لو وہ بیٹھ بھی گئے۔ جانے کیوں ادھر ادھر نظریں دوڑا رہے ہیں۔ اب ایسی بھی کیا شرم! کھئی اماں اتنے چاؤ سے سویاں کھلا رہی تو کھا کیوں نہیں لیتے۔؟"

"اور تو گھر میں سب خیر یت سے ہے خالہ بی۔؟" وہ بڑی شرما شرمی سے پوچھ ہی لیتے۔

خالہ بی کے چہرے پر ہنسی کی لہر سی آتی، مگر وہ سنجیدہ ہو جاتیں۔

"ہاں اللہ کا فضل ہے۔"

"اے لو۔ کیسی مطلب کی بات کرتے ہیں۔ اب بھابی دلہن سامنے بیٹھی ہیں۔ منا وہیں اچھل پھاند رہا ہے، بھیا ساتھ بیٹھے سیویوں میں حصہ لگا رہے ہیں، ابا تو ہوں گے ہی بیٹھک میں۔؟ پھر آپ کس کی خیریت پوچھتے ہیں۔؟ بھئی یہ، واہ، ذرا سی شرم بھی تو نہیں آتی؟" بھابی دلہن جان بوجھ کر اندر آجاتیں اور نند ہونے کے ناطے مذاق کرنے سے کبھی نہ چوکتیں۔

"اے بی یہ جھری سے لگ کر کیوں بیٹھی ہو۔؟"

"ہائے بھابی دلہن، قسم لے لو جو میں نے کسی کو دیکھا ہو۔ مجھے دیکھنے کی ضرورت بھی کیا ہے۔؟ اماں تو پاس بیٹھی خود ہی منہ میں لاڈ سے سیویاں بکھرے جا رہی ہیں، پھر میں....."

"کیوں ری بدذات! تو نے دیکھا نہیں تو آپ ہی آپ یہ عجیب حال کیسے معلوم ہوگیا۔؟"

"اب بھابی دلہن سے کون نبائے! بھلا منگیتر کو دیکھے بنا کیسے رہا جا سکتا ہے۔؟ ہائے اتنے دور سے تو بے چارے عید کو آئیں اور کوئی انہیں دیکھے بھی ناں! ایسا کیا بھابی نے کبھی بھیا کو نہ دیکھا ہوگا۔" وہ جان بوجھ کر ہاتھ ہلانے لگتی کہ چوڑیاں کھن کھنا اٹھیں اور وہ سمجھ لیں کہ اتنی دور آنے کی محنت اکارت نہیں گئی۔ "ہاں جی تمہیں دیکھ لیا ہے۔"

بچپن کی حدوں سے نکل کر جوانی کی سرحدیں داخل ہونے ابھی تھوڑے بہت دن باقی تھے، مگر اکو ماں یہ تو جانتی تھیں کہ سلیمان

سہاگ کے نام سے ان کی کلیاں مہکنے والی ہیں۔ اب جو جاں جوان موت کی خبر ان کے کانوں میں پڑی تو اسی دم وہ کلیاں مرجھا گئیں۔ اتنی دیر میں کتنے خیال آئے اور چلے گئے۔ آنکھ سے ایک آنسو نہ ٹپکا۔
اماں ایسے ہلک ہلک کر رو رہی تھیں۔ "ہائے میری آلو کا کیا بنے گا! ہائے میری لاڈلی۔!"
اماں کو یوں روتے دیکھ اختر کی آنکھوں سے بھی ندی سی امڈ پڑی۔

(۳)

اس دن صبح اختر اپنے بستر پر سے اٹھی تو چھوٹی سی ریشمی رضائی کو لات مار کر دور گرا دیا۔
"اتنی سی رضائی لے کے میرے پلے باندھ دی۔ [illegible] تو پیر باہر نکل پڑتے ہیں۔ پیر ڈھانکوں تو کم بخت سر کھلا رہ جاتا ہے۔" وہ بستر پر سے انگڑائی لیتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی۔ عمارفہ بیگم نے سہم کر سر اٹھایا۔
جوانی یوں چپکے سے کیسے گھس گئی۔؟ ارے بیٹی کی جوانی تو ڈھول تاشے بجاتی آتی ہے۔ پہلے آنکھوں کی پلکیں بھاری اور لمبی ہو جاتی ہیں، پھر آنکھیں آپ ہی آپ جھکی جھکی رہنے لگتی ہیں۔۔ بازوؤں پر صندل کی شاخوں کا گمان ہوتا ہے اور پیر سوتے میں بھی رہیں تو لگتا ہے چلتے ہیں پائلیں سی چھنک رہی ہیں۔
یہ کیسی جوانی ہے خدایا! جو یوں خاموشی سے گھر میں گھس آئی۔

پلکوں کی وہ جھالر چھپی چھپی کیوں تھی ۔؟ آنکھوں میں وہ شرمیلا انداز کہاں تھا ۔؟ بازو صندل کی شاخوں ایسے کب لگے ۔؟ اور تو اور چلتے میں کبھی پائل نہ چھنکی ۔ اور یہ سب کچھ ایک ہی رات میں ہو گیا ۔ راتوں رات اس باغ پر بہار کیسے آگئی کہ کالی آنکھوں پر پلکوں کا پردہ دبیز سے دبیز تر ہو گیا ۔ آنکھیں جھل مل جھل مل قندیلیں سی بن گئیں ۔۔
رہ رہ کر جگمگاتی اور کانپتی سی قندیلیں ! بازوؤں میں رس بھر گیا ۔
یہ سب کچھ کیسے ہوا ۔؟ کب ہوا ۔؟ اور جب اکو ماں بستر سے اٹھ کر حمام تک گئی تو خاموش آواز کے ساتھ یہ چھما چھم کیسی ۔؟ مگر اب بہار کو قید کیسے کیا جا سکتا تھا ۔؟ سرسراتی ہوائیں تو آپ بتا دیتی ہیں ۔

" لو بھئی بہار آگئی ۔۔ بہار آگئی ۔۔ بہار آگئی ۔ ! "

عارفہ بیگم کے ہاتھ کا نوالہ ہاتھ ہی میں رہ گیا ۔ وہ سہمے ہوئے دل سے اس بہار کی منتظر تھیں ۔ بھرے گھر میں یہ ایسی کیسی بہار آئی کہ بجائے خوشی کے دل ڈوبنے لگا ۔

عزیز میاں کے لئے حقہ گرم کر کے بیٹھک میں لے گئیں تو عارفہ بیگم یوں چپ چپ تھیں ۔

" کیا بات ہے ۔؟ " عزیز میاں حقہ گڑگڑا کر بولے ۔

انہوں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور ذرا بے بسی سے بولیں " اپنی اکو ماں سیانی ہو گئی ۔ "

اپنے لگائے ہوئے درخت پر پھول کھلیں ، بہار جھومے تو چہرے پر ہنسی آتی ہی ہے ۔ خوش ہو کر بولے ۔

" اچھا ۔؟ "

عارفہ بیگم نے حیرت سے میاں کو دیکھا۔ "آپ تو یوں مطمئن ہیں، ایسے خوش ہو رہے ہیں جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ میں کہوں یہ کوئی خوش ہونے کی بات ہوئی۔ ؟"

عزیز میاں نے حقہ گڑگڑایا۔

"اور مجھے تو اس میں رنج ہونے کا کوئی تک نظر نہیں آتا۔ بھلا اس میں پریشانی کی کیا بات ہے۔ ؟ اس میں فکر مند ہونے کی کیا بات ہے کہ بیٹی جوان ہو گئی۔ ؟"

عارفہ بیگم نے ترس بھری نگاہوں سے ناداں میاں کو دیکھا۔

"مزدور اپنا بوجھ زمین پر اتار کر خوش ہوتا ہے۔ سر پر دھرا ہے تو اس کی جان کھو کھلی پڑ جاتی ہے۔"

عزیز میاں نے چونک کر بیوی کو دیکھا، پھر خود کو مطمئن بنا کر بولے۔ "وہ تو ٹھیک کہا تم نے، مگر خواہ مخواہ فکر مول لینے سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے بھلا۔ ؟"

"خواہ مخواہ کی فکر؟" وہ درد سے مسکرائیں، "یہ تو اتنی بڑی پریشانی کا سودا ہے۔ میری تو ابھی سے جان آدھی ہوتی جا رہی ہے۔"

"ارے دنیا کی بیٹیاں جوان ہوا کرتی ہیں، مگر کہیں مائیں یوں پریشان ہوا کرتی ہیں۔ ؟ ہم نے تو ایسے موقعوں پر ماؤں کو مٹھائی بانٹتے دیکھا ہے۔ خوشی خوشی عزیز رشتہ داروں کو جوڑتی ہیں، گانا بجانا ہوتا ہے، ہنگامے ہوتے ہیں — اور بات ہے بھی ٹھیک۔ مالی پھول کے کھلنے پر اداس نہیں ہوتا، وہ تو پھولوں نہیں سماتا کہ چلو میری محنت ٹھکانے لگی۔"

"مگر ہمارا بھول ..... " وہ آگے کچھ نہ بول پائیں۔
"ہائے! آپ اتنی بڑی بات بھول رہے ہیں۔ بھلا اس کی شادی کیسے ہوگی۔؟"
عزیز میاں اور زیادہ حیرت زدہ ہو گئے۔
"کمال کی بات ہے! ارے ہماری اکو ماں اتنی حسین، اتنی پیاری ہے کہ اس کے لئے ستر پیام آئیں گے اور ایک سے بڑھ کر ایک آئیں گے۔ بلکہ تمہیں تو یہ پریشانی اور الجھن ہوگی کہ کس کو دوں اور کس کو نہ دوں۔"
عارفہ بیگم نے آنکھوں میں امڈے ہوئے آنسوؤں کو دوپٹے سے پونچھ لیا۔ "کاش ایسا ہی ہوتا۔"
"کاش ایسا ہی ہوتا۔؟" میاں چمک کر بولے، "اس میں یوں رو ہانسا اور آزردہ ہونے کی کیا بات ہے بھئی۔؟ ہوگا اور ایسا ہی ہوگا۔"
مگر آپ اتنی بات بھول رہے ہیں، ہماری اکو کا منگیتر سال بھر پہلے ہی جاں جواں مر چکا ہے۔"
عزیز میاں نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ "ہم چاروں کی کتنی خواہش تھی کہ یہ رشتہ ہو جاتا! ہو تو جاتا، مگر قسمت کو کیا کہہ سکتے ہیں۔! کیسے جوڑ کو جوڑ تھا۔ چاند سورج کی جوڑی تھی۔ مگر عارفہ بی بی خدا کی مصلحت خدا ہی جانے۔ اب کیا کیا جا سکتا ہے سوائے افسوس کے۔!"
دونوں خاموش ہو گئے۔ صرف حقہ کی گڑگڑاہٹ باقی رہ گئی۔
عارفہ بیگم نے خاموشی سے کہنا شروع کیا۔ "کل دلہن بیگم کہہ رہی تھیں

حسینہ بیگم سے ملاقات ہوئی تھی۔"

"پھر۔؟" عزیز میاں نے ذرا تعجب سے پوچھا۔

"ان کا خیال تھا کہ اختر کو اپنے بیٹے کو۔۔۔۔"

عزیز میاں نے مارے خوشی کے حقہ کی نے چھوڑ دی۔" دیکھا۔ میں نہ کہتا تھا کہ اختر کے لئے پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ ابھی دیکھنا اس کے لئے ایک چھوڑ سو آئیں گے۔ ہاں مگر وہ لڑکا کرتا کیا ہے؟ شاید ریلوے میں ملازم ہے۔ بھلا تنخواہ کیا ہے اس کی۔؟"

"ساڑھے تین سو۔" وہ مرے ہوئے لہجہ میں بولیں۔

انہوں نے خوشی خوشی پھر حقہ کی نے پکڑ لی۔" تب تو کچھ ٹھیک ہے۔ آج کل کے زمانے میں ساڑھے تین سو کچھ کم تو نہیں ہوتے اور پھر وہ بی۔اے پاس بھی ہے نا۔"

بیگم کچھ نہ بولیں تو پھر بولے۔

"اور ماشاءاللہ صورت شکل بھی خاصی ہے۔"

وہ پھر حقہ گڑگڑانے لگے۔ عارفہ بیگم ٹھنڈے لہجہ میں بولیں۔

"تو حسینہ بیگم کہہ رہی تھیں کہ لڑکی تو ایسی ہے چاہو تو چاند سورج کے مقابل بٹھا دو۔ مگر ایسی منحوس لڑکی کو اپنی بہو بنا لیں جس نے آگے ہی اپنا منگیتر کھا لیا ہو۔!"

"منحوس۔" عزیز میاں چلائے نے پھر ہاتھ سے چھوٹ گری۔ انہوں نے جیسے اپنے آپ سے کہا۔" جس نے آگے ہی اپنا منگیتر کھا لیا ہو۔!"

کتنی ہی دیر خاموشی رہی، پھر عارفہ بیگم بولیں۔

"بس اتنے دنوں سے مجھے تو یہی ڈبکا لگا ہوا ہے، ورنہ کون بیٹی ایسی ہو گی جسے پیام نہ آئے ہوں۔؟ برے بھلے، کھٹے میٹھے، کیسے ہی بیر ہوں، پتھر تو مارے ہی جاتے ہیں۔ مگر ......"

دونوں نے بڑی بے بس نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ غم نے جیسے ان کے چہروں کی تازگی چھین لی۔ دونوں کی آنکھیں خشک اور بے جان نظر آ رہی تھیں۔

مگر عزیز میاں اور عارفہ بیگم جس بات سے پریشان تھیں وہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔ کیونکہ ابھی مہینہ بھر بھی نہ گزرا ہو گا کہ آکو کے لئے نسبت والے آ گئے۔ لڑکا شہر میں کوئی ملازمت کرتا تھا۔ پچیس چھبیس کے لگ بھگ عمر تھی۔ یعنی لڑکے اور آکو ماں کی عمروں میں آدھوں آدھ کا فرق تھا۔ تنخواہ یہی کوئی دو ڈیڑھ سو کے قریب تھی۔ ماں باپ نے ان باتوں میں سے ایک کو بھی برا نہ جانا۔ چار پانچ برس گزریں گے، دو چار بچے ہو لیں گے تو عمر کا فرق مٹ جائیگا۔ جسم بھاری ہو جائے گا تو خود آکو ماں میاں سے نکلتی ہوئی دکھائی دیگی۔ تنخواہ کا کیا ہے؟ کھانے والی اپنی قسمت سے کھاتی ہے۔ بڑی چھان بین کر کے بھی دو مگر کھانے والی کے نصیب میں نہ ہو تو ہزار ابھی سو کچھ [illegible] اپنے اپنے نصیب کی بات ہے۔

اور خاندان کا کیا پوچھنا پاچھنا تھا۔ مسلمان تھے [illegible] تھے۔ یہی بس تھا۔ منگنی کے وقت انگوٹھی پہنانے جب انھوں نے لڑکی دیکھنے کی خواہش ظاہر کی تو گو کہ یہ عین ناممکن سی بات تھی (بھلا شریفوں میں کہیں یوں بیٹیوں کی صورت شکل دکھائی جاتی ہے

پھر بھی عارفہ بیگم نے مصلحت اسی میں جانی کہ چپکے سے دلہن کی شکل تباہی دیں، ورنہ کل کلاں کو وہ کہنے کو بیٹھیں گی۔

"سبھی کیا شادی کرنے۔؟ لڑکی کی ایک جھلک تو نہ بتائی۔ اب ہم کیا جانیں کیا بھید تھا جو بیٹی چھپائی گئی۔؟ اے کیا ہم مرد تھے کہ بٹیا کو کولتے ہیں لے جا کے بٹھا دیا۔؟"

بیٹی کی شکل جس نے دیکھی اس کے منہ سے "ہا" نکل گئی۔ کسی منہ پھٹ نے تو منہ پھوڑ کے پوچھ بھی لیا۔

"اے ایسی چاند سی صورت پر اتنی عمر ہو گئی۔؟"

عارفہ بیگم نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

"دو ہائی بہن چاند سی صورت کا کیا ہے۔؟ بیٹی سیانی ہوتی تھی وداع کرنے تاک لے کے یوں ہی کبھی ہنڈیا دستر خوان پر برت دیتے ہیں۔ اور اتنی کم عمری میں ان کے باوا کی مرضی بھی نہیں۔"

سمدھیانے میں لوگ یوں ہاتھ لمبے کر کر کے لڑنے بھڑنے کو تو جانتے نہیں ہیں۔ چپ رہ گئے۔ مگر عارفہ بیگم کے جی کو ادھر کھٹکے لگ گئے۔

"نکاح خوانی کے چار بول جب تک نہ پڑھائے جائیں، میرا جی تو یوں ہی ہٹکے گا۔ پھر بعد کو نیک بخت پر جو بھی گزرے سو گزرے۔"

"کیوں کیا ہوا۔؟" میاں ہڑبڑا کر بولے۔

"ہوتا کیا۔؟ بٹیا کی صورت دیکھی تو وہیں سامنے ہی چہ میگوئیاں ہونے لگیں کہ ایسی چاند سی صورت والیاں تو پنگوڑے میں ہی دوسرے کی ہو جاتی ہیں اور یہ تو اتنی بڑی ہو گئیں کہ چلنے میں زمین ہلا رہی ہیں۔"

عزیز میاں کھسیا کر بولے۔

"ہونہہ! بکنے والوں کو بکنے دو۔ شادی ہو جائے گی تو آپ ہی سبھوں کے منہ بند ہو جائیں گے۔"

سمدھیانے والوں نے جب بنارسی سرخ دوپٹہ اڑھا کر انگوٹھی پہنائی تھی تو بنا، سنگار پٹار کے اختر کی صورت ایسی چاند ایسی چمکنے لگی کہ سبھی لوٹ پوٹ ہو ہو گئیں اور جاتے جاتے بول گئیں۔

"دولہن میں جلد ہی اپنی بہو کو بیاہ لے جاؤں گی۔ ایسے اجالے تو میرے گھر میں ہونے چاہئیں نا بہن۔؟" وہ عارفہ بیگم سے مخاطب تھیں

"ہاں بہن۔ آپ ہی کی لڑکی ہے، جب بھی لے جائیے بیاہ ہے اسی وقت۔"

"ناں بہن، اس وقت کہاں لے جا سکتی ہوں۔؟ ابھی تو بیٹے کو چھٹی نہیں ملی۔ ورنہ میرا بس چلتا تو ساتھ ہی لے کر چلی جاتی۔"

کہاں تو ہوا اتنی پیاری تھی کہ بار بار دروازے میں سے پلٹ پلٹ کر دیکھتی تھیں اور جلد سے جلد اٹھا لے جانے کا جتن تھا یا اب دو مہینے چھوڑ چھ مہینے گزر گئے اور کوئی ٹھور ٹھکان ہی نہیں۔ ایک ایسی ہی مل گجی سی شام کو سمدھیانے کا آدمی ایک پرچہ پکڑا گیا۔

بہن صاحبہ۔!

آداب عرض۔ ہم تو بیٹی کی پیاری شکل دیکھ کر تبھی چونکے تھے کہ ضرور دال میں کالا ہے، مگر آپ نے بات کی تہہ تک نہ جانے دیا۔ وہ تو بھلا ہوا کہ ہمیں پہلے ہی پتہ چل گیا کہ صاحبزادی منحوس ماری ہیں۔ اپنے منگیتر کو کھائے بیٹھی ہیں۔ ورنہ جانے ہمارے

گھر کا کیا حشر ہوتا - بہن آخر آپ کے دل میں بھی دیا محبت تو ہوگی ہی، پھر آپ اپنی اولاد کے لئے دوسرے کی اولاد کا برا کیوں چاہتی ہیں - ؟ آپ کے رویہ سے ہمیں سخت تکلیف پہنچی ہے ۔ وہ تو اللہ بھلا کرے ان بے چاروں کا جنہوں نے ہماری معلومات میں اضافہ کیا اور صورتِ حال سے مطلع کیا، ورنہ ہمارے گھر بھی الو بول جاتا - ہمیں سب کچھ پتہ چل گیا ہے ۔

امید ہے کہ آپ ہمارا سرخ دوپٹہ اور سونے کی انگوٹھی، جو پورے سات ماشے کی تھی، واپس کر دیں گی -

آپ کی بہن، سلطانی بیگم

پرچی ہوا کے زور سے اڑی، دیواروں سے سر ٹکرایا، برآمدوں میں گھومتی پھری - دالانوں میں رکی اور پھر ہوا کے ایک زناٹے دار جھکڑ کے ساتھ اکو ماں کی گود میں جا پڑی -

" ہمیں سب کچھ پتہ چل گیا ہے - ! "

" ہمیں سب کچھ پتہ چل گیا ہے - !! "

" ہمیں سب کچھ پتہ چل گیا ہے - !!! "

ہواؤں نے زور باندھا اور چلائیں -

" صاحبزادی منحوس ماری ہیں - ! "

" دیواریں سرگوشیاں کرنے لگیں -

" صاحبزادی منحوس ماری ہیں - ! "

دالان، پیش دالان، برآمدے خاموش آوازوں سے چلانے لگے۔

"ہاں بیچ ـــ صاحبزادی منحوس ماری ہیں۔!"
بی بی نے گھبرا کر میاں کی صورت دیکھی۔" میں نہ کہتی تھی کہ اب زندگی نے آزمائش شروع کر دی ہے۔!"
میاں کچھ نہ بولے۔ بولنے کو تھا بھی کیا۔؟
"جانے ہم سے کون سا گناہ سرزد ہوا ہوگا جو یوں مارے جا رہے ہیں۔" عارفہ بیگم تھکی ہاری سانس لے کے بولیں۔
"سکھ دکھ سب اسی کی دین ہے بی بی، برداشت کرو۔" عارفہ بیگم کے آنسو بہہ اٹھے۔
"نہیں ہوتا برداشت۔ بالکل نہیں ہوتا۔ کھایا پیا انگ نہیں لگتا۔؟ راتوں کی نیند اڑ گئی۔ دل کا چین، آرام مٹ گیا۔ ہائے میری معصوم بچی۔!"
"برداشت کرو بی بی، برداشت کرو۔ اوپر والے کے پاس انصاف ہے۔ ہاں دیر ہے مگر اندھیر نہیں۔ برداشت کرو۔!"

(۳)

دوسرے دن عارفہ بیگم روز کی طرح صبح صبح چائے کی پیالی لے کر میاں کے بستر کے پاس گئیں تو وہ روز کی طرح بی بی کے قدموں کی چاپ سنکر اٹھ کر نہ بیٹھے۔ بی بی نے کندھا پکڑ کر ہلایا۔

"چائے لیجئے۔ کلی کا پانی بھی یہاں رکھے جا رہی ہوں۔"
عزیز میاں منہ اندھیرے ہی اٹھا کرتے تھے۔ پاس والی مسجد میں جا کر نماز پڑھ کر آتے۔ منجن مل کر دانت صاف کرتے، منہ ہاتھ دھوتے، پھر قرآن شریف لے کر بیٹھ جاتے۔ پارے دو پارے پڑھ کر وہیں پلنگ پر لیٹ جاتے۔ سورج کی کرنوں کے ساتھ ادھر چولہے بھی جل جاتے۔ بی بی میاں کو سوتا پا کر جلدی جلدی خود اپنے ہاتھوں چائے تیار کرتیں اور چائے کی پیالی اور کلی کے لئے پانی لے کر جگانے آتیں۔ نیند گہری ہوتی تو وہ پانی اور چائے کی پیالی وہیں پٹی کے سرہانے دھر کر چلی جاتیں۔ پانچ دس منٹ کے بعد پھر آواز دیتیں۔
"اے اٹھئے بھی۔ ٹھنڈی پالا ہو جائے گی تو کیا مزہ آئے گا۔"
وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتے۔
آج بیٹھے بیٹھے انہوں نے آواز دی۔ "اجی اٹھئے بھی۔"
مگر میاں یوں ہی سر سے پیر تک رضائی اوڑھے پڑے رہے۔
پانچ، دس، پندرہ، بیس منٹ چھوڑ گھنٹہ گزر گیا۔ بی بی اٹھیں اور ذرا الجھ کر بولیں۔
"دوئی ایسی بھی کیا نیند کہ جوانوں سے بڑھ کر ہو گئی۔ اس سے جلد تو ظہیر میاں اٹھ جاتا ہے۔"
قریب آ کر زور سے شانہ ہلایا پھر بھی نہ اٹھے تو منہ پر سے رضائی کھینچی۔ بڑی مشکلوں سے رضائی کھینچ سکیں۔ وہ منہ پر جھکیں۔
"دوئی کم بخت چائے تو دیکھئے کہ . . . . ."
مگر الفاظ ان کے منہ میں ہی رہ گئے۔ اک دم وہ چلانے لگیں۔

"ارے دیکھو تو ــــ سنو تو ــ یہ تو بولتے ہی نہیں ۔!"
بٹیا، بیٹی اور بہو دوڑتے ہوئے آئے ۔ رضائی الگ کرکے
دیکھا کہ ابا میاں ہمیشہ کے لئے سو چکے ہیں ۔

(۴)

جیسا وقت عارفہ بیگم پر پڑا، خدا دشمن پر نہ ڈالے ۔ امیر گھر کی
لاڈوں، نازوں میں پلی اکلوتی اولاد تھیں ۔ بھلا گھر میں کس بات کی کمی
ہوگی ۔؟ شادی ہوکر سسرال کو آئیں ۔ میاں بھی اللہ کا فضل تھا ۔
بڑی ساری زمینداری تھی ۔ اگر روپوں کو کھوندلتی نہ چلتی تھیں ۔
تو یہ بھی نہ تھا کہ پیسے کو ترستی ہوں ۔ ہزاروں سے اچھی حالت تھی ۔
پھر سسر مرے تو جائداد کا بٹوارہ ہوا ۔ تین دیور، دو
جیٹھ ۔ ساس، نندیں ۔ سب کے حصے بخرے لگے ۔ پھر بھی خوش تھے ۔
یوں کہ اپنے آگے اپنی دال روٹی ــــ وہی بس تھی ۔ اگر دل کو اطمینان
اور سکون میسر رہے تو دال روٹی تو پھر بھی اچھی بات ہے فاقے
بھی برے نہیں لگتے ۔ اور اطمینان وسکون کیوں نہ ملتا ۔؟ میاں
دل وجان سے واری ۔ اولاد بھی اللہ نے دے رکھی تھی ۔ ایک
بٹیا، ایک بیٹی ۔ زندگی سکون سے گزرتی تھی ۔ گھر کی آمدنی تو تھی ہی
جوان ہوئے تو بیٹے ظہیر میاں بھی نوکری سے لگ گئے ۔ یہیں بڑے
زمیندار خلیل خاں کے کاموں کی دیکھ ریکھ کرتے تھے ۔ ڈھائی سو
دو سو ان کے بھی آتے تھے ۔ بٹیا جوان ہو تو ماں باپ کو اپنے دکھ درد

بھول جاتے ہیں۔ اور پھر کلائو پوت بھی ہو تو پھر گھر میں خوشیوں کی بھری برسات برسنے لگتی ہے۔

مگر یہ تو پیدا کرنے والا ہی جانتا ہے کس کے نصیبوں میں کیا بدا ہے بیٹی کی نسبت بھی بچپن ہی سے خلیری بہن کے بیٹے سے لگی ہوئی بیٹی بیٹے کی شادی جٹھانی کی بیٹی سے ہو چکی تھی کسی بات کی، اگلی پچھلی کی فکر نہ تھی۔ اطمینان سے بیٹھے تھے کہ بیٹی جوان ہو گی تو بہن اٹھانے آئے گی۔ گھر میں جی بہلانے کو پوتا تھا اور دوسرے کی آمد آمد تھی۔

مگر بیٹھے بٹھائے یہ ہوا کہ داماد سہرا اپنا باندھنے سے پہلے ہی کفن لپیٹ بیٹھے۔ بھرے گھر میں دھول اڑ گئی۔ جوان بیٹی کا ساتھ اور سارے میں یوم ہو گئی کہ منحوس ماری ہے۔ برے بھلے میں دل کو سہارا دینے والے میاں تو سنگی ساتھی تھے، سو وہ بھی ان دکھوں کو سہار نہ پائے اور چپکے سے آنکھیں موند کر ایسے سوئے کہ پھر کبھی تو نہ اٹھے۔

"اب کیا ہوگا۔؟" عارفہ بیگم اپنے آپ میں بس یہی سوچے جاتیں اور کڑھتی جاتیں۔ میاں کا چالیسواں ہوتے ہوتے اس کڑھاپے نے انہیں بڑھاپے کی آخری سرحد پر لے جا کر بٹھا دیا۔ آنکھیں سیاہ گڑھوں کے اندر چلی گئیں۔ ناک کا بانسا نکل آیا۔ ہاتھ پیر جھولا ہو گئے دیکھ کر ترس آتا۔ اگر اکو ماں کا ساتھ نہ ہوتا تو حالت اتنی تباہ نہ ہوتی اور اکدم سے اتنی بوڑھی نہ ہو جاتیں۔ مگر اب تو بھرے گھر میں کوئی چھایا ہوا تھا تو بس اکو ماں۔ بیٹیوں کی جوانیاں تو پونم کا چاند ہوتی ہیں جو بادل کی اوٹ میں رہے یا نہ رہے چمکے ہی جاتا ہے۔ بادل نہ ہو تو پھر تو

کیا کہنا، صاف سیدھی طرف آسمان پر جگمگاتا رہتا ہے۔ مگر کالی سیاہ بدلیاں ڈھانپے رہیں پھر بھی اندر سے جھلک مارتا ہی ہے۔ ایسے چاند کو کون سی بدلی ڈھانپنے کا حوصلہ کرے جس نے اپنے پورے پندرہ دن پورے کر لئے ہوں۔؟

اتنے دن ہو گئے تھے، کوئی تو نہ ملتا۔ جہاں وہم، وسوسے اور اندیشے گھیر لیں وہاں نہ بیٹی کی خوبصورتی کام آئے نہ روپیہ پیسہ؛ سلیقہ کام آئے نہ تعلیم تربیت۔ عارفہ بیگم کھاتے پیتے بیمار ہو گئیں۔ سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے، ہنستے روتے بس یہی فکر، یہی دھن گھن کی طرح کھائے جاتی۔

"اکو ماں کا کیا ہوگا۔؟ اکو ماں کا کیا بنے گا۔؟"

یہ گت تو انہیں آج کل سے نہیں اسی گھڑی سے نظر آ رہی تھی جب سے کہ سلو میاں جان جوان اس دنیا سے سدھار گئے تھے۔ کوئی ننھی سی امید کی کرن پھر بھی باقی تھی ہی جو بھرے اندھیرے میں اجالا کرنے کو کافی تھی۔؟ وہ میاں کا ساتھ تھا، مگر وہ کرن بھی جلتی بجھتی آخر کو دم توڑ گئی۔

سسرے کی موت نے دلہن بیگم کو شیر بنا دیا۔ پہلے یہ تھا کہ زمینداری کی آمدنی اور ظہیر میاں کی تنخواہ مل جل کر آتی اور گھر کا خرچ چلتا تھا اور بغیر کسی چپقلش کے گزر ہوتی تھی۔ اب بھی وہی حال تھا، مگر ادھر عزیز میاں کیا مرے کہ دلہن بیگم نے یہ فرض کر لیا کہ گھر کی ساری ضرورتیں بس میرے میاں کے پیسے سے پوری ہو رہی ہیں۔ اور یہ خیال جوان کے دل میں جڑ پکڑتا گیا تو انہوں نے

ساس نند کے ذلیل چھید ڈالے میاں کا دل پھیر دینے میں کوئی جتن نہ اٹھا رکھا۔ باپ کی موت پر جائیداد بیٹے کو ملنی ہی تھی۔ اور ملی بھی، اب ماں بہن کا کیا رہ گیا تھا۔ بس دو وقت کی روٹی اور تن بھر کپڑے کی حقدار تھیں۔ وہ بڑے کھلے مل جاتا تھا، نہ بھی ملتا تو کیا کر لیتیں۔ اختر سے اگر کوئی چیز غلطی سے گر پڑ جاتی تو منہ زور جوانی کو طعنے پڑتے۔

"دو ئی بی دیکھ کر نہیں چلتیں۔ یہ ٹکر بی مارتی کیوں چلتی ہو؟ دودھ کا پیالہ گرا دیا۔ اب رات کو منا روئے گا تو کیا پلاؤں گی۔ تمہارا خون۔؟"

اس پر بس ہوتا تو سہارا جا سکتا تھا، مگر کنواری نند کو ایسے طعنے دینے بھی نہ چوکتیں۔

"مری توبہ! اتنی زور سے ٹھوکر ماری کہ دہلیز کی مٹی اکھاڑ دی۔ یوں جوانی زور پر آئی ہوئی ہے تو جا کر میاں سے کشتیاں کیوں نہیں لڑتیں۔؟"

عارفہ بیگم سہم کر بولیں۔ دلہن بیگم کنواری بٹیا کے سامنے خدا کے لئے ایسی گمراہ کن باتیں مت کیا کرو۔ وہ کیا سوچے گی۔؟"

"اے لو۔ سنو! گمراہ کن باتیں! جیسے تمہاری بٹیا تو بڑی بھولی ہے نا۔ کبھی سہیلیوں سے گھنٹوں سر جوڑے کیا باتیں ہوتی ہیں۔؟ کوئی جانتا ہی نہیں جیسے۔!"

"تمہارے آگے بھی اولاد ہے دلہن بیگم، یوں جھوٹے الزام نہ تراشو۔ کون اس کی ڈھیر ساری سہیلیاں جڑی ہوئی ہیں کہ وہ باتیں

مٹھارے گی۔؟"

دلہن بیگم کو قرار نہ آتا۔ ننھے بچے کے منہ میں چھاتی گھسیڑتے ہوئے بولیں۔

"اب کیا سنائیں کیا کیا دیکھتے ہیں۔ میرے بچوں کو یوں بھینچ بھینچ کر پیار کرتی ہے کہ بس منہ میں چھاتی دنیا باقی رہ جاتا ہے۔ بے چاری کرے بھی کیا۔؟ بچوں کے لئے دل چاہتا ہوگا، مگر ماں نے تو کولہے سے لگا کر بٹھا رکھا ہے۔ اس کے ارمان نکلیں بھی کیسے۔؟"

اختر کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔ "بھلا کون پھوپھی ہوگی جو اپنے بھتیجوں سے پیار نہ کرتی ہوگی۔؟ بھلا کیا میں اس لئے پیار کرتی ہوں کہ میرا جی ماں بننے کو ترستا ہے۔؟" دلہن بھابی اتنی گہری اور گھنی ہیں، اسے آج پتہ چلا۔ اماں تو ادھر سن ہی رہ گئیں۔

"دلہن بیگم، خدا کے لئے یوں اپنا آپ بھول کر بات مت کرو۔ بھلا کہیں کنواری نندوں کو یوں طعنے دیئے جاتے ہیں۔؟"

"اے لو، طعنے دیئے ہی کس کم بخت نے ہیں۔؟ جو حقیقت تھی وہ بیان کر دی۔ ایسی ہی کڑوی حقیقت طعنے بن بن دل چھیدتی ہے۔ تو بیٹیا کے ہاتھ پیلے کیوں نہیں کر دیتیں۔؟" دلہن بیگم نے جلتے بھنتے صاف طعنہ مارا۔

"پیدا کر لے والے نے غم دیا ہے بی بی، خوشی بھی وہی دیگا۔!"
عارفہ بیگم ٹھنڈی سانس لے کر رہ گئیں۔

اکو ماں اب تک عمر کے ایسے دور میں تھی کہ جوانی کا احساس تو تھا، مگر اپنے مقدر کی تباہی کو اس سنجیدگی سے نہ سوچا تھا۔ اس کے

سجائے تو یہ کوئی بات ہی نہ تھی کہ کنواری بیٹھی ہوں۔ سب ہی لڑکیاں ایک خاص عمر تک کنواری رہتی ہیں اور پھر ایک ایک دن دلہن بن جاتی ہیں اور پھر سہاگن کہلاتی ہیں۔ دیر سویر سب ہی پہ یہ سب کچھ گزرتی ہے، مگر بھاوج کے آئے دن کے طعنوں نے تو اس کے خوابیدہ جذبات میں ہل چل سی مچا دی۔ رہ رہ کر وہ اپنے سراپے کو آئینے میں جا جا دیکھتی اور سوچتی۔ "ہائے میری برات کب چڑھے گی۔؟"

اور یہ بات تو اس پر کھل ہی چکی تھی کہ منگیتر کی موت نے اسے سارے میں منحوس قرار دیدیا ہے۔ پھر کون ایسا جی گردے والا تھا۔ کہ دیکھتے بھالتے اپنے بھرے پرے گھر کی تباہی کے لئے منحوس کو بیاہ لے جاتا۔ اسامنے ہی بوڑھی ماں تھیں جو ہر لمحہ موت کی طرف لپک رہی تھیں۔

"میں نہ ہوتی تو اماں کو یہ غم کیوں کھاتا۔؟" غم کو ہلکا کرنے کا واحد طریقہ دونوں ماں بیٹی کے پاس یہی تھا کہ آنسو بہائیں، اور اب تو وہ حد آ رہی تھی جہاں آنسو بھی ساتھ چھوڑ جاتے ہیں۔

ایک دن ماں نے بیٹے سے سہمے سہمے کہا۔ "بٹیا ظہیر میاں جوان بہن کا بوجھ سر پہ ہے۔ تمہیں فکر نہیں ہوتی۔؟ کوئی پیام ڈھونڈ دو نا، آخر کب تک کنواری کو بٹھائے رکھو گے۔؟"

ظہیر میاں نے نوالہ اٹھاتے اٹھاتے ماں کو دیکھا اور سنجیدگی سے بولے۔ "ہاں اب ہر گھر پر جا کر دستک دونگا اور کہوں گا کہ بھئی میری ایک جوان بہن ہے، تمہارے ہاں کوئی لڑکا ہو تو میری بہن کو کر ڈالو نا۔!"

ماں نے حیرت اور بے بسی سے بیٹے کو دیکھا۔

"دوئی بیٹیا ایسی جلی کٹی باتیں کاہے کو کرتے ہو۔ میں نے بھلا یوں کب کہا۔ ؟"

"اور آپ کا مطلب کیا ہے۔؟ بس مجھے اتنا ہی کام تو رہ گیا ہے کہ شاطر بن کر پیام ڈھونڈتا رہوں۔ انسان دیکھ کر بات کی جاتی ہے۔ بھلا کیا لڑکے بازاروں میں مولی گاجر کی طرح بکتے ہیں کہ گئے اور سیر دو سیر تلوا لائے۔"

"میں نے ایسا تو نہیں کہا میاں۔! ہاں ذرا خیال دلانے کی بات تھی۔ میری بیٹی ہے تو تمہاری بھی تو بہن ہے۔ تمہارے آس پاس دوست احباب تو ہوں گے ہی۔ خاندان کی بات ایسی ہے کہ سب ہی جانتے ہیں کہ سلو میاں کی جوان موت سے اکو ماں پر یہ قہر ٹوٹا۔ باہر والوں کو مشکل ہی سے پتہ چل سکتا ہے۔ اگر کسی سے کہہ سنکر بات لگوا سکو تو اچھا ہی ہے۔ تمہارے چچا تایا کی اولادیں، یا تو شادی شدہ ہیں یا پھر اکو ماں سے چھوٹی، ورنہ میں آپ ہی منہ پھوڑ کر بول دیتی کہ میری بیٹی کو اٹھا لو۔"

"بھلا میرے دوستوں میں کون اس لائق ہے؟ ابا میاں کوئی ایسے ویسے آدمی تو تھے نہیں، ہماری برابری کا کون ہے۔ ؟"

اماں نے دبی زبان سے کہا۔

"شکور میاں تو مجھے بھلے خاصے دکھائی دیتے ہیں۔ یہ برابری ورابری کا سوال اٹھا پھینکو بیٹے۔ بس شادی ہو جائے، یہی غنیمت ہے۔ لاکھ تمہارے باپ کا نام بڑا تھا، مگر شکور میاں کے باپ بھی

کون گرے پڑے ہیں۔! بس غریبی سے مارے گئے، ورنہ خاندان تو ایسا ہے کہ کوئی کھوٹ خرابی نہیں۔ اور میرے خیال سے شکور میاں کی تنخواہ چار سو سے کیا کم ہوگی۔؟"

"اماں۔!" ظہیر میاں ہاتھ روک کر بولے، "پہاڑ کتنا بھی اونچا رہے، آسمان سے نیچا ہی رہتا ہے شکور میاں لاکھ امیر کبیر ہو جائیں۔ ہماری ساکھ کو کیا پہنچیں گے۔ میں کب نہیں کہتا کہ کھاتے کماتے نہیں ہیں۔ مگر ان کی خود ہی ہمت نہ پڑے گی کہ اس گھر میں پیام لے جائیں جہاں سے ان کی روزی بٹتی تھی۔"

"روزی بٹتی تھی تب بٹتی تھی، اب تو اللہ نے ناک اونچی کردی ہے۔ کہنے والے یہی کہیں گے نا کہ عزیز میاں کی بی بی نے اپنی بیٹی فقیروں میں دے دی، سو کہتے پھریں۔ ہماری بیٹی تو خیر سے اٹھ جائے گی۔

کسی زمانہ میں جب عزیز میاں کا بول بالا تھا تب انہوں نے رحیم بیگ کے بیٹے شکور میاں کے لئے وہ کچھ کیا جو ایک باپ ہی اپنی اولاد کے لئے کرسکتا ہے۔ محلے ٹولے کے بچے اسکول جاتے تو شکور میاں سِسک سِسک روتے۔

"میں بھی اسکول جاؤں گا۔ میں بھی پڑھوں گا۔"

اسکول جانے کے لئے کتابیں لگتی ہیں، فیس لگتی ہے، اچھے کپڑے لگتے ہیں اور یہ سب ان کے پاس کہاں تھا۔؟ یوں ہی ایک دن عزیز میاں رحیم بیگ کے ہاں بیٹھک میں بیٹھے تھے کہ اندر سے دھنا دھن مارنے کوٹنے کی سی آواز آنے لگی۔

"یہ آواز کیسی ہے۔؟" وہ حیرت سے ادھر اُدھر دیکھ کر بولے۔
رحیم بیگ ہنسے۔ "بی بی باجری کے بھٹے ٹھونک رہی ہیں۔"
"ہاں۔؟ اس موسم میں باجری کے بھٹے کہاں سے آئے۔؟" وہ حیرت سے بولے۔"

"اجی جناب لونڈے نے دھوم مچا رکھی ہے کہ اسکول میں ہی پڑھوں گا۔ اس کا باپ کوئی رئیس اعظم تو ہے نہیں۔ سالا پڑھے کیسے۔؟ روز وہی سبق دہراتا رہتا ہے اور کبھی ماں سے پٹتا ہے اور کبھی باپ سے۔"

عزیز میاں غصے سے بولے۔ "خود جاہل رہے، اولاد کو بھی جاہل رکھو گے۔؟ داخل کر کیوں نہیں دیتے۔؟ ایسی کون جاگیر چلی جائے گی۔ اس کی پڑھائی میں۔؟"

شکور میاں اسکول میں داخل کروا دیئے گئے۔ مہینے کے مہینے چپکے سے فیس، کتابیں، کپڑے، قلم اور کاغذ، سب کچھ پہنچ جاتا۔ باپ کو کبھی پریشانی کا احساس ہونے ہی نہ پایا۔ وہ تو اچھا تھا کہ اختری کی نسبت بچپن ہی سے خالہ زاد بھائی سے طے تھی ورنہ لوگوں نے پہلے تو ٹوہ لگا کر یہی افواہ اڑائی چاہی کہ۔

"میاں جی بٹیا کے لئے بر ڈھونڈ رہے ہیں۔!"

ایک درجے سے دوسرا درجہ، دوسرے سے تیسرا، تیسرے سے چوتھا اور پھر وہ دن آیا کہ شکور میاں نے ایم۔ اے پاس کر لیا۔ اور اب تو وہ سوٹ بوٹ میں دکھائی دیتے تھے اور مہینے کے ختم پر ساڑھے چار سو کے کرکرے نوٹ جیبوں میں ٹھونسے گھر آتے شہر میں گورنمنٹ

سروس میں تھے۔ ماں باپ کی خوشیوں کا کیا پوچھنا تھا۔؟
شکور میاں تھے تو باپ کی اولاد، مگر اپنے باپ کی ذرا تو خو بو نہ تھی۔ باپ جھکی ہوئی ڈال تھے، جس سے ملیں گے جھک کے بیٹے سدا اکڑے اکڑے رہتے۔ عارفہ بیگم کو خالہ بی خالہ بی بولتے تھے۔ اب بچپن سے ہی آنا جانا ہو تو کون پردہ کرتا ہے۔ نہ خالہ بی سے پردہ تھا نہ اکو ماں سے۔ اب تو وہ شہر میں نوکر ہو گئے تھے۔ حکومت کی طرف سے بنگلہ بھی ملا ہوا تھا۔ کبھی ماں باپ سے ملنے گھر آتے تو خالہ بی سے ملنے چلے آتے تھے۔ کوٹ پتلون اڑائے ہوئے۔ اونچے، پورے وجیہہ، شکیل۔ اپنے میں آپ مرے جاتے مگر نگاہ نیچے کی اوپر نہ ہوتی۔ کبھی اختر سامنے سے گزرتی تو یوں چھچلتی نظروں سے دیکھ لیتے جیسے بڑا بیگا ڈال رہے ہوں۔ نہ چہرے پہ مسکراہٹ، نہ کوئی ہنسی کی جھلک۔ وہ سلام کرتی تو نظریں چرا کر جواب دیتے۔
"آداب عرض۔!" معاملہ ختم۔
بھلا عزیز میاں اور عارفہ بیگم کو پڑی بھی کیا تھی کہ ان کے اس سلوک کا برا مناتے۔ ہاں کبھی اگر بیٹی دینے دلانے کا سوال ہوتا تو ایک۔ اب بھی تھی، مگر وہ تو بیا ہی جیسی تھیں۔ مگر اب تو عارفہ بیگم کو شکور میاں کے رنگ ڈھنگ کھل کھل جاتے۔ ان کے تو سارے گھرانے کو پتہ تھا کہ بٹیا کی بچپن کی نسبت ختم ہو گئی ہے۔ منحوس تھیں یا مبارک تھیں جیسی بھی تھیں، تھیں تو ان کے محسن کی بیٹی۔ کیا جاتا اگر دلہن بنالے جاتے۔؟ مگر وہ تو ایسے بادشاہ بن بیٹھے تھے۔
اس دن بھی، کہ بڑے دنوں کی تعطیل میں گھر آئے ہوئے تھے۔

خالہ بی سے ملنے چلے آئے۔ بیٹھے خالہ بی سے باتیں کر رہے تھے کہ اختر اندر سے پان لیے آئی۔ دھان پان سا جسم۔ گوری گوری رنگت۔ آنکھیں نیلی، چمکیلی بجلیاں سی۔ شاید نہا کر اٹھی تھی کہ بال شانوں سے گر کر سارا پیٹھ پر چھپلے ہوئے تھے۔ ایسے میں آکر ہلکی سی مسکراہٹ سے [illegible] سلام کیا تو کون جی والا تھا کہ مر نہ مٹتا۔ مگر وہ شکور میاں کہ ایک ہی نگاہ کر دیکھا اور دوسرے ہی لمحے گھبرا کر یوں نگاہیں ہٹا لیں جیسے اگر تھوڑی دیر اور دیکھتے رہتے تو نگاہیں جل ہی جاتیں۔

ایسے ڈھنگ ہوں تو کوئی کیا آس باندھ سکتا ہے۔؟

بیٹے اگر کسی لڑکی پہ ریجھ جائیں اور اڑ کر بیٹھ جائیں کہ انہیں سے بیاہ کروں گا تو بس اسی سے" تو ماں باپ لامحالہ ہار جاتے ہیں۔ مگر ماں باپ کسی بیٹی کو پسند کر لیں اور بیٹے کی جان کو آ بیٹھیں تو بات [illegible] بنتی۔ زندگی تو بیٹے بہو کو گزارنی پڑتی ہے۔ اگر بنا مرضی کے بیٹے ڈھول لا کر باندھ بھی دیا تو وہ بجائیں گے کاہے؟ کون جانے رحیم بیگ اور ان کی بی بی نے دل ہی دل اختر کو بہو بنانے کے بارے میں سوچا بھی ہو مگر شکور میاں کے تیور بتاتے تھے کہ وہ تو بس خاموش ہی رہیں گے

اتنے پر بھی ہمارے بیگم خاموش نہ ہوئیں۔ مانا کہ اختر کی اور [illegible] دل پہ چڑھ بیٹھی ہو گی مگر پھر بھی شادی ہو جائے گی اور چار بال بچے ہو جائیں گے تو خود ہی دل میں سما جائیں گے۔ گھر بسا [illegible] تو پھر منہ نہیں پھیرا جاتا۔

بڑے بھیا نے پوچھا بھی، خود ظہیر میاں کے دوستوں نے بھی ٹوہ لگائی۔ مگر کچھ پتہ ہی نہ چل سکا۔ وہ تو ہونٹ سیے بیٹھے تھے۔ نہ یہ نہ

چلا کہ مرضی ہے یا نہیں، نہ یہ پتہ کہ پھر آخر کس سے کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ بس منہ سے کچھ پھوٹتے ہی نہیں! عجب کم بخت لوگ ہیں۔

اختر بی بی کے نصیبوں کا یہ ستارہ بھی ایک جھلک دکھلا کے چمکا اور پھر ڈوب گیا۔

(۵)

بھاوج تو چاہتی تھیں کہ جیسے بنے نبیسے نند اس گھر سے ٹلے۔ ان کی چلتی تو کسی بھک منگے کو اٹھا کر دے ڈالتیں۔ مگر قسمت سے کوئی بھک منگا بھی تو نہ ملتا۔ بھائی جیسے بھی تھے، جو چیز لاتے دونوں کے لئے چاہے وہ کھانے پینے کی ہو یا اوڑھنے پہننے کی۔ انہیں یہ حصہ داری بھلا کاہے کو بھاتی۔؟

"دوئی بہنیں اپنی عمر یں یوں بھائیوں کے گھر نہیں نبا یا کرتیں۔ اتنی عمر میں تو ہم لے دو بچے پیدا کر لئے تھے، اور حمل ساقط ہوا وہ الگ محلے ٹولے میں شادیوں کا موسم آتا تو آئے دن دعوتیں آتیں۔ نہ جائیں تو رشتے ناطے کیسے باقی رہیں۔؟ ورنہ مغرور گنائے جائیں۔ جانا ہی پڑتا۔ اختر بی پڑھی لکھی، گنوں بھری، اور پھر عزیز میاں زمیندار کی بیٹی۔ اوپر اوپر جھیلی جاتیں۔ گھر والیاں ان کے ذمہ میں سارا کام لگا دیتیں۔ دلہن کا سنگھار بھی وہی کریں۔ دان دہیز بھی لوگوں کو وہی بتائیں۔ بیٹیاں کام سے منہ کیسے پھیریں۔؟ ننھی منی دلہنیں۔ کوئی بارہ کی، کوئی تیرہ کی، کوئی چودہ کی، کوئی پندرہ کی۔ کسی کی بہت ہی عمر ہوگئی تو سولہ کی ـــــ حد ہو گئی سترہ ـــــ یہ ہونٹوں پر مسی کی تہہ

جاتیں تو کوئی طعنہ دل چھید جاتا۔

"دو ئی بہنیں اپنی عمر میں یوں بھائیوں کے گھر نہیں بنایا کرتیں۔!"
سسرال کا چڑھاوا چڑھاتیں، کالی پوت کا لچھا پہناتیں تو سنسناتا
تیر آتا۔

"یوں بھینچ بھینچ کر پیار کرتی ہے کہ بس منہ میں چھانی دنیا باقی رہ
جاتا ہے۔ کرے بھی کیا بے چاری۔؟"

زمین کے اندر جو بیج سویا ہوا تھا، سجاد نے پانی ڈال ڈال
کر اگا چھوڑا۔ باہر کس قدر تیز دھوپ تھی کیسی کٹھن اور تلخ زندگی۔!
یہ پودے اگا ہی کیوں کرتے ہیں کہ فضول بیج بھری ہواؤں اور جلتے
سورج کا سہن کرنا پڑے۔

خدا دعائیں نہ سنے، دلی آرزوئیں پوری نہ کرے تو انسان کا
یقین ڈگمگا جاتا ہے۔ یہیں ایمان کی آزمائش ہوتی ہے۔ کفر کا فاصلہ
یہاں سے کم رہ جاتا ہے۔

گاؤں کی سرحد سے لگ کر ایک ندی بہتی تھی۔ اس سے لگ کر
کالی مسجد تھی۔ اور کالی مسجد سے لگ کر بڑے پیر کا سفید مزار۔ کہنے
والے کہتے تھے یہاں مانگی گئی ہر مراد پوری ہو جاتی تھی اور خصوصیت
سے کنواری بیٹیوں کی ماؤں نے جب بھی پریشان ہو کر بروں کی دعا
مانگی۔ دیر سویر، برے بھلے بر جٹ ہی گئے۔ اتنے اونچے سارے مزار
کی ایک مجاور رکھوالی کرتا تھا۔ نیاز نذریں بھی وہی قبول کرتا تھا۔

اس دن مبارکہ بیگم نے بیٹی کے ہاتھ میں چوڑیاں لاکر پہنائیں
تو اختر کا جی دد ... آگیا۔ دل خون ہو کر جیسے جبہ اٹھا

"اماں یہ کیا کر رہی ہیں آپ۔ ؟"

ماں نے بیٹی ہی سے راز چھپانا چاہا۔ "ایسے ہی منیاری والے کے پاس اچھی چوڑیاں نظر آئیں تو تیرے لئے لے آئی۔" مگر وہ مزار کی ہری باریک سی چوڑی سب سے الگ نمایاں نظر آ رہی تھی اور اختر کا من دیکھ کر جیسے منہ پھوڑ کر بول اٹھی۔

"نہیں نہیں، مجھے تو تمہاری اماں منت مان کر مزار سے لائی ہیں۔ میں بھلا ان بانکوں کی بہن لگتی ہوں۔ ؟ میں تو تمہارے سہاگ کی مسرت ہوں۔ مجھے توڑ دو نہیں، مجھے گھورو نہیں۔"

اختر نے بےبسی سے گھٹنوں میں سر چھپا لیا۔

"اماں خدا کو نہ بھولئے۔ وہی سب سے بڑا سہارا ہے۔ وہی دلوں کی مرادیں پوری کرنے والا ہے۔"

گھٹنوں میں دھنسا ہوا سر رہ رہ کر کانپتا رہا۔

کوئی دو چار دن بھی نہ گزرے ہوں گے، عارفہ بیگم چوڑی کی کرامت کی منتظر ہی تھیں کہ اس دن ان کو اکوماں کے ہاتھ ٹھونٹھے نظر آگئے۔

ان کا جی دھک سے رہ گیا۔

"چوڑیاں کیا ہوئیں بٹیا۔ ؟" انہوں نے آنسو پیتے ہوئے کہا۔

"حمام میں ٹھوکر لگی اور ساری کرچی کرچی ہو گئیں۔ دو ایک باقی رہ گئیں تو میں نے آپ ہی پھوڑ ڈالیں۔" وہ صاف جھوٹ بول گئی۔

"ہائے بیٹی ان میں تیرے سہاگ کی چوڑی بھی تھی۔" انہوں نے چلا کر کہنا چاہا مگر آواز وہیں کہیں دل ہی میں گھٹ کر رہ گئی۔

"منت ماننے سے سہاگ نہیں ملا کرتا اماں۔ سب قسمت کی بات ہے۔" اس نے رک کر کہنا چاہا مگر آنسوؤں نے گلا پکڑ لیا۔
"سب قسمت کی بات ہے، سب قسمت کی بات ہے۔!"

(۶)

عید پر تیرہ دنوں کی رخصت لے کے شکور میاں گھر آئے ہوئے تھے۔ عید سے پہلے خالہ بی سے ملنے آئے۔ خالہ بی کے دل میں چاند سا چمکا۔ "یہ بار بار میرے گھر کے چکر کیوں کرتا ہے۔؟"
اختر باہر انی نو شکور میاں نے سہم کر، اور پھر چونک کر یوں جلدی سے نگاہیں ہٹالیں۔ اگر تھوڑی دیر اور دیکھتے رہتے تو وہ نگاہیں وہیں جل کر رہ جاتیں۔
نفرت کا وہی پرانا انداز! خالہ بی کے دل کا چاند وہیں ڈوب گیا۔
"حیا، مروت بھی کوئی چیز ہے۔ خلوص، محبت، انسانیت تو دنیا سے اٹھ ہی گئی ہے۔ بھلا یہ شکور میاں اختر ایسی بیٹی کو کر لیں تو کیا برائی ہے۔؟ اختر ایسی دلہن سے تو گھر بھر میں جھما جھم اجالے ہو جائیں۔ مگر کرے کون۔؟ انہوں نے بڑے دکھ کے ساتھ سوچا۔
ایک دن صبح اکو ماں ناشتہ کرتے کرتے بولی۔ "اماں میں نے رات بڑا عجیب سا خواب دیکھا۔"
"کیا۔؟" اماں نے لاپروائی سے پوچھا۔
"میں اماں مجھے ایسا لگا کہ آپ اور میں، وہ کالی مسجد کے

سامنے والا اونچا سا مزار ہے نا، وہاں کھڑی ہیں۔ بس دیکھتے ہی دیکھتے آپ نے دھکا دیکر مجھے ندی میں دھکیل دیا۔" اس نے معنی خیز نگاہوں سے ماں کو دیکھا۔

اماں چونکیں اور چلا کر پوچھا۔" میں نے۔ ؟"

اختر نے سکون سے جواب دیا۔" ہاں اماں آپ نے۔"

عارفہ بیگم ہنسنے لگیں۔" واہ ری لڑکی! خواب بھی کیا دیکھا۔ سیدھی کروٹ سویا کر۔"

دوسرے دن ناشتے پر اختر ماں سے بولی۔

"اماں رات میں نے پھر وہی خواب دیکھا، جیسے میں اور آپ مزار کے اونچے چھجے پر کھڑی ہیں! ور اکدم آپ نے دھکا دیکر لوٹ دیا۔" وہ رکی اور ماں کو دیکھتی ہوئی بولی۔" اور اماں میں چلا رہی ہوں میں مرنا نہیں چاہتی۔ اماں مجھے دھکا نہ دیجئے، مگر آپ نے ایک نہ سنی اور بولیں۔

" تیرا مرنا ہی ٹھیک ہے، اور مجھے لوٹ دیا۔ جانے کیسا خواب ہے۔!" اس نے ماں کے چہرے پر نگاہیں گاڑ دیں۔

" روز روز وہی خواب دیکھتی ہے۔ دماغ کی کمزوری ہے ساری۔" انہوں نے کھوئے کھوئے انداز میں جواب دیا۔

اب عارفہ بیگم سدا نئی ادھیڑ بن میں دکھائی دیتیں۔ اختر دیکھتی کبھی اماں اپنی مٹھیاں بند کر رہی ہیں، کبھی کھول رہی ہیں۔ کبھی اپنے آپ میں ہنستی ہیں، کبھی آنکھیں پونچھنے لگتی ہیں۔ کبھی خود سے باتیں کرنے لگتی ہیں۔

"نہیں نہیں یہ کیسے ممکن ہے۔ ؟" پھر خود ہی جواب دیتیں۔

"اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے۔ ؟"

ان ہی دنوں گاؤں میں جو بڑے زمیندار خلیل میاں تھے، ان کی بیوی کا یکایکی انتقال ہو گیا۔ مرنے والی اپنے پیچھے ایک کنبہ چھوڑ مریں۔ جوان بیٹیاں، جوان بیٹے، پوتے، پوتیاں، بہوئیں۔ خلیل خان کا اتنا بڑا کاروبار، اتنی بڑی زمینداری تھی۔ گھر بھی خوب بڑا سارا۔ کھانے والے اتنے جی، بغیر گھروالی کے کیا پتہ بھی چل سکتا ہے۔ ظہیر میاں ان کے ہاں نوکری کرتے ہی تھے، خلیل خاں کو رنڈوا دیکھ اپنی بہن کا خیال آگیا۔

"اگر آپ کہیں تو یہ رشتہ ہو سکتا ہے۔ ہاں بس یہ بات ہے کہ وہ ذرا بوڑھے ہیں۔" وہ ماں سے بولے۔

"ذرا بوڑھے ہیں۔ ؟" عارفہ بیگم چلائیں۔ "تمہارے باپ ان کی جوانی میں گھٹنے برابر کے تھے۔ اچھا جوڑا ڈھونڈا ارے میاں تو نے اپنی بہن کا۔ سہاگ اور رنڈاپا ساتھ ہی ساتھ کیوں نہیں چڑھا دتیا ـــ ایسی جگہ بیاہنے سے اچھا جوڑا ڈھونڈا رے میاں

تو نے اپنی بہن کا۔ سہاگ اور رنڈاپا ساتھ ہی ساتھ کیوں نہیں چڑھا دتیا۔ ایسی جگہ بیاہنے سے اچھا تو یہ ہے کہ اپنے ہاتھوں کنوئیں میں ڈال دو اس کو۔"

اک دم ان کے ہونٹ کانپ اٹھے، دل دھڑک اٹھا۔

"اور اماں میں نے دیکھا کہ آپ اور میں اس چھجے پر کھڑی ہیں اور اک دم آپ نے مجھے لوٹ دیا۔"

ان کے دماغ پر دعیرے دعیرے اختر کا خواب چھانے لگا جو وہ مسلسل تین دنوں تک دیکھتی رہی تھی۔ "اس سے اچھا تو یہ ہے کہ اپنے ہاتھوں کنوئیں میں ڈال دو اس کو۔"

"اور اماں میں نے دیکھا کہ آپ نے مجھے دھکا دے کر ....." ان کا دل دھڑ دھڑ کر اٹھا۔ دھک ..... دھک۔ تیز تیز دھڑکن۔ دھڑ ..... دھڑ ..... دھڑ۔ پھر دھیمی دھیمی رفتار سے دھڑکتے دھڑکتے ان کا دل جیسے مطمئن ہو گیا۔

جمعرات کے دن صبح ہی صبح، کہ ابھی تارے جھلکے ہوئے ہی تھے۔ عارفہ بیگم نے اختر کو جگا دیا۔

"بیٹی۔ او بیٹیا ـــ اکو ماں۔"

"اوں ـــ اوں ـــ جی۔" وہ کسمسا کر پھر سو گئی۔

"بیٹی اٹھو تو سہی۔ ذرا کالی مسجد تک چلیں گے۔"

"جی ـــ کیا۔؟" وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

"پیر صاحب کے مزار تک چلیں گے۔" وہ سکون سے بولیں۔

"کیوں۔؟" اس نے چھوٹا سا سوال کیا۔

"نہیں بیٹیا ـــ رجب علی کی بی بی مجھ سے کہہ رہی تھیں کہ جمعرات کو منہ اندھیرے مانی گئی منت بالکل پوری ہو جاتی ہے چلو آج یوں ہی قسمت آزماتے ہیں۔"

"آپ کو ایسی کون سی منت ماننی ہے۔؟" وہ حیرت سے بولی۔

"دل کا سکون بھی بڑی چیز ہے بیٹی۔ بس میں آج یہی منت ماننے والی ہوں کہ خدا تو میرے دل کو اطمینان دے، سکون دے۔"

"اچھا چلئے۔" وہ جوتیاں ٹٹولتی ہوئی بولی، ذرا منہ ہاتھ دھو آؤں۔"

ترل ترل ترل نیچے ندی کا پانی بہہ رہا تھا۔ ہرا ہرا سا نیلا نیلا سا، صاف شفاف پانی مزار کے سب سے اونچے چھجے پر عارفہ بیگم اور اختر کھڑی تھیں۔

"بہت سوں سے سنا ہے اندھیرے وقت، صبح ہی صبح مانی گئی منت پوری ہو جاتی ہے۔ اور پھر آج جمعرات بھی ہے۔" انہوں نے ٹھنڈے لہجہ میں کہا۔

نیچے پانی بہہ رہا تھا، اوپر وہ دونوں کھڑی تھیں۔

اختر نے ماں کو دیکھا۔ ان کا چہرہ بے جان بے جان سا اور ستا ہوا نظر آ رہا تھا۔ "اماں آپ اسقدر پیلی کیوں نظر آ رہی ہیں۔؟" اس نے ماں کے چہرے کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہیں! میرا چہرہ! نہیں تو۔!" وہ چونک کر زور سے ہنسنے لگیں۔ "تاروں کی روشنی میں پیلا نظر آ رہا ہوگا۔" اور بیٹیا سچ تو یہ ہے ... وہ سنجیدہ ہو گئیں، "کہ ادھر جب سے تمہارے باپ کا انتقال ہوا ہے دن رات رونے دھونے اور فکریں اٹھاتے اٹھاتے میرا خون سوکھ گیا ہے اور خون ہی سوکھ جائے تو انسان پیلا نہ نظر آئے تو کیا ہو۔؟" وہ ذرا مسکرائیں۔ ان کی مسکراہٹ میں عجیب غیر یقینی انداز تھا۔

اختر نے بڑے سکون سے جواب دیا۔ "فکروں پر جی جلانے کی کیا بات ہے اماں۔ سوچنے سے فکریں کچھ کم تھوڑی ہی ہو جاتی ہیں۔ آپ خواہ مخواہ خود کو کڑھاتی رہتی ہیں۔"

"ہاں میں خود کو خواہ مخواہ کڑھاتی رہتی ہوں۔" وہ نیچے بہتے ہوئے پانی کو دیکھ کر بولیں۔

تھوڑی دیر خاموشی رہی، پھر وہ بولیں۔ "مگر میں آج خلوصِ دل سے دعا مانگنے آئی ہوں، اور مجھے یقین ہے کہ آج میرے دل کو دائمی سکون مل جائے گا۔"

انہوں نے بے جان ہاتھوں سے، کانپتے ہاتھوں سے پاس کھڑی اختر کو اپنی طرف کھینچا۔ ایک خوفناک ہلکی سی مسکراہٹ ان کے ہونٹوں پہ چھا گئی اور انہوں نے اختر کو پوری طاقت سے نیچے کی طرف لوٹ دیا۔

اختر کا پھول پان سا جسم پانی میں قلابازی کھا گیا۔ کچھ دور پہ اس کا سر ابھرا، سیاہ بالوں میں چاند سا چہرہ چمکا اور ڈوب گیا۔ تھوڑی دور پہ پھر اس کا سر ابھرا، پھر ڈوبا، پھر ابھرا، پھر ڈوبا اور پھر نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ عارفہ بیگم کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ اور ہونٹ بھینچے ہوئے۔ یوں کھڑے کھڑے ایک صدی ان کے سر پر سے گزر گئی۔ مردوں کی طرح وہ اندھیری سیڑھیوں پر سے اترنے لگیں کہ اکدم کسی سے ٹکرا گئیں۔

آنے والا کوئی مرد تھا۔

"ارے آپ۔؟ خالہ بی! یہاں۔؟" وہ پہچان گیا۔ اک دم وہ خالہ بی کو آجالے میں لے آیا اور بڑی بے بسی سے گھبرا کر بولنے لگا۔

"خالہ بی، جانے کس نے مجھ سے بتایا تھا کہ جمعرات کی صبح مانی گئی منتیں قبول ہو جاتی ہیں۔ ہر بار جب گھائل آتا ہوں تب ماتھا رگڑ رگڑ کر دعائیں مانگتا ہوں، مزار پہ آکر منتیں مانتا ہوں، مگر خالہ بی ... مگر

آپ سن رہی ہیں نا۔؟ مگر کبھی میری دعا قبول نہیں ہوئی۔ میں زمین پر رہنے والا ذرہ آسمان پر چمکنے والے ستارے کی آرزو کرتا ہوں خالہ بی۔ مگر میں کس منہ سے کہوں کہ میں اختر سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔؟ میں تو آپ کے گھر کا پروردہ ہوں۔ بھلا آپ لوگ کیا سوچیں گے۔ ڈر کے مارے کبھی اماں ابا کے سامنے اشارتاً بھی نہ کہا کہ وہ اکرم میرا دل نہ توڑ دیں۔ میں دل ہی دل میں اپنی محبت کا درد چھپائے رہا۔ اپنی حیثیت خوب جانتا ہوں خالہ بی، اس لئے کبھی اختر کو آنکھ بھر کر دیکھا بھی نہیں کہ جس چیز کو میں حاصل نہیں کر سکتا اس کی تمنا کیوں کروں؟ کیوں اس ناممکن سی بات کی آرزو کروں۔؟ مگر اب مجھ سے صبر نہیں ہوتا خالہ بی۔ آج آپ کو اکیلا پاکر میری ہمت بندھ گئی۔ میں غریب ضرور ہوں خالہ بی، آپ لوگوں کی برابری کا دعویٰ نہیں، مگر آپ یقین مانیے میں اختر کو بہت خوش رکھونگا۔ بہت اچھی طرح رکھونگا۔ آج جمعرات ہے، شاید میری دعا قبول ہو جائے۔!" اس نے کندھا پکڑ کر خالہ بی کو ہلا دیا۔

"میں آپ سے بھیک مانگ رہا ہوں خالہ بی، مجھے خالی ہاتھ نہ لوٹائیے۔ یقین کیجئے میں اختر کے بغیر مر جاؤں گا۔ ہاں کہہ دیجئے خالہ بی۔ میری خالہ بی۔!"

خالہ بی کے ہونٹوں پر پھیلی ہوئی مسکراہٹ وسیع ہو گئی اور ان کے خوفناک قہقہے سنسان مزار کی دیواروں سے ٹکرا ٹکرا کر بری طرح شور مچانے لگے۔

ئ

ساتواں شہزادہ

خالہ بی یوں تو مرغی کے چوزوں کو دانہ چگا رہی تھیں، مگر ان کا سارا دھیان دھوبی کی طرف تھا۔

صحن میں ڈھیر سارے کپڑے پھیلے ہوئے تھے۔ اور سنجھلی بہو بیٹھی ان کپڑے لکھتی بیٹھی تھیں۔ سنجھلی بہو کا کام بھی کیا کام تھا۔ ہر بار لیکن سارا معاملہ چوپٹ۔ یوں کر لے وہ مرنے کا شوق تو بڑا تھا مگر کوئی کام گت سے نہ کر پائیں۔ پچھلے چکر میں دھوبی کو کپڑے دیتے وقت انہیں تو اچکنوں اور قمیصوں کی جیبیں تک نہ دیکھیں۔ نتیجہ [illegible] کی اچکن کی جیب میں دس دس کے تین نوٹ تھے، وہ دھوبی کے گھر چلے گئے۔ دھوبی تھا تو پہچان کا، برسوں سے کپڑے لاتا لے جاتا تھا۔ مگر تیس روپے دیکھ کر اس کی نیت بدل گئی۔ صاف مکر گیا کہ ہم نے دیکھے ہی نہیں۔ دیکھتا تو واپس نہ کر دیتا۔؟

خالہ بی کا غصہ بہو پر تھا۔ اور بہو کا غصہ جبّو پر۔

"اے واہ اتنا بھی نہیں ہوتا کہ کپڑے اتارتے وقت اپنی جیبوں کی تلاشی لے لیں۔"

"اور تم سے اتنا بھی نہیں ہوتا کہ کپڑے دیتے وقت ذرا جیبوں

کا جھٹکا ہی لے ڈالیں۔ مرد مرد ہی ٹھیرا۔ آخر عورتوں کا اور کون کام ہوتا ہے بی۔؟ الٹے غصہ دکھاتی ہو۔"

تب کی بات بہو بیگم کو یاد تھی۔ ہر کپڑے کو بڑی احتیاط سے جھٹکوا رہی تھیں۔ خالہ بی الگ دیکھ رہی تھیں۔ اک دم بلقیس نے ایک اچکن کی جیب سے ایک پوٹلی برآمد کرلی۔

جلدی جلدی گرہ کھول کر دیکھا۔ دو دو پیسے میں ملنے والی دو گلابی پلاسٹک کی پنیاں اور ننھے بچے کے منہ میں دینے کا ایک ربر کا نپل

"اماں دیکھتی ہیں یہ کیا ہے۔؟" انہوں نے منہ میں ڈال کر زور سے ساس کے کان کے پاس پیپی بجادی۔ "کیا ہے۔؟" خالہ بی نے حیرت سے پوچھا۔

"یہ کھلونے۔!"

"تو کیا ہوا۔؟" خالہ بی جواری کے دانے آنکھ میں پھینکتی ہوئی بولیں، "ڈھیر سارے تو بچے ہیں گھر میں، کسی کے بھی ہونگے۔ رکھ دو وہاں میز پہ۔"

"بات تو سمجھتی نہیں آپ۔ یہ چھوٹے سبھیا کی جیب سے نکلے ہیں۔

ہاں۔" وہ چھوٹے سبھیا پر زور دیکر بولیں۔

"اس میں سمجھنے کی کیا بات ہوئی۔؟ نکلے ہوں گے چھوٹے کی ہی جیب سے — پھر۔؟"

بلقیس جھلا گئی۔ "تو کیا کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔؟"

"جا چھوکری تیری تو عقل ہی پلٹ گئی ہے۔ ارے اتنے سارے سبھائی بھتیجے ہیں، کسی کے لئے بھی لایا ہوگا۔"

"بھائی بھتیجوں کے لئے لاتے تو دے نہ دیتے، گرد لگا کر کیوں رکھتے۔؟"

اب کہ خالہ بی نے ذرا غور سے بہو کی صورت دیکھی۔ "دلہن تمہارا مطلب میں اب بھی نہیں سمجھی۔"

"اب آپ جان بوجھ کر انجان بن رہی ہیں تو میں کیا کروں۔؟" وہ اکتا کر پھر کپڑوں پر پل پڑیں۔

خالہ بی کا سارا قصہ اس رانی جیسا تھا جس کے ایک نہ دو پورے سات بیٹے تھے۔ اور یہ تو ہوتا ہی تھا کہ سب سے چھوٹا بیٹا بے حد خوب صورت اور بے حد ذہین ہوتا تھا۔ (بہادر ہونا تو خیر لازمی تھا۔) ملک ملک کی خاک چھاننا اور پھر شہزادی بدر کمال (یا پھر شہزادی گلرخ) کو کھوج نکالنا۔ بڑی دھوم دھام سے راجدھانی کو لوٹنا تو ساتھ میں اپنے باپ کی چھنی ہوئی سلطنت بھی دوبارہ حاصل کرنا آنا۔ بس چھوٹے میاں کا بھی عن دمن وہی حشر تھا۔ سب میں چھوٹے تھے۔ سب میں خوب صورت اور کہانی کے شہزادے کی طرح ماں باپ کے لاڈلے بھی۔ اوپر کے چھ بیٹوں کی تو شادی ہو گئی۔ مگر چھوٹے میاں ابھی کنوارے ہی تھے۔ عمر بھی بہت کہاں تھی۔ بس یہی کوئی چوبیس پچیس کے اندازے میں تھے۔

وضعدار گھرانوں میں ہوتا ہے کہ ماں باپ جہاں بات لگا دیں بیٹے بغیر کسی پس و پیش کے سر جھکا دیتے ہیں۔ اور یہ بات تو ظاہر ہے کہ باپ پیت اولاد کا برا کیوں چاہیں گے۔؟ ان کی بات نہ ماننے کو کوئی تو حوالہ ہو۔ خالہ بی کی ساری بہوئیں اپنے ہی خاندان کی تھیں۔

کوئی ماموں کی بیٹی کی نند، کوئی خالہ زاد بہن کی بیٹی، کوئی بھتیجی تو کوئی بھانجی۔ خالہ بی کا گھر بھرا پڑا تھا۔ چھوٹے میاں کی شادی کی ابھی ضرورت ہی کیا تھی۔؟ مگر وہ جو ہر ماں کی خواہش ہوتی کہ "بس بیٹے کا سہرا دیکھ لوں۔" وہی خواہش یہاں بھی ابھری۔ بیٹی تو دیکھی بھالی ہی تھی۔ بڑی بہو کی چھوٹی بہن، خالہ کی آنکھوں میں اب تب سے نہیں اس وقت سے چڑھی ہوئی تھی جب بڑے بیٹے کی آرسی مصحف کے وقت لال لال اطلس کا جھم جھماتا جوڑا پہنے ایک چھوٹی سی لڑکی صندل کی کٹوری لیے آئی اور آتے ہی اٹھ کھیلی بہن سے بولی۔

"بھیا! ہم آپ کے صندل لگائیں گے تو نیگ دینے گے نا آپ؟"

اتنی پیاری سی صورت، ایسی بھولی ادا کہ سارے لوگوں کی نگاہیں بیچ اس پہ جم گئیں۔ اور نہ جانے کتنوں نے کیا کیا سوچا ہوگا۔ مگر ادھر خالہ بی نے تو بس تہیہ ہی کر لیا کہ سیانی ہوتے ہی اسے بھی اپنے گھر کا اجالا بنالوں گی۔ مگر بات اپنے دل میں ہی رکھی۔

بڑے گھروں کے کھاتے پیتے بچے جلد ہی جوان ہو جاتے ہیں اور پھر لڑکیاں تو یونہی شرط باندھ کر بڑھتی ہیں۔ کوئی سال بھر بھی نہ گزرا ہوگا کہ بڑی دلہن کے میکے سے بلاوا آیا۔ بھائی لینے کو آئے۔ اب بہن بڑی حیرت زدہ کہ ہائے اللہ کوئی کار نہ کاج، تقریب نہ جلسہ، یہ بیٹھے بٹھائے بلاوا کاہے کو آیا۔؟ بھائی سے پوچھا تو یہ بھی بس اتنا ہی بولے۔

"مجھے تو معلوم نہیں۔ اماں نے کہا جا کر لے آؤ۔ بس میں چلا آیا۔"

بڑی دلہن تو کچھ نہ سمجھیں۔ مگر خالہ بی ہنسنے لگیں۔

" اے دلہن تم بھی بس پوری وہ ہو۔ اتنی بات نہیں سمجھتیں لڑکی کی ذات کا معاملہ ہے۔ اب کیا سمدھن پورے خاندان میں رقعے بانٹ بانٹ کر دوپٹہ اڑھائیں گی بیٹا کو۔ ؟ چلی کیوں نہیں جاتیں۔ ؟"

بات وہی نکلی جو خالہ بی نے سمجھی تھی۔ ماں باپ تو فکر مند ہوئے ہوں گے کہ چھاتی پر بوجھ پڑا، مگر خالہ بی کے ایک دل کے ہزار دل ہو گئے کہ چلو اب یہ وا اپنی ہوئی۔

ادھر یکے بعد دیگرے سب بھائی دولہے بن گئے تھے، اور نیچے کے دو بھائیوں کے منڈوے بھی ساتھ پڑے۔ نکاح خوانی بھی ساتھ ہی ساتھ ہوئی اور اپنی دلہنوں کو گود میں اٹھا ساتھ ہی ساتھ پالکی میں بٹھایا۔

اب رہے کون۔ ؟ وہی چھوٹے میاں! اب چھوٹے میاں تو لاڈ دلار کے تھے ہی پہلے اور آخری کاج پر تو یوں ہی زیادہ دھوم دھڑکا ہوتا ہے۔ اور چونکہ چھوٹے میاں اپنے بھائیوں کے مقابلے میں زیادہ پڑھ لکھ بھی گئے تھے، اس لئے بھی ان کے وقت زیادہ مہنگا مر تبیرا۔

خالہ بی کو کیا اپنے بیٹوں سے ایسی امید ہو سکتی تھی کہ ان کے ہاں کرتے وہ ناں کریں۔ ؟ پوچھتیں گچھتیں بھی کیوں۔ ؟ رمضان کی عید کے بعد پیغام بھجوا دیا۔ غیر خاندان کے ہوں۔ چال چلن میں کھوٹ چوٹ کا ڈبکا ہو تو جواب میں دیر ہوتی ہے۔ چھان بین کرتے کرتے ہی دن نکل جاتے ہیں۔ یہاں تو اپنے ہی گھر کی سی بات تھی۔ بقر عید کے بعد جواب بھی آ گیا اور چھوٹے میاں کو پتہ چلا تو کب چلا جب خالہ بی نے منگنی کے کپڑے پہنانے انہیں مسند پر آ بیٹھنے کو کہا۔

" مگر کس تقریب میں۔ ؟ " انہوں نے ہنس کر کہا۔

"اے چل باتیں بناتا ہے۔ اب اتنا بھی پتہ نہ چلا ہوگا کہ یوں اترا کر پوچھ رہا ہے۔"

چھیوں بھابھیاں ہنستی کھڑی تھیں۔ منجھلی بھابی بلقیس ہنس کر بولیں۔ "اس لئے کہ اب چھوٹے شہزادے کی باری ہے۔"

سب ہنسنے لگے مگر چھوٹے میاں پھر بھی نہ سمجھ سکے۔

"مگر کاہے کی باری بھئی۔؟"

"اجی جناب اب آپ کے دولہا بننے کی باری ہے۔"

ادھر قہقہے اڑے اور ادھر ان کا جی ڈوب گیا۔

"مگر — مگر مجھ سے کوئی پوچھتا تو۔؟"

"اے چل بڑا آیا۔ ہم سے بڑھ کر تیری عقل ہو گئی شاید۔" اماں بڑے پیار سے ہنس کر بولیں۔ "بھلا پوچھتے بھی تو کیا جواب دیتا۔؟ کیا نا کر دیتا۔؟"

چھوٹے میاں نے منگنی کے پھول پہنے تو سہی، مگر نئے نئے دلہوں پر ایسے موقعوں پر جو خوشی چھاتی ہے وہ ان کے چہرے پر دور دور تک نہ ملتی تھی۔

بیٹی والوں کا منہ ان کے بس کا نہیں ہوتا۔ بیٹے والے کچھ کہیں تو جواب دیں، ورنہ منہ پھوڑ کر تو بول نہیں سکتے۔

"بات تو ہو بھی گئی بھئی، اب بیٹی اٹھا کیوں نہیں لیتے۔؟"

ادھر بیٹے والے ایسے ملے تھے کہ سر سر مہینے گزرتے جا رہے ہیں۔ نہ ہوں نہ ہاں۔ ادھر ادھر سے ٹوہ بھی چلایا۔ مگر نہ کھلی۔ پھر بڑی بہن کی زبانی معلوم ہوا کہ چھوٹے میاں اپنی ٹریننگ میں الجھے ہوئے ہیں۔

ٹریننگ ختم ہوئی تو ملازمت کریں گے، پھر کہیں جاکر شادی وادی کے بارے میں سوچیں گے۔ صرف سوچیں گے، کرنے کا پھر بھی طے نہ تھا۔
باپ کا بچوں پر وہ رعب تھا کہ ان کے سامنے آتے ہی کانپنے لگتے۔ اور ادھر وہ گھر میں گھسے اور بچے ادھر اُدھر کھسکے۔ خالو میاں چاہتے تو آج ہاتھ پکڑ منڈوے تلے بٹھا دیتے۔ "بول بے قبول ہے لڑکی" اور میاں جی کی اتنی مجال نہ ہوتی کہ ناپسند ہونے پر بھی انکار کر سکتے۔ مگر خالو میاں نے جو دیکھا کہ چھوٹے میاں ٹریننگ کے بوجھ سے یونہی سوکھے جا رہے ہیں۔ بس ڈھیل دے دی۔
"کام کا بار آ پڑا ہے بے چارے پر۔ ایسے میں گرہستی میں الجھا دیا تو صحت بالکل ہی تباہ ہو کر رہ جائے گی۔ اور کیا ابھی سے بوڑھا تو ہوتے نہیں جا رہا۔"
دیوروں، بھاوجوں کی محفل جمتی تو رنگا رنگی باتیں ہوتیں۔ سنجلی بہو سدا ساس کے دل پر چڑھی رہنا چاہتی تھیں۔ اور موقع ملنے پر کوئی نہ کوئی ایسی بات ساس سے جا لگاتیں کہ وہ انہیں اور زیادہ چاہنے لگتیں۔ مگر اس دن خالہ بی نے ملفیس دلہن کی بات پر کان ہی نہ دیئے۔ جب انہوں نے جاکر سنایا۔ "اماں، سنا کچھ۔ چھوٹے بھیا تو کہتے ہیں میں تمام عمر شادی ہی نہیں کروں گا۔"
اماں نے چونک کر دیکھا۔
"دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا۔!"
"اے لو میرے دماغ کو کیا ہونے چلا ہے۔! چھوٹے میاں آپ ہی کہتے تھے، سو میں نے آپ سے کہہ دیا۔"

"مگر کوئی وجہ بھی ہوتی۔!"
"اب یہ تو ان کا اپنا دل جانے۔"
"بات میں کوئی ڈھنگ بھی ہو مگر۔"
"بلقیس بی ہنس کر بولیں۔"اماں کہانی والے شہزادے کی طرح وہ تو بس کوئی شہزادی ہی لائیں گے۔"
خالہ جی بدک کر بولیں۔"کیوں، بانو، کیا کسی شہزادی سے کم ہے؟"
"اب تو وہی جانیں جو انکار پر تلے بیٹھے ہیں۔"
بات یہیں ختم نہیں ہوئی، بس خالہ بی کے جی کو لگ گئی۔ چھوٹے میاں گھر میں آتے تو خالہ بی ایسی کوری کوری نظروں سے ان کا جائزہ لیتیں کہ اپنی جگہ وہ بھی ٹھٹھک ٹھٹھک جاتے۔
ایک دن رات کے کوئی گیارہ بجے چھوٹے میاں گھر لوٹے۔ سب لوگ سو چکے تھے۔ ملازم باہر ہی سوتا تھا، اس نے بڑے دروازے کی کنڈی کھول دی اور یہ گھر میں آ گئے۔ خالہ بی کو تو ناتوس قدموں کی چاپ سن کر سونا دوبھر ہو گیا، سر اٹھا کر بولیں۔
"کہاں گیا تھا چھوٹے میاں۔؟"
چھوٹے میاں پہلے تو ذرا گڑبڑائے پھر سنبھل کر بولے۔"رات کا شو دیکھنے چلا گیا تھا۔"
"اور مجھ سے پوچھا بھی نہیں۔؟"
"بھول ہو گئی اماں بی۔ دوستوں نے گھیرا اور بس لے کر چلے ہی گئے۔"
خالہ بی نے بھی کوئی دھیان نہ دیا کہ جوان جہان ہے ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں پر نگرانی ٹھیک نہیں ہوتی۔ مگر اس دن کے بعد تو یہ

ہونے لگا کہ چھوٹے میاں کو روز ہی دوست گھیرنے لگے۔ کریم ان کا یا مغاد بن گیا کہ وہ دبے پاؤں راتوں کو آتے اور یہ دھیرے سے دروازہ کھول دیتا۔

رمضان کے تیس روزے ختم ہو چکے تھے۔ جمعہ کو عید پڑھنی تھی۔ جمعرات کی رات خالہ بی اپنی تمام بہوؤں کے ساتھ شیر خورمے اور سیویوں کے لئے میوے تیار کرتی بیٹھی تھیں۔ ایسے کام کاج میں تو رات یوں بیت جاتی ہے۔ ادھر صبح ہی صبح ننھے بچے کپڑوں کے لئے غل غپاڑہ مچانا شروع کر دیتے ہیں۔ پھر بڑے لوگوں کی بھی برابری کرنی ہوتی ہے۔ نمازیوں کی گڑبڑ، بچوں کی گڑبڑ، پھر خود عورتوں کے نہانے دھونے۔ سب مائیں اپنی بچیوں کے ریشمی رنگین اور بچوں کے گلابی نیلے کپڑے اور اچکنیں نکال نکال کر اوپر ہی رکھ رہی تھیں۔ کہ صبح صبح پھر گڑبڑ نہ مچے۔

چھوٹے میاں کو معلوم نہ تھا کہ آج گھر بھر میں رت جگا پڑا ہے۔ یوں ہی اپنے پیچھے دھیرے سے دروازہ بند کرتے ہوئے گھر داخل ہوئے تو سٹ پٹا گئے۔ چراغوں کی دھما دھم روشنی میں دیکھتے کیا ہیں۔ کہ اماں تو بن کشن پہ کھوپرہ چھیلتی بیٹھی ہیں اور بھابیوں نے مارے خوشی اور دھما دھم کے رات کو دن سمجھ رکھا ہے۔

خالہ بی نے دیکھا ضرور، مگر ٹال گئیں۔ اگر لولنے پر اتر آتیں تو پھر لولتے ہی چلی جاتیں اور پھر صبح عید کا دن تھا جو برس کے برس یہ دن آتا ہے۔ اگر فضول میاں منہ پھلا کر بیٹھے رہے تو غصے غصے میں ساری خوشی ملیا میٹ ہو جائے گی۔ سمجھانے بجھانے کے اور بھی تو

کئی دن ہوتے ہیں۔ بس اتنا ہی بول کر رہ گئیں۔" اے میاں یہ کوئی آنے کا وقت بھی ہوا۔؟ دیکھ لو دو ڈھائی سے کم کیا بج رہے ہوں گے۔؟ اور پھر اپنے کھانے والے کا بھی کوئی خیال ہے کہ نہیں۔؟ روزہ کہاں افطار کیا تھا۔؟"

چھوٹے میاں کے دم میں دم آگیا۔ سانس لے کر بولے۔" ایسے ہی ایک دوست نے روک لیا۔"

" اتنی رات گئے تک۔؟" خالہ بی حیرت سے بولیں۔

" اور کیا۔ اتنا کہتا رہا جانے دو، جانے دو، مانا ہی نہیں میں تو تب ہی چلا آتا تھا۔"

" اچھا دوست ہے موا۔" خالہ بی اتنا کہہ کر کھور ہنے لگیں۔ کھر پلے ہوئے بن سمیٹ کر انہوں نے تھال میں رکھ دیئے اور خود جاکر سہ دارے ٹونٹی کھول وضو بنانے لگیں۔ خالہ بی ہر جمعرات کی رات کو سوتے وقت یٰسین شریف پڑھتی تھیں کہ گھر میں رزق کی برکت ہوتی ہے۔ بچپن کی عادت بڑھاپے تک ساتھ دے گئی۔ وضو بنا کے اٹھیں تو دیکھا کہ ان کا اپنا قرآن شریف طاق سے غائب ہے۔ چڑ کر بولیں۔

" توبہ ہے ۔۔۔ ان بچوں نے کسی چیز کا ٹھکانہ نہ رکھا۔ میرا کلام مجید کس نے اٹھایا۔؟"

منجھلی دلہن کے بچے سارے گھر میں اپنی شرارت کی وجہ سے بدنام تھے، یہ طعنہ تو صاف ان ہی پر جاتا تھا۔ الجھ کر بولیں۔" ابا میاں لے گئے تھے، بھلا بچے کیوں اٹھاتے۔؟"

"اور ابا میاں کیوں لے گئے تھے۔؟"

"یہ وہ خود جانیں، کوئی کیا کہے۔؟"

بلقیس دلہن بولیں۔ "انہوں نے اپنا والا کلام مجید ایک مانگنے والے کو دیدیا۔ بے چارے کی ماں مر گئی تھی تو وہ کچھ پڑھ کر بخشنا چاہتا تھا۔ اور گھر میں کلام مجید نہ تھا، سو ابا میاں نے کلام مجید دے ہی دیا۔؟"

"اچھا کیا، مگر اب میں کاہے میں تلاوت کروں۔؟" گردن اونچی کر کے دیکھا تو طاقچے تک ان کا ہاتھ نہ جاتا تھا۔ آواز دیکر بولیں ــــ

"ارے چھوٹے، ذرا یٰسین شریف تو اتار لو۔"

چھوٹے میاں آواز سنکر آ تو گئے تھے۔ مگر یہ بات سنکر وہیں رہ گئے۔ کسمسا کر بولے۔ "میں باوضو نہیں ہوں۔"

اے میاں تو سامنے ہی تو سماوار دھرا ہے، وضو کو ایسے کون گھنٹے لگتے ہیں۔؟"

منٹ بھر تو یوں ہی الوؤں کی طرح کھڑے رہے، پھر بولے۔

"میں باہر سے ابھی منٹ بھر میں آتا ہوں۔"

اللہ جانے وہ منٹ کتنے گھنٹے کا تھا کہ خالہ بی کی ٹنگڑیاں دکھ دکھ گئیں۔ اوب کر اپنی بہوؤں سے بولیں۔

"وہ بی دیکھاری لڑکیو! میں یہاں کھڑی کی کھڑی ہوں اور وہ موا ایسا غائب ہوا کہ پلٹا ہی نہیں۔"

بلقیس نے دالان والے کمرے میں جاکر کھڑکی سے مردانے میں جھانک کر دیکھا تو چھوٹے میاں خرخر کرتے پڑے سو رہے تھے۔

آج خالہ بی کا ماتھا پہلی بار ٹھنکا۔ انہیں یاد آیا ابھی کچھ ہی

دن پہلے حضرت کے نام کی فاتحہ دلوائی تھی۔ خالہ بی لاکھ بلاتی رہیں مگر چھوٹے میاں یوں ہی مکر گانٹھے پڑے رہے۔ ذرا ٹس سے مس نہ ہوئے۔ بستر ہی میں لمبے لمبے پڑے ہی رہے۔ لاکھ لاکھ ماں نے خود خوشامد کی۔

"ارے موئے فاتحہ میں تو شامل ہو جا، برکت اترتی ہے۔"

کس کی فاتحہ۔ ؟ کہاں کی برکت۔ ؟ وہ تو ہلے بھی نہیں۔ بڑی دیر بعد اٹھے بھی تو پہلے غسل خانے کی خبر لی۔ نہا دھو کر سفید براق کپڑے پہنے اور ماں سے آکر بولے۔

"کھلائیے کیا پکایا ہے۔ ؟" خالہ بی نے غور کیا تو یاد آیا کہ صاحبزادے رات کو پھر دیر سے لوٹے تھے۔

سجا بیوں میں بات جا پہنچی اور طرح طرح کی قیاس آرائیاں ہونے لگیں۔ خالہ بی بھی جا پہنچیں۔

"اماں تو مانتی ہی نہیں، میں کہتی ہوں حضرت بری باتوں میں پڑ گئے۔"

خالہ بی کو بھڑک کر غصہ آگیا۔ "اے میں کہوں جوان بچہ ہے گھر میں جورو نہیں بچہ نہیں، ایسے میں اگر گانا دانا سننے کہیں چلا گیا تو کیا برائی ہو گی۔ ؟"

"گانے والے کا نام نہ لیجئے اماں بی۔" منجلی دلہن بولیں۔

"صاف سیدھی طرح کہئے ناکہ کوٹھے پر گئے تھے۔ فاتحہ تک میں تو شامل نہیں ہوئے۔ اور پھر یہ سب کیا ہے ؟ راتوں کو گیارہ بارہ ایک سے پہلے تو لوٹتے نہیں۔ چپ نام کر رکھا ہے کہ ٹریننگ لے رہے۔ ٹریننگ ہے نہ ورننگ، دوسری ہی ٹریننگ لے رہے ہیں۔"

"ہاں، میں بھی آنکھیں رکھتی ہوں۔ اور کیا بہنا ہم نے بھی ڈھیر سارے بچے کچھ یوں ہی نہیں جن لیے۔ ہزار بار دیکھا ہے کہ جب تک نہا دھو نہ لیں نما ز کے کمرے میں جھانکتے تک نہیں ہیں۔ ایسے تو کوئی اندھا بھی جان جائے کہ پانی کدھر کو بہہ رہا ہے۔ اب یوں کوئی آنکھوں پر پردہ ہی ڈالنا چاہے تو کیا کہہ سکتے ہیں۔؟" عزیز میاں کی بیوی نے صفا ساس پر چوٹ کی۔

عید کا دن نکلا، گھر بھر میں چہل پہل مچ گئی۔ رنگین ریشمی سرسراتے کپڑے بچوں کی چیخم چاخ؛ خالہ بی کا نوکروں پر گرجنا برسنا۔؟ بیبیاں کے سنگھار پٹار۔ بس سارے گھر میں دھنک دھیا ہونے لگی۔ یہاں وہاں، ادھر ادھر بس دھائیں دھائیں مچ گئی۔

دستر خوان بچھا، پورا گھر آ کر بیٹھا۔ خالہ بی نے طرح دے دی۔ اتنی اتنی باتوں پر روک کر نے سے بچے اور بگڑ بل ہو جاتے ہیں۔ پیار دلار سے ہر ایک کو بھلا پیار ہی تھیں۔ چھوٹے میاں کھا تو کیا رہے تھے، بس لوا لے ٹھونگتے بیٹھے تھے۔ خالہ بی نے بوڑھی آنکھوں سے سب کچھ دیکھا اور سمجھا کہ ٹال ٹال گئیں۔ چھوٹے میاں یوں کھا رہے تھے جیسے نوالے حلق میں اٹکتے ہوں۔ ماں نے جبر کرنا شروع کیا تو یوں ہی اٹھ کھڑے ہو گئے۔" بھوک محسوس نہیں ہو رہی ہے۔ اماں۔"

خالہ بی کے دل کو مستقل دھکدھکی لگ گئی۔

ذاکر میاں کی بی بی کو بس آ جا کے یہی جھن تھا کہ گھر بھر کی صفائی کرتی پھر رہی۔ مہینے پندرہ دن میں جھاڑو لے کر اٹھتیں اور پھر پورے گھر کو کھود ڈالتیں۔ صفائی کرتے کرتے چھوٹے میاں کے کمرے کی باری آئی۔ کرسی ہٹائی، میز اٹھایا۔ پلنگ اٹھایا، الماری جگہ سے کھسکائی

اور پھر جھاڑ جھٹک کر کے، ایک ایک چیز سمیٹ کر رکھنے لگیں۔ اتفاق سے الماری کا قفل رہ گیا تھا۔ پٹ کھولا۔ ہ جالے کچھے گچھے بھرے ہوئے بیچے اوپر دھول ہی دھول۔

"توبہ ہے اللہ۔! اتنی گندگی میں رہا کیسے جاتا ہے ان سے۔؟"
الماری کے خانوں سے سامان اٹھا اٹھا کر نیچے رکھنے لگیں کہ خانوں کی صفائی ہو جائے تو چیزیں پھر اپنے ٹھکانوں پر پہنچ جائیں۔ دیکھتی ہیں تو سامنے ہی شہد کی شیشی اور ارنڈ کے تیل کی چھوٹی سی بوتل۔ پھر ادھر ادھر ہاتھ مارا تو چھوٹے چھوٹے موزے اور ننھی منی دو تین نیکریں اور کپڑے ہیں آگئیں۔

"ہائے اللہ! سارا سامان ایسا جیسے کسی کی زچگی کی تیاری ہو۔
ان کی اپنی زچگی ہوئی تھی تو پہلے ہی دن اماں جان نے شہد منگوایا تھا۔ اور پھر یہ ارنڈ کا تیل۔ ہ چھوٹے چھوٹے کپڑے اور یوں الماری میں چھپائے ہوئے۔!

ایک ہی جھپاکے میں وہ دیورانیوں جیٹھانیوں کے جھٹے میں بیٹھی ساری روداد سنا رہی تھیں۔

"اور کیا ہم نے بچے نہیں جنے۔؟"
"وہی تو میں کہوں کہ شادی کے نام سے نئے گھوڑے ایسا بدکتے کیوں تھا۔"

"ڈال لیا ہے کسی لڑکی پڑی کو اپنے گھر۔"
بات اتنی ٹیڑھی تھی کہ بیٹے بیٹوں والی بہوؤں کے پیٹوں میں نہ رہ سکتی تھی۔ خالہ بی کو پھر بھی اپنا بیٹا ہی معصوم دکھائی دیا۔
"اے لو، حد ہو گئی۔! گھر میں بچے کچے ہیں ہی، خیال سے لے آیا کہ

وقت پر کسی چیز کی ضرورت پڑے تو جلد ہی مل جائے۔ ایک تم ہو کہ طومار باندھے لیتی ہو۔"

"وہ تو آنے والا وقت آپ ہی بتا دیگا۔ ہاں۔"

دوسرے دن محض ساس کی چوٹم چوٹ پہ ذاکر میاں کی بی بی نے الماری کا پٹ کھولا تو سب چیزیں غائب تھیں۔ مطلب یہ کہ حق حقدار تک پہنچ گیا تھا۔

اس دن کے بعد تو یہ ہونے لگا کہ آئے دن بہوئیں ساس کو قائل کرنے دیور کی چوری پکڑتیں۔ کبھی جیب سے پیپی نکل رہی ہے تو کبھی کوٹ میں سے ربر کی چڑیا۔ کبھی مٹھائی تو کبھی پیل، خالہ بی جان بوجھ کر انجان بنی رہیں۔

خالہ بی کا ایک خیال تو اپنی جگہ یہ تھا کہ جان جوان جی ہے۔ اگر اِدھر اُدھر جھانک تانک کرے تو برائی نہیں بلکہ قابلِ معافی ہے۔ مگر چھوٹے میاں تو اتنے دیوانے بن گئے تھے کہ سچ مچ کے دیوانے بھی ان کے سامنے سیانے تھے۔ اللہ جانے دل میں کیا سمائی، بانو کی معصوم جوانی پہ رحم آیا یا خود اپنا ہی راستہ صاف کرنا تھا کہ پھوپھی کے، ہاں جا پہنچے اور بولے۔

"بانو بہن کے لئے میں نے ایک بہت اچھی جگہ بات لگائی ہے۔"

"بانو بہن۔؟" پھوپھی بی حیرت سے چیخیں۔ "اے میاں ہونے والی بی بی ہے۔ بہن بھانجی کا رشتہ باندھو گے تو نکاح کہاں قبول ہوگا۔؟"

"نکاح کرتا ہی کون کم بخت ہے؛ میں نے تو شروع ہی سے اسے

اپنی بہن مانا ہے، کیونکہ اللہ نے مجھے خود کوئی بہن نہیں دی۔ وہی تو کہتا ہوں کہ بہن کا کچھ حق بھائی پر لگتا ہے۔ ایسی جگہ بات لگائی ہے کہ بہن بھی ساری عمر بھائی کو دعائیں دیتی رہے۔"

پھوپھی بی چھالیہ کی جگہ اپنی انگلی کتر گئیں۔ یہ گل بھی کھلنا ہی تھا۔ سو کھل کے رہا۔ بات چیت کا انداز ایسا سنجیدہ تھا کہ پھوپھی بی کو ہنسی مذاق کا کوئی پہلو نظر نہ آیا۔

چھوٹے میاں کے اپنے دوست تھے شمیم میاں، شہر میں تین تین دکانوں کے مالک۔ عمر بھی بس ان کے لگ بھگ۔ چاہتے تھے کسی شریف خاندان کی کوئی بیٹی اٹھائیں، چاہے غیر ہی کیوں نہ ہو۔ باپ مدت ہوئی مر چکے تھے۔ لے دے کے ایک ماں تھیں یا یہ خود۔ جو بھی بٹیا بیاہی جاتی لعلوں کی لعل رہتی۔ صورت شکل بھی ایسی کوئی بری نہ تھی۔ انہوں نے پھوپھی بی کو ایسی لچھے دار باتیں سنائیں کہ وہ بھی راضی جیسی ہوگئیں۔ اے اب جس کو بھرے دل سے بھر منہ سے، بہن کہہ کر پکار لیا، لاکھ وہ خون کے رشتے بہن نہ ہوئی مگر پھر بھی بہن کا مال ہی اولیٰ ہوتا ہے۔ یہ تو سراسر کہنا ہو گیا اور پھوپھی بی چھوڑ کوئی بھی اس بات پر کیا راضی ہو سکتا تھا کہ بہن کو بھائی سے بیاہ دیں۔ یہ تو دین دنیا دونوں میں روسیاہ کردینے والی بات ہوئی۔ صاف صاف لفظوں میں چھوٹے میاں نے اونچ نیچ بھی سمجھا دی کہ برائے خدا آپ بات کو یوں مشہور نہ کریں۔ ورنہ لوگ تو ہوتے ہی ہیں ایسے کہ کسی کا بنتا کام بگاڑ دیں۔ اور اس پر بھی یوں خوش ہوں جیسے کمال کر دیا ہے۔ کسی کا گھر جلے، بجائے بجھانے کے تاپنا شروع کر دیں۔

ایسے گپتا گپتی شادی کی تیاری شروع ہوئی کہ کسی کو پتہ بھی نہ چل سکا۔ سال چھ مہینے کو بڑی بہو میکے جاتی تھیں، اب کے سے جو آئیں تو کیا دیکھتی ہیں کہ بھرے گھر میں ہلور مچی ہوئی ہے۔ کپڑے گوٹے ٹھپے کا جیسے بازار کھلا ہوا ہے۔ بیٹھک میں سنار مٹھیا ٹھک ٹھک کئے جا رہا ہے۔ ادھر گودام میں اناج کی اٹھا پٹخ ہو رہی ہے تو دیواروں پہ رنگدار قلعی پھر رہی ہے۔ بات کا پتہ چلا تو بک چک ہی رہ گئیں۔ مگر عقل سے سوچا تو پھر خوش ہو گئیں کہ چلو ٹھیک ہی ہوا۔

چھوٹے میاں کا کیا تھا۔ دن رات ڈھلے رات آنا۔ باؤلوں کی سی شکلیں بنائے پھرنا۔ نہ کھانے کی سدھ نہ پینے کا دھیان۔ اور ٹریننگ کے بعد بھی بڑے ملتے تو وہی تین چار سو روپلی۔ یہاں تو بارش ہو رہی تھی اور بڑی بات یہ کہ لڑکا اتنی چاہت سے کر رہا تھا۔ ذاکر میاں کے بڑے بیٹے کے ختنے ہوئے تھے، پورے دوست احباب جمع ہوئے تھے، پھوپھی بی بھی مدعو تھیں۔ چھوٹے میاں نے غالباً آگے ہی سب طے کر رکھا تھا۔ لپکا جھپکی میں بانو کا دیدار شمیم میاں کو بھی کرا دیا اور وہ تھے کہ صحراؤں کی خاک چھاننے بنا ہی مجنوں ہو گئے۔

ادھر چھوٹے میاں کی ٹریننگ ختم ہونے میں دو ماہ رہ گئے تھے۔ اور خالہ بی خوش پہ خوش تھیں کہ چلو خدا نے وہ دن بھی لایا کہ اب چھوٹے بیٹے کے پھول کھلتے دیکھیں۔ اب شادی ہو گی تو آپ ہی سنبھل جائیں گے۔ اس دن بچوں کے گھیرے میں بیٹھی ہنس بول رہی تھیں کہ باہر سے ڈاک اندر بھجوائی گئی۔ نیلے نیلے دفعے نظر آئے تو خالہ بی نے بہوؤں کو آواز دی۔ بلقیس بی نے ایک دفعہ اٹھایا اور بھچک ہو کر بولیں۔

"ہائیں! یہ تو بڑے پھوپھا کی طرف سے ہیں۔"
"کس سلسلے میں مگر۔؟" خالہ بی چونک کر بولیں۔
"سلسلہ۔؟ سلسلہ یہی شادی کا۔"
"ہائیں۔؟" خالہ بی اور اچنبھے میں پڑ گئیں۔" وہ ئی بی کس کی شادی۔؟ کچھ آگے پڑھو گی بھی۔؟"
"صاف تو لکھا ہے۔" سنجلی دلہن نے ایک کنگورے دار گلابی رقعہ سامنے نچا دیا اور زور سے پڑھنے لگیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

بتقریب

عقد سعید نور چشمی سلمہا

شرکتِ محفلِ عقد و تناولِ طعام کا متمنی۔

حاجی عنایت علی خاں زمیندار

مقام:۔ لال حویلی	تاریخ ۲۵ ذی الحجہ ۷۶
حیدر آباد، دکن	روز پنجشنبہ، بعد مغرب

خالہ بی الجھ کر بولیں۔ "اے بی ڈھنگ سے پڑھو ذرا۔ کیا سنا رہی ہو یہ۔؟"
بلقیس دلہن کو غصہ آ گیا۔ "لو بھلا بیں ایسی نپٹ جاہل ہو گئی کہ شادی کا رقعہ بھی پڑھنا نہ آئے۔ پھوپھا میاں کی دو ہی تو بیٹیاں

ہیں نا اماں بی، ایک بڑی بھابی اور ایک بانو۔ اب بھلا وہ اور کس کی شادی کا رقعہ چھپوا سکتے تھے۔؟ اور پھر لال حویلی میں کون دلہن ہے۔؟"

"مگر لڑکا کون ہے۔؟ کیا پتہ ہمارا چھوٹے میاں ہی ہو۔"

"اے واہ!" منجھلی دلہن کو ایسے بے موقع ہنسی آئی کہ خالہ بی کی تیوری چڑھ گئی۔ مگر وہ ہنستے ہنستے ہی بولیں۔

"ہمارے دیور جی کی بات ہوتی تو کھلا کھلا نام ہی نہ چھپوا دیتے، یہاں تو جان بوجھ کر دونوں کے نام چھپائے گئے ہیں کہ کوئی بیچ میں ہاتھ نہ مار دے۔"

موہانی جان غصے میں بولیں۔ "لو اور سنو، بھلا کہیں شریف لڑکیوں کے نام یوں رقعوں میں چھپا کرتے ہیں؟ ہزاروں غیر مردوں کی نگاہ نام پر پڑے تو کیا شرافت رہ گئی۔!"

منجھلی دلہن تیکھے پن سے بولیں۔ "بھلا نہ سہی دلہن کا نام، دولہے کا نام تو لکھوا سکتے تھے نا۔؟"

اوپر سے چھوٹے میاں کوٹ پتلون ڈالے، ہاتھوں سے بال برابر کرتے برآمد ہوئے تو دیکھا پوری پنچایت موجود ہے اور معاملہ خاصہ اہم معلوم ہوتا ہے۔ سارا معاملہ سمجھ میں آگیا۔ ڈھٹائی سے بولے۔ "ہاں ہاں بانو بہن کی نسبت ہمی نے لگائی ہے۔"

سسرال میں بانو کی لاج کھلوائی بھی ہوئی، ساس مردے بول چال بھی شروع ہو گئی۔ مگر ادھر اتنے دن گزر لے پر بھی خالہ بی کے رویئے میں کوئی فرق نہ پڑا۔ ان کا جی تو ہر لمحہ یہی چاہا کرتا کہ بس چلے تو اپنے ہاتھوں اس کلمو ہے کا گلا گھونٹ دیں۔ مگر پھر سوچتیں کہ

کپیسے دردوں سے پیٹ پھاڑ کر جنا تھا تو ہاتھ مل کر رہ جاتیں۔ بھابیاں تو خالہ بی سے صاف کہتی تھیں۔

"کسی ایسی ویسی کو گلے باندھ لیا ہے۔"

اب خالہ بی کا یہ حال کہ جو، جو بھی کہے سن لیں اور منہ نہ ہلائیں۔ مگر غصے کے اظہار کا یہ طریقہ انہیں خود ہی نہ بھایا اور اب یہ چلن اٹھایا کہ آتے جاتے چھوٹے میاں کو تیز تیز نظروں سے دیکھا کرتیں اور دوسروں کو آڑے لے لے کر طعنے دیا کرتیں۔ بہوؤں کی منڈلی میں بیٹھ کر ایک دن کہا بھی۔

"میرے جیتے جی کون حرامزادی ہے، ذرا اس گھر میں قدم دھر کر تو دیکھے۔!"

کہاں تو چھوٹے میاں شہزادے بایتے تھے کہ شہزادی بدر کمال کو بیاہنا پڑا تھا یا اب یہ حال کہ اللہ جانے کس سڑی ماری کو گلے کا تعویذ بنا رکھا تھا۔ کہ نکالتے نہ بنتا۔

بات اب تک بھی ڈھکی چھپی ہی تھی، کسی کو معلوم نہ تھا کہ اصل بھید کیا ہے۔ خالہ بی کے دل کو بھی آس تھی کہ بات کچھ بھی نہیں، کوئی رکھی رکھیلی ہے نہ رانڈ رنڈی، بس چپ ہی بچھڑا اپنا گھوم رہا ہے۔ چار دن گھومے گا پھر یگا تو آپ ہی آپ رستوں پر آجائیگا۔ اور ایک آدھ دن کسی کبھاوج کا پلو پکڑ کر کہے گا۔

"بھابی ماں اب ہماری بھی کروا دو نا۔"

بیٹی غریب کی ماں کا تو یہ حشر ہونا ہی ہے کہ ہر آیا گیا پوچھ پوچھ کر ناک میں دم کر دیتا ہے۔ "کیوں بیٹھی ہے۔؟ کیوں بیٹھی ہے۔؟" مگر

کھانا کمانا جان جوان بیٹا بھی اگر یوں ہی ڈھکلیاں کھانا دکھائی دے تو ماں کی جان ضیق ہو جاتی ہے۔ خاندان میں لڑکیوں کی مائیں بھی تو تھیں ہی۔ اپنی اپنی بیٹیوں کی سب ہی ماؤں کو فکر ہوتی ہے۔ تو کیسے نہ لیں۔؟ کبھی کبھار خالہ بی کا جی چاہتا اکنا کر بول ہی دیں۔" شادی کے قابل ہی نہیں تو موا کیا کرے شادی۔!"

اتنے پر بھی خالہ بی تہیہ کئے بیٹھی تھیں کہ ڈھنگ کی لڑکی دکھائی دی تو بس حضرت کو کس ہی دوں گی۔ مگر حضرت تو ایسے تڑ سے پھڑ سے تھے کہ پیٹھ پر ہاتھ نہ دھرنے دیتے۔

گرمیوں کی چاندنی راتوں میں جب شام ڈھلتی اور رات اٹھتی تو سارا آنگن مہندی کی کچی کلیوں اور موگرے، موتیا کی کھلی، ادھ کھلی کلیوں اور پھولوں سے مہک اٹھتا۔ سارے بچے جمع ہوتے اور کھیل کود مچتا۔ چھوٹے میاں تھے تو چوبیس پچیس کے، مگر بھتیجوں بھتیجیوں سے مل جل کر بس بچہ ہی رہ جاتے اس رات خالہ بی سفید چاندنی بچھے تخت پر چھالیہ کترتی بیٹھی تھیں۔ بہوئیں ادھر ادھر پلنگوں پر ہنسی دل لگی کی باتیں کرتی پڑی تھیں۔ بچے سارے میں شور مچا رہے تھے کہ ادھر سے چھوٹے میاں نکل آئے۔

ساروں نے چھوٹے میاں کو جالیا۔

" چچا میاں کہانی، چچا میاں کہانی۔"

" ارررے۔" وہ کوٹ کا دامن چھڑاتے ہوئے بولے،" یہ کوئی وقت ہے کہانی سننے اور سنانے کا۔؟ پھر کبھی۔"

" اے لو۔! اور کون وقت ہوتا ہے کہانی کا۔؟" منجلی بھابی تنک

کر دیں، "پھر کیا صبح سویرے کہانی سنایا کرتے ہیں۔ اچھے ہاتھ کے چچا بنے ہو۔ کبھی تو بچوں کی بات مان جایا کرو۔"

"اچھا، اچھا۔" وہ ہنستے ہوئے وہیں جم گئے، "یوں خفا کیوں ہو رہی ہیں آپ۔ تو سنئے بچو! ایک تھا بڑا خوبصورت شہزادہ اور ایک وزیر زادہ۔ دونوں کا دل ہی نہ لگتا تھا۔ بس جناب شہزادے نے پالا ایک طوطا اور وزیر زادے نے پالی ایک مینا۔ بڑی خوبصورت سی کہ بس دیکھتے ہی جاؤ۔"

"میرے جیسی چچا میاں۔؟" صالحہ نے بڑی معصومیت سے پوچھا۔ سارے بچے کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ چھوٹے میاں بھی ہنستے ہنستے سارے چہروں پر نظریں دوڑانے لگے، گویا دیکھتے ہوں مینا کس جیسی تھی۔

"بڑی پیاری سی ننھی سی تھی وہ۔ منی سی ــ گڑیا سی ــ بس جیسے اپنی کاکل۔۔۔۔۔۔"

جانے کون سی رو میں چھوٹے میاں کیا کہہ گئے کہ ایک دم سے سٹ پٹا گئے۔ اور ادھر پوری فضا میں بم گر جانے کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ سب بیبیاں ایک دوسرے کا منہ تکنے لگیں اور خالہ بی کے ہاتھ کا سروتہ یوں ہی ننگا کا ننگا رہ گیا۔ اتنے سارے بچوں میں ایک کا بھی نام کاکل نہ تھا۔ اور کیسا انوکھا سا نام تھا۔ بھئی نام ہوا کرتے ہیں رابعہ، کلثوم، صالحہ، مریم، شاکرہ، زہرہ، سلیمہ۔ یہ کون تک ہے کاکل؟ خالہ بی کو اپنا ماں ہونا یاد آیا اور دوسرے ہی لمحے وہ ایک تنکے کے ساتھ اٹھیں اور عین چھوٹے میاں کے سر پہ پہنچ کر ان کے بال ہاتھوں

میں کھسوٹ ڈالے۔

"بول یہ کاکل کون ہے تیری ہوتی سوتی۔؟"

چھوٹے میاں کے منہ پر رنگ سا چھا گیا، بڑی مضبوط آواز میں بولے۔

"میں نے دو سال ہوئے شادی کر لی ہے اماں۔ اور کاکل آپ کی پوتی ہے اور میری بیٹی۔"

چھوٹے میاں اگر جھوٹ بولتے یا بہانہ تراشتے تو خالہ بی کے غصہ کو راہ مل جاتی، مگر انہوں نے اتنا بڑا، بے باک سچ کہہ دیا کہ خالہ بی کے ہاتھ ہی ڈھیلے پڑ گئے۔

"شادی کر لی۔؟" وہ مرے مرے لہجہ میں بولیں، "مگر کس سے؟"

"میرے ماتحت ایک کلرک ہیں، ان کی بیٹی ہے اماں۔ بہت غریب لوگ ہیں۔ بڑی اچھی لڑکی ہے۔ آپ بھی....."

خالہ بی کا رکا ہوا غصہ پھر بھڑک اٹھا۔ "ہاں ہاں غریب ہے۔ مگر بہت اچھی ہے۔ سو چھنالوں کی ایک چھنال ہو گی۔ ورنہ یوں بغیر گاجے باجے کے بچہ نہ جن لیتی۔"

چھوٹے میاں کا منہ تپ گیا۔ سامنے ہی سہمی سہمی بھتیجیاں کھڑی تھیں۔ آنسو ان کی آنکھوں میں ڈگڈگانے لگے۔ بڑا دل کر کے بولے۔

"قسم خدا کی اماں آپ نے مجھے جنا ہے اور آپ کا اس سے بھی بڑھ کر حق لگتا ہے کہ جو چاہیں کریں۔ جو چاہے کہیں۔"

گھر کی ہنتی گاتی فضا میں ایک رکا رکا پن آ گیا۔ بچے قصور کرتے ہیں تو ماں باپ معاف کر ہی دیتے ہیں۔ مگر قصور بھی قصور جیسا ہوا۔

یہ نہیں کہ زندگی جیسی زندگی کا ساتھ، اور ہاتھ پکڑ لیا ایک کلرک زادی کا! جس کے خاندان کا پتہ نہ برے بھلے کی خبر۔ خالہ بی کا غصہ بجا تھا۔ بھابیاں منہ دیکھ بات نہ کرتیں، بھائی کھنچے کھنچے رہتے۔ اتنے بڑے کنبے میں رہتے سہتے کبھی چھوٹے میاں خود کو اکیلا اکیلا محسوس کرتے۔

برسات کے دن لگے، بدلیاں چھائیں۔ برسائیں جاتیں کبھی چھائیں اور ہوا کے زور سے بکھر بھی جاتیں۔ موسم بدلا تو سب کی طبیعتیں بھی بگڑنے لگیں۔ بچوں پر زیادہ زور پڑا، ناکیں سڑ سڑانے لگیں، ٹھوں ٹھوں کھانسنے لگے، آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔

خالہ بی کی اپنی ایک چھوٹی سی الماری تھی، اس میں ہاتھ کی بنائی ہوئی، گھر کی تیار کردہ دوائیں رہتیں۔ کھانسی زکام سے لے کر ہیضے بخار اور پھوڑا پھنسی تک سبھی بیماریوں کی دوائیں۔ بڑے نانا طب کرتے تھے اور ان کے نسخے خاندان بھر میں چلتے تھے۔ ہاسپٹل کی دوا سے تو خالہ بی کا پرانا بیر تھا۔

"موا گھوڑوں پانی ملا دیتے ہیں، کیا فائدہ کرے گی۔؟" کوئی مارے ترقی پسندی کے دوا خانے کی لال پیلی دوا لے بھی آتا تو موری میں سے ہوا شمتی دیکھ کر جان جاتے کہ خالہ بی نے بہا دی ہوگی۔

پچھلے چار پانچ دنوں سے چھوٹے میاں اپنے آپ میں نہ تھے۔ کھوئے کھوئے سے، بجھے بجھے سے۔ آنکھیں سرخ اور جاگی جاگی سی بال الجھے بکھرے۔ عجب ہونقوں کی سی صورت بنائے پھرتے تھے کسی سے بول نہ چال، بس اپنے کمرے میں پڑے ہیں۔ صبح ہوئی باہر گئے، دوپہر

کا کھانا کھانے آتے، سہ پہر شام کو پانچ بجے کی بجائے رات کے گیارہ بارہ اور کبھی تو دو بجے کی خبر لاتے۔ زندگی کا معمول عجب بدلا بدلا سا ہو گیا۔

صالحہ کی کھانسی نے زور پکڑا تو دادی کو ہول ہو گئی جیسکی پڑ یا تو جاری ہی تھی، بوا کریمن نے ڈرا وا دیا۔ "اے بی کالی کھانسی ہے۔ پہلے کو شروع میں علاج کروالو ورنہ جو پڑ جیب گر گئی تو بٹیا عمر بھر کو گنگا نی ہو جائیں گی۔"

رات کے گیارہ بارہ کا وقت تھا، خالہ بی نیند بھری آنکھوں سے اٹھ کر الماری والے کمرے کو چلیں۔ ابھی دروازے میں ہی تھیں کہ مل گجے اجالے میں دیکھتی ہیں کہ ان کے اپنے کمرے سے چھوٹے میاں شیشی پکڑے نکل رہے ہیں۔ ماں کو آتا دیکھا تو بوکھلا سے گئے اور شیشی ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ ماں نے بیٹے کو گھور کر دیکھا۔ آنکھوں کی سرخی کا تعلق دل کے درد سے ہوتا ہے۔ چھوٹے میاں کی آنکھ سرخ تھی۔ دل نے درد ضرور کھایا ہوگا۔ اماں نے بھن پھنا کر فرش کو دیکھا۔ سارے میں کالی کھانسی کی گولیاں بکھری ہوئی تھیں۔ کلپ کر کوسا دیا —

"جیسے گھورے پہ پیدا ہوئی ہے ایسے ہی مر بھی جائے۔ ہونہہ! علاج ہو رہے ہیں لاڈلی کے۔ ہمارے خاندان میں ٹیک، لگا دی کمبختوں نے۔"

سورج اور چاند کسی کی راہ نہیں دیکھتے، چڑھتے اترتے رہتے ہیں۔ دن تو گزرتے ہی ہیں اور گزرتے ہی رہے۔ ماں بیٹے کے بیچ خفگی اور غصے کی جو دیوار کھڑی تھی وہ جوں کی توں ہی رہی۔

سرما کے دنوں میں پھلوں کا خوب موسم ہوتا ہے۔ خالہ بی نے

ڈھیر سی سرخ سرخ گاجریں خریدیں۔ ان کے بن کش کئے، ساس بہوؤں نے مل جل کر دیگچہ چڑھایا۔ گھر کی بھینسیں تھیں، کھویا خوب تھا۔ سیر دو سیر کھویا بھی اس میں لنڈھا دیا۔ وہ مزے کا حلوا بنا کہ چار گھر دور تک خوشبو اڑ اڑ گئی۔ دستر خوان بچھا، سبھی بیٹھے۔ نوکر چھوٹے میاں کو بھی بلانے گیا۔ مگر وہ اپنے کام میں الجھے ہوئے تھے، بولے۔

"میرا کھانا یہیں پہنچا جا۔"

جب سے انہوں نے خالہ بی کی چھاتی پر سل رکھ دی تھی۔ یہ ان کے برے بھلے میں نہ بولتی تھیں۔ جیسا کہتے، کر دیتیں۔ "مر دکہ جیو، ہمیں کیا لینا ہے۔؟" اور ادھر چھوٹے میاں تھے کہ مچھلی کا کانٹا ہو کر رہ گئے تھے۔ کہ مچھلی کا ہی انگ ہوتا ہے مگر کوئی منہ نہیں لگاتا۔

نوکر نے کھانے کا طشت ان کے کمرے میں پہنچا دیا۔ ابھی سر پوش اٹھایا بھی نہ تھا کہ الائچی اور گھی کی خوشبو سارے میں پھیل گئی اور ناک سے ہوتی دل میں اتر گئی۔ سر پوش اٹھا کر دیکھا۔ گہرے سرخ رنگ کا حلوہ، چاندی کے ورق لگے ہوئے۔ ابھی چھوٹے میاں نے ایک چمچہ اٹھا کر منہ میں رکھا ہی تھا کہ کوئی حلق میں آ کر اٹک گیا۔ ہاتھ یوں ہی چھوڑ دیا۔ اِدھر اُدھر دیکھا، باہر سب کھانے میں مگن تھے۔ برتنوں چمچوں اور رکابیوں کی کھڑ دھڑ ہو رہی تھی۔ جلدی سے اٹھے، اخبار میں سے ایک بڑا سا کاغذ نکالا اور پلیٹ اٹھا کر اس میں لپیٹ لی۔ جیب سے دستی نکال کر پوٹلی سی بنا لی اور الماری میں رکھ خود طشت کے پاس کھڑے کھڑے الٹے سیدھے نوالے ٹھونسنے لگے۔

خالہ بی عشاء کی نماز پڑھ کر لیٹی تھیں۔ ابھی ابھی گھر بھر کے چراغوں کی لو نیچی کر کے گئی تھیں اور سارے بیں مل گجا مل گجا سا اجالا پھیلا ہوا تھا۔ سب اپنے اپنے بستروں پہ پہنچ گئے تھے۔ چھوٹے میاں نے ادھر دروازے میں سے جھانکا، ساتھ دیوار پران کے سر کا سایہ ابھرا اور پھر اندر ہو گیا۔ خالہ بی کی بند ہوتی آنکھیں کھل گئیں۔ پھر دھیرے سے چھوٹے میاں نے پوٹلی اٹھائی اور کمرے سے باہر ہو کر پٹ اندر بھیڑ دیئے۔ چپکے چپکے قدم اٹھا رہے تھے کہ پیچھے سے کسی نے ایسا ڈرا دیا کہ پوٹلی دھپ سے نیچے جا گری اور اسی دم تین چار ٹکڑوں میں ٹوٹ ٹوٹ گئی۔ انہوں نے پیٹھ موڑ کر پیچھے دیکھا۔ خالہ بی کانپتی کھڑی تھیں۔ گرجدار آواز سے بولیں۔

"اے ہے! پیاز وں پیٹے حلق میں اٹک جاتے ہیں نا۔ خبردار! جو دانہ بھی باہر نکالا۔ حضرت کے نام سے فاتحہ دلوائی تھی تو ایسے حرام خوروں کے لئے نہیں۔"

چھوٹے میاں کے جی کو جیسے روگ لگ گیا۔ ہونٹوں کی ہنسی جیسے کسی نے چرا لی۔ کہاں تو وہ ہونٹ کہ سدا پھولوں کی طرح کھلے رہتے یا اب یہ حال کہ آنکھوں میں شبنم سی گھلی رہنے لگی۔

بڑے بھائی جان تھے، پھر اختر بھائی، اچھے بھیا، عزیز بھائی ذاکر بھائی، پھر چھوٹے بھیا کہ گھر بھر میں ان کے اور ان کی بیویوں بچوں کے قہقہے اچھلتے رہتے۔ اماں کو ہر بات کا چاؤ چونچلا۔ کوئی دن نہ گزرتا کہ کسی کی سالگرہ نہ ہوتی ہو۔ کسی کا عقیقہ ہے تو کسی کی چھٹی کسی کا بوٹن ہے تو کسی کی دودھ بڑھائی۔ بھابیاں ایک سے ایک

رنگا رنگی کپڑا پہنتیں۔ زیور سے سجی بنی، ہنستی بولتی گھومتی ہیں۔ اور بھائی ہیں کہ کھلے خزانے دھڑسے دروازے بند کرتے ہیں۔ دلہنوں کے ساتھ راتیں گزارتے ہیں اور علی الاعلان حمام تیار کرواتے ہیں۔ ایک چھوٹے میاں تھے کہ چولوں کی طرح راتیں سجاتے۔

کاکل سال بھر کی ہونے کو آئی تو باپ کو چونچلا سوجھا۔ سال پورا ہونے میں تین دن رہ گئے تھے۔ پاس میں کیا رکھا تھا۔؟ ٹریننگ ورننگ سب گئی چولہے بھاڑ میں، دل پر ایسا پتھر آپڑا تھا کہ کسی بات میں نہ رہے، کوئی بات ڈھنگ سے نہ کر پاتے۔ باپ تھے کہ ماں کے کہے میں، اور جب ماں نے ہی ہر طرح سے پابندی لگا دی تو کیا پھوٹا دھیلا کبھی ہاتھ پڑتا۔ ہاں بس انگلی میں زمانے سے سونے کی تو ماشے کی انگوٹھی پہنے رہتے ہیں۔ سوچ لیا ہے کہ رانی بٹیا کی سالگرہ اسی سے رچائیں گے۔ دل امیروں کا بھی ہوتا ہے۔ اور غریبوں کا بھی۔ ارمان تو سبھی کو لگے ہوئے ہیں۔

دکانوں دکان گھومتے رہے۔ موتیوں کا ہار، سستی قیمت کا ریشم کا سلا سلایا فراک، ننھے منے سرخ جوتے اور چاکلیٹ کا ایک ڈبہ، لیجئے صاحب تحفہ کا تو رکی گڑیا۔ سارا سامان الماری میں ڈرپ کر کے کام سے باہر گئے ہوئے تھے کہ بچوں میں سے کسی کی نظر پڑ گئی کہ چچا میاں کی الماری میں تو رنگ برنگی دکان سجی ہے۔ تمام گھر والے میں بوم ہوگئی کہ لو بھئی اب تو ایسے ڈھیٹ ہو گئے ہیں کہ دن کی روشنی میں اپنی رکھیلی کے لاڈلوں کو سجانے کے جتن کرتے پھرتے ہیں۔

ایک منہ سے نکلی اور دوسرے منہ تک پہنچی۔ گھر تھا کیا موا

اچھا خاصا چھلنی تھا کہ ادھر بات پڑی نہیں کہ ادھر ٹپک پڑی۔ خالہ بی دراتی ہوئی کمرے میں پہنچیں۔ بڑے سلیقے سے خریدا گیا تھا۔ سارا سامان ننہامنا سا سرخ فراک، چھوٹے چھوٹے لال لال جوتے، مالا، چاکلیٹ کا چم چماتا ڈبہ۔ ایک پٹھے کے ڈبے پر ایک چٹھی لگی ہوئی تھی۔

"یہ کیا لکھا ہوا ہے رے؟" انہوں نے ڈپٹ کر نسیم میاں سے پوچھا۔

"جی..... جی دادی اماں ابھی پڑھتا ہوں۔" وہ اٹک اٹک کر سنانے لگے۔ "ننھی گڑیا کی سالگرہ پر — ارمان بھری پہلی سالگرہ پر اس کے باپ کی طرف سے۔"

خالہ بی نے سارے سامان پر نظر کی اور جلتے گھی میں ٹھنڈے پانی کے چھینٹے ایسے پڑ گئے۔

"لو اور سنو۔ اچھی نہ چلے موئے حرامی پلے۔ ہماری نقل میں سالگرہیں پڑتی ہیں۔" اور خالہ بی نے ایک لات جوتوں کو ماری، ایک ہاتھ سے فراک کھسوٹا، مالا اور چاکلیٹ کا ڈبہ زمین پر دے لیے۔ لگے اور رہی سہی ہاتھ کی صفائی ڈبے پر ہوگئی۔ ڈبہ دور جا گرا! اور اس میں سے بڑی سی کافور کی گڑیا نکل کر دو گڑیاؤں میں بٹ گئی۔

آنسو بزدلی کی نشانی ہیں۔ اور غصہ بغاوت کی۔ مگر اس دن تو چھوٹے میاں کی آنکھ بھی نم ہوئی اور غصہ بھی بے بھاؤ آیا۔ یوں دکھا لینے کو تو ہاتھ بھی ناک دکھا دیتے مگر گھر دار الگ مانڈنے کی سوچتے تو اتنا کس بل کہاں تھا؟ ابھی نہ کمائی کا کوئی ٹھور ٹھکانا تھا نہ اور کوئی دوسری آمدنی۔ ورنہ جی تو یہی چاہا کہ اکدم سے گھر چھوڑ

کر چل ہی دیں۔ سالگرہ کی کیسی مٹی پلید ہوئی۔ ؟ خود پہ ہی غصہ آیا کہ جلدی میں سب سامان کھلا چھوڑ چلتا بنا، ورنہ کسی کے فرشتوں کو بھی نپہ نہ لگتا۔ گڑیا کے ٹکڑے دیکھ کر رات بھر دل میں رہ رہ کر ٹیسیں اٹھتی رہیں۔ "اب اس گھر میں نہ رہوں گا۔" انہوں نے دل ہی دل میں طے کر لیا۔

جس دن کا کل بیٹیا کی سالگرہ پڑتی تھی باپ اپنے کمرے میں منہ لپیٹے چپکو پہکو روئے جاتے تھے۔

مردوں کا ادھر ادھر نگاہیں جھکانا عام سی بات ہے۔ اور کنواروں کا کیا ذکر ہے۔ اچھے گھر بھر کے بچے ہیں، بیوی ہے، ایسوں کو بھی کبھی باہر کی چاٹ لگی۔ تو کو ٹھا جا لیسا یا۔ اس میں حیرت کی بات ہے نہ غصہ کی۔ مرد کی ذات ہوتی ہی ایسی ہے۔ خود خالو میاں کا حال کیا ڈھکا چھپا تھا۔ نوشکی کے بہلنے سال چھ مہینے میں دو چار دفعہ باہر کی ہوا کھانے ہی تھے اور دوسری ہی نوشکی ؛ ملکہ کر لوٹتے تھے۔ مگر ایسا بھلا کہاں ہوتا ہے کہ ایسی ویسی عورتوں کو سر ہی چڑھا لیا جائے ؛ دل آجانا کچھ بری بات نہیں، اللہ نے آنکھ دیکھنے کو دی ہے اور اگر چلنے پھرنے کوئی چاند سی صورت آنکھ میں کھب گئی تو کیا ہوا۔ ؟ مگر یہ تو بری بات ہوئی کہ اس کو گھر کی رانی بنی بنا ڈالیں۔

بھلے سبھاؤ میں ایک دن منجلی بہو نے ساس کو رائے دی تھی بھی کہ چھوٹے بھیا کو معافی دے دیں۔ مگر خالہ بی کا بھی وہ حال تھا کہ جو کہا تو مدت ہوئی بجھ چکا تھا، مگر تپش ابھی تک باقی ہی تھی۔ ذاکر میاں کی بی بی کا کہنا تھا کہ ضرور چھوٹے میاں کی بی بی اچھے گھر اور اچھے

عادتوں کی ہے، تب ہی تو وہ اب تک اس سے لگے ہوئے ہیں۔ ورنہ مرد لوگ تو جہاں کوئی کھوٹ خرابی دیکھتے ہیں بس جی چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ اور لگتا ہے دل کی بھی بری نہیں۔ انہوں نے پچھلے دنوں کا واقعہ یاد دلایا کہ سردی کا زور ہوا تو چھوٹے میاں بڑے بھائی جان، اچھے بھیا اور عزیز بھائی کے گود کے بچوں کے لئے ہلکے نیلے رنگ کے اون کے بنے ہوئے چھوٹے چھوٹے موزے اور ویسی ہی ٹوپیاں لائے تھے۔ بھابیوں نے پوچھا بھی۔

"کہاں سے لائے میاں۔؟ کیا قیمت ہے۔؟"

تو ذرا مسکرا کر بولے۔ "میرے دوست کی دوکان ہے وہاں سے لے آیا۔" بھلا کون دوست الیاجی والا تھا کہ گھر بیٹھے بھکٹ میں اپنا نقصان کروانا۔؟ اور منجھلی بھابی نے جو بنوٹ دیکھی تو صاف پہچان لی کہ گھر کی ہی بنائی ہے۔ اب ظاہر ہے یہ اسی کا کام ہو سکتا ہے۔ ورنہ اور کس کا پھیپھڑا اچھلے گا۔؟

مگر وہ تو خالہ بی تھیں اپنے نام کی۔ مرتی مر جاتیں مگر کبھی یہ رسوائی نہ کرتیں کہ غیروں کی بیٹی ان کی بہو کہلائے۔ اور غیر بھی کیسی کہ جس کے خاندان کا نہ پتہ نہ ذات پات کی خبر۔ کیا غیروں کی بیٹیاں نہیں اٹھایا کرتے۔؟ مگر وہ بھی ذرا تمیز سے، دیکھ بھال کے۔ ایسے نہیں کہ بس راہ چلتی کو دیکھا اور آنکھوں کا کاجل بنا لیا۔

اس دن تو خالہ بی کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ گھر بھر میں بچے ادھم مچا رہے تھے اور تمام مائیں بیٹھی خوش ہو رہی تھیں۔ بیٹے اپنے اپنے کمروں میں تھے۔ باہر بھی نکل آتے کام سے، پھر اندر چلے جاتے۔ کیسی

چہل پہل تھی۔ ہلکی ہلکی بوندیں برس رہی تھیں، بڑا سہانا سہانا سماں تھا۔ اور تو سب تھے، بس چھوٹے میاں ہی وہاں نہ تھے۔

خالو میاں نے اِدھر اُدھر دیکھا اور کچھ رک رک کر بولے۔

"اجی میں کہتا ہوں بچے غلطیاں کرتے ہی ہیں۔"

خالہ بی سمجھیں ان کھیلتے بچوں میں سے کسی نے شرارت کی ہو گی۔ اس پر کہہ رہے ہوں گے۔ بولیں۔

"ہاں اور بچے کرتے بھی کیا ہیں۔؟"

باپ خوش ہو گئے۔ سمجھے بات بن گئی۔ بولے: "وہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں کہ اب ہوا سو ہوا۔ جوان بچہ ہے۔ جان پر کھیل گیا تو کیا کر لینگے۔ آنے دو گھر میں چھوٹی بہو کو بھی۔؟"

خالہ بی نے تڑک کر ان کی طرف دیکھا۔

"اے لو یہ بیٹے کی پشت پناہی ہو رہی ہے۔ ہوتا ہو گا تمہارے بڑوں میں کہ راہ چلتیوں کو گھر ڈال لیں، میرے ہاں ایسا ہوا تھا نہ ہو گا۔ میں بھی سمجھی کیا کہنے جا رہے ہیں۔ اچھا ہوا جو میرے سامنے کہتے تو۔ سامنے قبلہ ہے۔ ہاں سچ کہتی ہوں ہاؤلی میں چھلانگ لگا دیتی۔ غضب خدا کا ذرا دیکھو تو کیا دن آیا ہے کہ دیدوں کے سامنے ایسی واہیات حرکتیں ہوں اور ہم مان بھی جائیں۔ سچ سناتی ہوں کہ کتے کو ساتھ بٹھا کر کھلاؤں پر اس حرافہ کو اپنے در پہ نہ پھٹکنے دوں کہ میری کوکھ کی بد دعا سمیٹ رہی ہے۔"

خالو میاں چپ رہ گئے۔ جیل حجت زیادہ کرتے بھی نہ تھے۔ وہ خود بڑے سخت قسم کے آدمی تھے پر روایتی بادشاہوں کی طرح انہیں

بھی ساتواں شہزادہ بے حد عزیز تھا۔ بچپن میں بڑے بچوں کو مارا ہو تو مارا ہو، چھوٹے میاں کو تو کبھی دھکا بھی نہ دیا۔ کیسی ہی ضد کیوں نہ کرتے پوری کر دیتے۔ ادھر ماں بگڑتی ہی تھیں کہ چھو کرنے کو دو کوڑی کا کر دو گے۔ مگر ان سے سہارا کہاں ہوتی کہ چیز سامنے دھری رہے اور بیٹا بلکتا رہے۔

اب بھی ان سے کہاں سہار ہو رہی تھی۔؟ بیوی تھی کہ چاہ گھر پہ ہی تھی اور بیٹا تھا کہ خالی پہلو سوتا تھا اور مرد ہوتے بھی عورتوں کی طرح بلکتا تھا۔ مگر زیادہ زور دیا کبھی نہیں۔ جانتے تھے خالہ بی سدا کی سیکڑی ہیں، بات غصے کی ہو یا مذاق کی، جو کہتیں پورا ہی کر دکھاتیں۔

رمضان کی عید آئی اور اسی زور شور سے آئی جیسے کہ سدا آتی تھی۔ گھر بھر میں وہی چہل پہل مچ گئی۔ بچے اپنے کپڑے لے کر بھاگ رہے ہیں۔ مائیں ڈانٹ رہی ہیں۔ ادھر خالہ بی کی نوکروں پہ پڑتال پڑ رہی ہے کہ نمازی عیدگاہ جانے کو تیار بھی ہو گئے تو کسی کام کا ٹھکانا ہی نہیں۔ ادھر لڑکیاں ہاتھوں کی مہندی چھڑا رہی تھیں تو بیٹے نہا نہا کر نکل رہے تھے اور رول مچا رہے تھے۔ کوئی کمربند نہ ہونے کی شکایت کر رہا تھا تو کسی کو اپنا جوتا ہی نہ ملتا تھا۔ کسی نے اپنی اچکن کے بٹن نیچے اوپر لگا لئے تو کسی کا ازار بند ٹخنوں تک لٹک رہا ہے اور اسے کھو سنے تک کی بھی سدھ نہیں۔

اتنے ہنگاموں میں ایک چھوٹے میاں بھی تھے کہ خاموش سے تھے۔ اٹھے، چپ چاپ غسل کیا۔؟ صاف کپڑے بدلے اور نماز گاہ کو چل دیئے۔ ماں بیٹے کا مدت سے ابولا بند تھا۔ نہ یہ ان سے بات

کرتی تھیں نہ وہ خود ہی رخ دیتے تھے۔ عید کے دن تو بڑے دشمن بھی گلے مل لیتے ہیں۔ یہ تو اپنے پیٹ کی اولاد تھا۔ مگر چھوٹے میاں نے آکر سلام کیا تو خالہ بی نے منہ پھیر لیا۔ گلے لگا نہیں تو دعا دینی ہی پڑتی۔

"خدا بڑی عمر کرے۔ سہرے کے پھول کھلیں۔"

مگر سہرے کے پھول تو آگے ہی کھل چکے تھے اور کس کے نام سے۔ غصہ کی ایک لہر اٹھی اور ان کے پورے جسم میں دوڑ گئی۔ چونکا ہوا بیٹے نے ماں کو دیکھا۔ غصے میں دھاں پھول، دھاں پھول کرتی ہوئی چپکے سے اپنے کمرے میں جا پڑے۔

خالہ بی کھلانے پلانے کے انتظام میں لگ گئیں۔ سب ہی لوگ عیدگاہ سے واپس آچکے تھے۔ سات بیٹوں کی ماں، چھ بہوؤں کی ساس، ڈھیر سارے پوتوں پوتیوں کی دادی کہ سلام دعا لیتے دیتے ہی گیارہ بج گئے۔ مردوں کی عیدگاہ سے واپسی پر عورتوں کی عید جمتی ہے۔ زنانے میں دھوم مچ گئی۔ ساس پیڑھی پر بیٹھ نگاہ دل کو ٹھنڈک پہنچانے لگیں۔

بڑی دلہن نکلیں۔ ہری بنارسی ساڑی، جبڑ کا جھول زیور، سنگھار پٹار کئے مسکراتی ہنستی، کن انکھیوں سے میاں کو دیکھتی ہوئیں۔ ادھر سے منجھلی دلہن آئیں۔ کھڑا المخواب کا پاجامہ، بنارسی چولی کرتی۔ تاش کا دوپٹہ، گہنے پاتے سے سجی بنی۔ عزیز میاں، ذاکر میاں۔ اکرم میاں کی دلہنیں ایک دوسرے سے چھیڑ کرتی۔ ہنستی مسکراتی صورتیں۔ پھر بلقیس آئیں۔ چھیوں بہوؤں میں یہ سب سے زیادہ پیاری تھیں۔ سرخ کامدار نولوان ساڑی پہنے، چھ مہینے کا پیٹ اونچا ابھرا ہوا مسی کی دھڑی اور مانگ میں افشاں۔ ایسے بھاری زیور کپڑے

اور پہننے والی ایسی نازک پھول پان ! چلنا دوبھر ہو رہا تھا۔ بچے رنگین کپڑوں میں ملبوس، منہ میں پان ٹھونسے تھوکتے پھر رہے تھے۔ کبھی باہر تو کبھی اندر، ابھی یہاں کہ ابھی وہاں۔ مردانے میں ملنے والے آئے اور بادلِ نخواستہ مرے مرے قدموں سے چھوٹے میاں بھی عید ملنے، مصافحہ کرنے گئے۔

اک دم اندر سے بچوں کا شور اٹھا اور ہاتھوں میں ایک بنڈل سا لپٹے لے کے آئے۔ آٹھ بارہ آنے گز میں ملنے والے سرخ ریشم کی ساڑی اور ایسی ہلکی قسم کی کہ پہننے والی ذرا بھاری کولہے کی ہوئی تو ایک ہی دھوپ میں مسک مسک جائے، اور ایک سرخ ہی رنگ کا بھاری سا فراک، جس پر جگہ جگہ نگر ستارے ٹنکے ہوئے تھے۔ چھوٹے چھوٹے۔ یہ یہ ایک مجبور شوہر اور ارمان بھرے باپ کا آنسو بھرا تحفہ تھا۔ صبح یوں ہی خالہ بی ساروں کے کمروں میں اگر بتیاں سلگاتی پھر رہی تھیں کہ انہیں سرخ پلو جھانکتا ہوا دکھائی دے گیا تو انہوں نے کہاں سوچا تھا کہ یہ عید کی سجاوٹ بناوٹ ہے۔ وہ بڑے غور سے ساڑی کو دیکھنے لگیں۔ ان کی نظر کے سامنے سے بڑی دلہن گزریں۔ جن کی بنارسی ساڑی جھم جھم جھمک رہی تھی۔ سو دو سو سے کم کی کیا ہوگی۔ ؟ پھر منجھلی دلہن کہ کمخواب کا پاجامہ ہی سو ڈیڑھ سو کا ہوگا۔ کرتی، چولی، دوپٹہ تو الگ رہا۔ پھر چھوٹی بہوئیں، جن کے کپڑے ایسے بھاری، کامدار تو لوال کہ چلنے میں لپک لپک جاتی تھیں۔ اور یہ ساتویں شہزادی کیا پہن رہی ہے آج۔ ؟ خالہ بی کا جی اندر سے بچل اٹھا۔ تیز تیز قدموں سے چلتی وہ چھوٹے میاں کے کمرے میں آئیں اور بنڈل کر سی

پر پٹخ، الٹے پیروں واپس نکل گئیں۔

چھوٹے میاں کمرے میں داخل ہوئے، گھڑی پر ایک نظر کی، ساڑھے بارہ ہو رہے تھے۔ کرسی پر سے ہنڈل اٹھایا، ابھی ایک قدم باہر اور ایک اندر ہی تھا کہ خالہ بی لپکی ہوئی آگئیں۔ ہاتھوں میں بڑا سا طشت سنبھالے، جس پر جھالر میں لگا ہوا سرخ کپڑا لٹک رہا تھا۔

طشت میز پر ٹکا کر انہوں نے چھوٹے میاں کا کندھا جا پکڑ لیا۔ ان کی آنکھیں یوں گیلی گیلی تھیں کہ ماں کا جی کٹ گیا۔

"کہاں جا رہا ہے۔؟" انہوں نے تن تنا کر پوچھا۔

چھوٹے میاں نے کچھ جواب نہ دیا، سر جھکا لیا۔

خالہ بی نے ہنڈل ہاتھ سے جھپٹ لیا۔ تلخی سے بولیں۔ "اور یہ کیا ہے۔؟"

"چھوٹے میاں نے کوئی جواب نہ دیا تو ترشی سے بولیں۔

"عید کا جوڑا ہے نا۔؟"

چھوٹے میاں پھر بھی سر جھکائے کھڑے ہی رہے۔

"کلموہے عید پر کوئی ایسا ہلکا جوڑا بنایا کرتا ہے۔؟"

چھوٹے میاں نے چونک کر ماں کی طرف دیکھا جو غصے غصے بول رہی ہیں۔

"مقبول میاں کی بہو اور یہ بارہ آنے گز والا ریشم! شرم تو نہیں آئی تجھے اپنی دلہن کو ایسا کپڑا پہناتے ہوئے۔؟"

چھوٹے میاں کو کوئی جواب ہی نہ سوجھا۔

"یہ جوڑے لے جا اور اپنی دلہن کو پہنا کر لے آ۔ اکیلے میں اس کا

جی گھبراتا ہوگا، یہاں چار دیں جی بہلے گا۔" انہوں نے سرخ بنڈل کی طرف نفرت سے دیکھا۔

"تجھ سے تو اتنا بھی نہ ہو سکا کہ ہلکی پھلکی کرن بانکڑی ہی خرید لیتا کہ ساڑی ساجری تو ہو جاتی۔" اور انہوں نے طشت پر سے طشت پوش ہٹا دیا۔ چھوٹے میاں نے ایک ہی نظر میں دیکھ لیا۔ یہ وہ پانچ کامدار جوڑے تھے جو اماں نے بڑے چاؤ سے اپنی بہو کے لئے خود اپنے ہاتھوں تیار کئے تھے۔

☆

صفدر میاں غسل خانے سے باہر نکلے تو دیکھا سامنے ہی منیر میاں بیٹھے ہیں۔ سامنے رابعہ بیگم لیٹی ہیں اور یہ ہیں کہ انہماک سے انہیں دیکھے جا رہے ہیں۔ تھوڑی دیر تک تو یوں ہی محویت سے دیکھتے رہے، پھر ایک دم ان کا فراک گھٹنوں تک سرکا دیا۔ چکنی چکنی اور صندلی پنڈلیاں عریاں ہو گئیں۔ منیر میاں آگے جھکے اور اپنی انگلیاں پنڈلی پر چلانے لگے۔ رابعہ بیگم نے ایک بار اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھول کر پاس بیٹھے ہوئے منیر میاں کو دیکھا اور پھر آنکھیں موند لیں۔ مگر انگلیوں کے لمس سے جو گدگدی محسوس ہو رہی تھی اس کی وجہ سے ان کے پتلے پتلے اور گلابی ہونٹوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

صفدر میاں ایک لمحے کو یہ سب کچھ دیکھتے رہے پھر چلا کر بولے
"کیا کر رہا ہے نامعقول۔؟ اور یہ چونچ بھی لال کر رکھی ہے۔ کیوں میاں صاحبزادے۔؟"

"جی۔!" منیر میاں بوکھلا گئے۔

"اسکول نہیں گئے آج۔؟" وہ پھر گرجے۔

"جی پیٹ میں دلد (درد) ہے۔" منیر میاں تو تلا کر بولے۔

بھی گو۔ ننکو میاں سے ابھی دو کا پہاڑا سنتا ہوں۔!"
منیر میاں نے ایک بار تو اپنے باپ کی طرف دیکھا، پھر تین برس کی اس ننھی منی گڑیا۔ رابعہ کی طرف ۔۔۔ اور باہر کھسک گئے۔ صفدر میاں پھر چلائے۔ "سات برس کا گھوڑا ہو گیا اور اب تک پہلی جماعت میں ٹنگا پڑا ہے نامعقول کہیں کا۔"
رابعہ ان کی گرجدار آواز پر چونک کر اٹھ بیٹھی۔ ایکدم اس کی نگاہ اپنی پنڈلی پر پڑی۔ اسی لمحے صفدر میاں کی نگاہیں بھی اسی دھبے سے جاکر ٹکرا گئیں۔
یہ منیر میاں کے ننھے منے ہونٹوں کا سرخ سرخ نشان تھا۔ گویا دہکتا ہوا انگارہ۔!
غالباً تنہائی میں انہوں نے رابعہ کی پنڈلی کا بوسہ لیا تھا۔

منیر میاں

چھوٹی بیگم نے کیا کیا پاپڑ نہ بیلے، مگر منیر میاں کے سہرے کی کلیاں کھلنی تھیں نہ کھلیں۔ بات کچھ بھی ہوئی، مگر یہ نوبت ہی نہ آئی کہ منیر میاں کبھی زرتار صافہ باندھتے، یہ جھم جھماتا سہرا سجاتے اور گھوڑے پر بیٹھ چاند سی دلہن بیاہ لاتے۔ چھوٹی بیگم منتیں مانگتے تھک گئیں مگر کچھ بھی تو نہ ہو سکا۔ خاندان بھر میں ایک سے ایک لڑکیاں بھری پڑی تھیں۔ گوری، خوبصورت، نک سک سے درست، کام کاج میں بھی تیز، مگر بات پھر بھی نہ بنی۔ اور سید صاحب کی بیٹی تو ایسی تھی کہ ہاتھ لگائے میلی ہوتی، اس پر حسن سے بھی آراستہ اور خانہ داری میں تو لیس یکتا تھی۔

سیون پرون، کھانا پکانا، آئے گئے کی ہر بات برابری، مگر منیر میاں کے نصیب میں یہ سب کہاں تھا۔! چھوٹی بیگم اپنے بھائی کے لئے کیسی کیسی جان کڑھاتیں۔ بھائی سے بغیر پوچھے گچھے کئی بار نسبت بھی پکی کر لی گئی اور جہیز بری یاد تو الائچیاں تک بٹ گئیں، مگر وہ کلیاں پھر بھی نہ چٹکیں۔ پھر آجا کے چھوٹی بیگم کو یہی سوجھتا کہ ہاتھ اٹھا اٹھا کر اور پلو پسار پسار کر اس کو کوسنے دیں جو منیر میاں کو ایسا بہکا گیا کہ شادی اور عورت کے نام سے بدکنے لگے۔

اور اب یہ بات بھی آج کل نہ تھی۔ منیر میاں کی عمر کے لڑکے تو کئی بچوں کے باپ ہو گئے تھے۔ بلکہ حویلی والے اشرف میاں نے تو گئے سال اپنی بیٹی کی شادی بھی کر ڈالی اور اب اللہ رکھے ان کی گود میں نواسا بھی کھیلنے کو تھا۔ اللہ جھوٹ نہ بلوائے تو منیر میاں کا یہ بیالیسواں سال تھا۔ مونچھوں کے دو دو، چار چار بال بھی سفید ہو گئے تھے اور اب ڈھلتی کا زمانہ تھا۔ مگر بہن اسی آس میں مری جاتی تھیں کہ بھائی کے سر سہرا دیکھ لیں۔ چھوٹی بیگم کہتیں "اے آدمی کی عمر تو دراصل چالیس کے بعد شروع ہوتی ہے [illegible] ابھی تو دن آئے ہیں۔"

مگر دن آکر بھی نہ آئے ماں باپ تو کیا کیا منتیں نہ کر مرے، مگر وہ منیر میاں تھے کہ ٹس سے مس نہ ہوئے۔ اب بہن بہنوئی کی تمام تر کوشش یہ تھی کہ کسی بھی نکٹی چپٹی، کالی پیلی کو بیاہ لائیں۔ مگر منیر میاں توجہ دیتے تب نا۔!

خاندان بھر میں ایسا تو کوئی لڑکا نہ تھا جس نے شروع جوانی میں ہی عورت سے منہ پھیر لیا ہو۔ سبھی تو بخشتے ہوئے تھے۔ مگر ان حضرت

کا تو شروع سے ہی ڈھنگ نرالا تھا۔ عمر یہی کوئی بیس بائیس کی ہوگی۔ دیکھنے میں ایسے اونچے پورے، ایسے خوبصورت کہ لڑکیاں آپ ہی مری جاتی تھیں، مگر انہوں نے خود کسی کو آنکھ اٹھا کر نہ دیکھا۔ چھوٹی بیگم تو کہتی تھیں یہ سب اس موئے پادری کا قصور تھا جو انہیں پیارا ہے بنا گیا۔ لے دے کے اجڑے گھر کا یہی تو ایک دیا تھا۔ شادی ہوتی، گھر بار بستا تو اولاد کی آس بھی ہوتی۔ اب تو کوئی نام لینے والا، نہ مرے تو منہ میں پانی ڈالنے والا۔ کیسی تباہی تھی خدایا کہ بیٹا ہوتے بھی نسل ختم ہوتی جا رہی تھی۔ منیر میاں کا پیغام سب سے پہلے تو انہی شیخ حسین کی بیٹی کو گیا جو انگریزی بھی پڑھی ہوئی تھی۔ اور جو دیکھنے، دکھانے میں بھی ہزاروں میں نہیں تو دس بیس میں ایک ضرور تھی۔

اور سچ جو پوچھو تو منیر میاں کی ماں کا اس پر لٹو ہو جانا یوں بھی تھا کہ جہیز کے علاوہ ایک معقول رقم ملنے کی آس بھی تھی۔ ادھر سے ہاں بھی ہو گئی۔ اور بچی بوڑھی ہو گئی تو جان پہچان والوں کے یہاں پان سپاری بھی بٹ گئی کہ یکایک بیٹھے بٹھائے منیر میاں نے انکار کر دیا۔ " میں شادی نہیں کروں گا۔ " سننے والے تو بھونچکے ہی رہ گئے۔ کوئی وجہ ہی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ ماں کو اتنا تو معلوم تھا کہ کسی انگریز سے راہ و رسم ہے مگر یہ نہ معلوم تھا کہ یہ راہ و رسم اس بات کی نوبت لے آئے گی۔

" اے ایسا ہی مولوی بنتا ہے تو میں لو مگر شادی کیوں نہیں کرتے۔ شادی تو کسی بھی مذہب میں منع نہیں ہے۔ " وہ چلا کر بولتیں۔

" ارے اماں اس بیچارے کو کیوں بدنام کرو ـــــ میں خود

ہی اس جھنجھٹ میں نہیں پڑنا چاہتا ــ یہ لو......

اماں بات کاٹ دیتیں ــ "مجھے سب معلوم ہے باتیں نہ بنا منیر میاں ــ کان کھول کر سن لے اور آنکھیں کھول کر دیکھ لے کہ میں تیرا سہرا دیکھے بغیر نہیں مروں گی اور تیرا پوتا بھی جھلاؤں گی۔ اللہ جانے وہ انگریز بڈھا کیا کیا دماغ میں ٹھونس گیا ہے۔"

"پھر وہی مصیبت۔ ارے نہیں کرتا شادی ــ نہیں کرتا ــ اور سن لو اب سے میرا پیچھا نہ اٹھانا۔"

اے لو ــ اس نے تو ایسی دوٹوک شادی کہ بیچاری اماں تو چپ ہی رہ گئیں کتنے لاڈ چاؤ منتوں مرادوں کا پالا پوسا بیٹا تھا۔ بس چلتا تو اپنی زندگی ہی وار دیتیں۔ مگر کیسے منہ پر صاف انکار کر بیٹھا ندا لوماں کی محبت اور ممتا کا پاس کرتا۔ تھیں۔ مگر غیرت دار پھر کبھی منہ سے نہ بولیں کہ تیرا چھوکرا بھی جھلاؤنگی اے منیرے ــ لوگوں کے منہ کو کون بند کرتا ــ؟ ہانڈی کے منہ کو ڈھکن ہے مگر ان دنیا والوں کے منہ کو ڈھکن ہے نہ پیندہ ــ دشمنوں نے کچھ کا کچھ ہی اڑا دیا اور قبل اس کے کہ لڑکے والوں کی طرف سے بہت نیست ہوتی۔ لڑکی والوں نے پہلے ہی یہ کہہ کر ناطہ توڑ لیا۔ "کیا لڑکی کی قسمت پھوڑنی ہے یہاں"۔

اماں کا بس نہ چلا اس وقت شادی کر کے تو یہ بیٹے ہی پوتا نہ جھلا دیتیں تو بات ہی کیا تھی۔؛ مگر میاں تو ایسے بھرپور انکار نے لوگوں کے شبہ کو اور بھی تقویت پہنچائی۔ اور منیر میاں نام سے نا نوٹ گئے کہ یہ ہی نہیں عورت کے قابل ــ تب ہی تو منہ چھپائے بیٹھے ہیں۔

چھوٹی بیگم پہلے پہل تو سمجھی تھیں کہ شاید ہو گی ایسی ہی کوئی

بات۔ مگر ادھر جب سے ماں باپ مرے تو منیر میاں بہن بہنوئی کے گھر ہی آ پڑے تھے۔ اور اس وقت ان کی عمر ہو گی یہی کوئی تیس بتیس کی۔ اور چھوٹی بیگم کو اکثر یہ منظر دکھائی دیتا کہ ہفتے دو ہفتے میں ایک آدھ بار منیر میاں صبح ہی صبح بستر سے گڑبڑائے سے اٹھتے۔ اٹھتے ہی چادر لنڈ منڈ کر کے دور کونے میں پھینکتے اور بہنوئی کی نظر بچا کر الدم غسل خانے کی راہ لیتے۔ چھوٹی بیگم گھر بھر کے بستروں کی غلاف چادریں بدلواتیں تو دل ہی دل میں بلکتیں۔ "ہے ہے کیسی بھری پری جوانی یوں ہی برباد ہو رہی ہے مولی۔" منیر میاں اپنے بہنوئی سے ایسے نظریں بچا کر جاتے کہ پاؤں کی آہٹ بھی نہ سنائی دے۔ رفیع الدین تو یوں ہی کچی نیند کے تھے۔ منیر میاں مارے ڈر کے کھڑاؤں بھی نہ پہننے کہ کھٹ کھٹ کی آواز پر اگر بھائی صاحب اٹھ گئے تو آدھ گھنٹے تو چیڑ چھاڑ کر ہی گے ہی۔ اور وہ نہ ان سے غسل خانے میں غائب ہو جاتے۔

"ارے میاں، کیوں خواہ مخواہ ہٹ کئے جاتے ہو۔ ابھی بھی کچھ نہیں گیا، کہو تو کرا دیں تمہاری شادی کسی اچھی جگہ۔" ایک دن صبح ہی صبح انہیں چادر پھینکتا دیکھ کر بہنوئی نے اپنے رشتہ سے فائدہ اٹھایا۔ مگر منیر میاں نے کچھ جواب ہی نہ دیا انہیں بس ان کی طرف دیکھا اور سٹ پٹائے ہوئے باہر دوڑ گئے۔

رفیع الدین کا مطلب "کسی اچھی جگہ" سے ہمیشہ ان کی اپنی بہن سے ہوتا۔ رابعہ بیگم تین برس کی بیاہی ہوئی رانڈ ہو کر بھائی بھاوج کے گھر آ پڑی تھیں۔ شادی کو تین ہی برس تو ہوئے تھے۔ جب گاؤں میں ہیضہ پھوٹا اور ایسا پھوٹا کہ ساری آبادی لے کر ہی لوٹا۔ نصیبوں جلی

رابعہ بیگم بھی انہی بدنصیبوں میں تھیں جو ہیضے کی وبا میں مر گئے۔ یوں کہنے کو رابعہ بیگم نہ مریں ان کے میاں مرے، مگر سچ پوچھو تو ہندوستانی گھرانے کی پردہ دار عورت کے لئے اس کے مرد کی زندگی ہی تو اس کی اپنی زندگی ہے۔ رابعہ بیگم سے یوں بھی ایک بار منیر میاں کی بات چلی تھی جب چھوٹی بیگم کی شادی رفیع الدین سے ہونے لگی تو اماں نے سوچا کہ بیٹی دے کر بیٹی لے لیں گے اور آپس میں سانٹا آنٹا کر لیں گے۔ مگر میاں تو بردگ لئے بیٹھے تھے۔

بیچاری تین برس سہاگن رہیں اور اب سترہ اٹھارہ برس سے رنڈاپے کی زندگی کاٹ رہی تھیں۔ کیسی لہکتی مہکتی جوانی تھی کہ اپنا وزن آپ نہ سنبھلتا۔ یہ بڑی بڑی آنکھیں۔ کالے کالے لمبے بال، بوٹا سا قد، گورا گورا رنگ اور جسم کی بناوٹ تو ایسی گدرائی گدرائی کہ پھولوں سے لدی ڈالی کا گمان ہوتا۔ اور کام کاج میں بھی ایسی کہ جب سے بھائی کے گھر آ پڑی تھیں بھاوج کو کبھی ہاتھ نہ ہلانے دیا۔ سبھی کا کام ان کے ذمہ۔ چوڑی دار پاجامہ، آڑا دوپٹہ، چولی، کرتی، یہی لباس ہوتا، مگر اس میں بھی بدن جیسے پکار پکار اٹھتا۔ دوڑ دوڑ کر کام کرتیں۔ سبھی کی ڈانٹ گھر کی تو نصیب میں تھیں، مگر مسکرا مسکرا کر ہر کام نبیٹر لیتیں۔ اور بیوگی کی وہ حسرت جو سہاگ نے چہرے سے چھٹ کر دی گئی تھی۔ اس بھولی بھالی مسکراہٹ سے دھل سی جاتی۔ مسکرا کر ہر کام پہ ٹوٹی پڑتیں۔ منیر میاں نے ستر ہزار بار تو انہیں دیکھا ہوگا۔ چھوٹی بیگم نے بھی کیا کیا چاہا کہ وہ منیر میاں کی نگاہوں میں بھر جائیں، مگر ان کی آنکھیں تو کھلی ہوتے ہوئے بھی بند ہی تھیں۔ رفیع الدین منہ سے تو بھلا

کہتے کہتے، دبی زبان سے ہزاروں مرتبہ کہا ہوگا۔ "کہو تو کرا دیں تمہاری شادی کسی اچھی جگہ۔" مگر وہ کب مانتے تھے کہ ابھی مان جائیں۔ جانے کس ٹھنڈی مٹی سے خمیر اٹھا تھا ان کا کہ آنکھیں بھر بھر دیکھتے۔ کام بگاڑ دیتیں تو آنکھوں ہی آنکھوں میں ڈال کر ڈانٹتے، مگر کیا مجال کوئی بجلی لہرا جائے، کوئی کوندا ہی لپک جائے۔ چھوٹی بیگم تو نند پہ لٹو تھیں۔ کیسا پیارا پیارا نکھرا، جھومتا ہوا بدن، اور اس پہ دل موہ لینے والی ادائیں۔ رات کو اپنے پلنگ پر جاتیں تو چار چار بار اٹھ اٹھ کر پوچھتیں۔

"بھابی ماں، پاؤں دبا دوں۔ بھابی ماں، یہ کر دوں۔ بھابی ماں، وہ کر دوں۔" ایسی اداؤں پر کون لوٹ پوٹ نہ ہو جائے بھلا۔ اور رات گئے جب بیچاری کا پلنگ چرچراتا تو چھوٹی بیگم کا دل غم اور ہمدردی سے بھر جاتا، اور مینر میاں کے لئے دل میں نفرت پھوٹ پڑتی۔

"اللہ مارا آج ہاں کر دے تو یہ چارپائی کیوں چرچر کرے۔"

ایک سے ایک چھوکری نظر سے گزری، مگر اس خدا کے بندے نے آنکھ نہ لڑائی۔ چھوٹی بیگم سبھی جتن کر گزریں۔ بس ایک بجنیے کی طرح گھیر گھار کر لانا ہی تو باقی رہ گیا تھا وہ بھی نہ چھوڑا۔

چھوٹی بیگم کے مائکے میں ایک چھوکری ملازم تھی۔ خالہ بی اس سے کیسی پریشان تھیں کہ توبہ۔ رنگ دیکھو تو کالا کٹم۔ یہ موٹی موٹی سی مگر موٹاپن بھی ایسا گویا پتھر سے کاٹا ہوا بدن۔ بھدا بھدا پن نام کو نہیں۔ یہ جھوجھر کے جھوجھڑ بال۔ سر پہ بکھرے ہوئے۔ مگر آنکھیں

خوب ٹری ٹری اور کالی کالی چنچل جب کاجل کی دھار مار لیتی تھی تو اچھے اچھوں کے دیدے ہوائی ہو جاتے تھے۔ حرافہ ایسی کہ اندھیرے اجالے اچھے خاصے چلتے ہوؤں کو چھیڑا کرتی۔ گرمیوں کے دنوں میں نہانے کو بیٹھتی تو غسل خانے میں سے چلاتی۔ "ہے ہے۔ کیسا ٹھنڈا ٹھنڈا پانی ہے۔ میرے انگ پر سے کیسا چھپ رہا ہے۔" پھر اکدم چلاتی۔

"ہائے ہائے کیسی گرمی ہو رہی ہے میرے۔"

باہر بیٹھے ہوئے لوگ ایک دوسرے کو مٹ مٹ دیکھتے۔ اور یہ تو سبھی کو معلوم تھا کہ غسل خانے میں دو ہاتھ لمبی اور دو ہاتھ چوڑی چوکی کونے میں رکھی ہوئی تھی۔ وہ اس لئے تھی کہ غسل خانہ اتنا چھوٹا تھا کہ کپڑے پہننے کو جگہ نہ تھی چوکی کا مصرف یہی تھا کہ لوگ اس پر بیٹھ کر اطمینان سے کپڑے پہنیں۔ مگر وہ اپنی ساڑی گیلے گیلے بدن پر لپیٹے، کولہے اور شانے مٹکاتی ویسے ہی نکل آتی۔

"اوئی ــــ ساڑی کیسے باندھوں جی۔ گسل کھانے میں جگہ ہی کتنی ہے۔؟"

خالہ بی اس سے پناہ مانگتیں۔ سال میں دو پیٹ تو گراتی ہی تھی۔ ہزار بار اسے ملازمت سے برخواست کیا گیا مگر آگے سے پچھواڑے سے، جہاں موقع ملا وہ گھسی اور پھر وہی مستیاں۔

چھوٹی بیگم نے اس چڑیل کو بھی بلا کر کچھ دن رکھا کہ شاید اس کی بے تکان ادائیں ہی ان کا دل لوٹ لیں اور یہ کفر ٹوٹ جائے، مگر منیر میاں نے دوسرے ہی کنویں کا پانی پی رکھا تھا۔ گرمیوں کی ایک شام کو جب وہ نہانے کے لئے گھسی تو اکدم چیخنے چلانے اور ہائے والے

مچانے لگی۔ "کیا ٹھنڈا پانی ہے موا۔ ہائے ہائے میری ہانڈی پر کیسی گدگدی ہو رہی ہے۔" چھوٹی بیگم نے بڑی ارمان بھری نظروں سے دیکھا کہ شاید پانی میں تیر جا پڑے اور کچھ ہلچل مچے، مگر وہ تو منبر میاں نصے بڑی سادگی سے، مگر جھلا کر بولے "کمبخت کو پانی ٹھنڈا لگ رہا ہے تو گرم پانی سے کیوں نہیں نہاتی۔؟"

چھوٹی بیگم نے کیسے کلپ کلپ کر دعائیں نہ مانگیں۔؟

"یا مولی! میرے بھائی کے سہرے کے پھول کھلا دے، مسکین شاہ میاں کی درگاہ پر چڑھاوا لے جاؤنگی، دوسری چادر چڑھاؤنگی پھولوں کی الگ، ریشم کی الگ۔" مگر ان کی یہ آرزو پوری کہاں ہوئی بیچاری کیا کیا نہ کر گزریں۔ اکوئی جیسا بھائی ہوتا تو ساری تعلیم پر پارسائی پر لات مار اپنے تڑپتے دل کی التجا پر پگھل ہی اٹھتا، مگر وہ تیر پگھلنے والا نہ تھا۔ چھوٹی بیگم نے کہیں سن رکھا تھا کہ دلہن دولہا کے اترن ہار گجرے کنوارے لڑکے لڑکیاں پہن لیں تو سہرے کے پھول جلدی کھلتے ہیں۔ بس پھر کیا تھا تھا، جہاں محلے ٹولے میں شادی کی ڈھولک ڈھیا مچی بس ننھے میاں، ماں کی تحریک پر، باسی پھولوں کے گجرے لئے دوڑے چلے آرہے ہیں۔ ماں کی شہ پاکر ماموں کی چھاتی پر دوڑتے۔

"ماموں جان! یہ ہار پہن لو نا۔ تم جلدی دولہے بنو گے۔ اور ماموں جان پہلے پہل تو چڑ چڑا یا کرتے۔ جوتا اٹھا کر پیچھے بھاگتے۔ مگر یہ ان دنوں کی بات ہے جب بھر پور جوانی کا زور تھا۔ اب جو ادھیڑ ڈھلتی کے دن آئے تو وہ گرمی بھی گئی۔ اب کبھی ننھے میاں باسی گجرے لا کر دھائی دیتے تو یہ ٹیڑھے چین سے مسکراتے۔

"ہاں ہاں، تو سمجھے دولہا نہ بنائے گا تو کون بنائے گا۔؟ اب یہ میری شادی کے دن ہیں ہے۔؟" وہ اپنی مونچھ کا ایک آدھ سفید بال اٹھا کر اسے دکھاتے۔ "اب تو تیری شادی کے دن ہیں، تو ہی پہن لے یہ گجرا۔" اور وہ مرجھاتے ہوئے پھولوں کا ہار منے میاں کی گردن میں ڈال دیتے۔

باسی گجرے

منے میاں پھر دوڑے دوڑے چلے آ رہے تھے۔ ہاتھوں میں سفید سفید مگر مرجھائے پھولوں کے گجرے، جو رات بھر سیج پر پڑے پڑے اپنی تازگی کھو بیٹھے تھے۔ جانے محلے میں کتنی شادیاں ہوتی تھیں کہ ببر میاں کی جان پہ یوں آ فتیں ٹوٹا کرتیں۔ ببر میاں لوٹے سے وضو بنانے بیٹھے تھے، منے میاں نے چاہا کہ ماموں کو دولہا بنا دیں کہ ایک دم یہ سپٹ پڑے۔

"کیوں بے، سر کھجا رہا ہے کیا۔؟" وہ چڑ کر بولے۔ اب آج یکایک ان کا پارہ چڑھ گیا۔ یوں رکھائی سے تو کبھی نہ بولتے تھے منے میاں کا منہ اتر گیا۔ چھوٹی بیگم پلنگ پر پڑی یہ تماشہ دیکھ رہی تھیں۔ ان کی طرف پھر کر بولے۔

"قسم اللہ کی آپا بی، اگر تمہارا لاڈلا اب سے یہ باسی گجرے میرے پاس لایا تو میں یہ گھر ہی چھوڑ دوں گا۔" بات اتنی سنجیدگی سے کہی گئی تھی کہ چھوٹی بیگم کانپ گئیں۔ "اے اللہ نہ کرے تم گھر چھوڑو۔ نہیں کرتے، نہ کرو شادی، مگر ایسے نحس جملے تو منہ سے نہ نکالو۔ اللہ رکھے میرے بیٹے کا

تمہیں تو ایک چراغ ہو، اللہ نہ کرے میں تمہیں جاتا دیکھوں۔"
اب کبھی منے میاں پھول گجرے لاتے بھی تو خود ہی پہن لیا کرتے۔

رابعہ بیگم

رفیع الدین کا دور آیا تو بہت ساری باتوں کی پابندی اٹھ گئی۔ یہ گھرانہ تو ایسا تھا کہ یہاں کی بیبیاں بارہ بارہ برس کے لڑکوں تک سے پردہ کرتیں۔ مگر رفیع الدین کے دور میں یہ پابندی اٹھتے اٹھتے ختم ہو کر رہ گئی۔ ان کے بچپنے میں جو باتیں معیوب سمجھی جاتیں وہی اب کھلے بندوں ہونے لگیں۔ سبھی نکتئیں دور ہوئیں تو لباس بھی اس دست برد سے نہ بچا۔ وہ چوڑی دار پاجامے، آڑے دوپٹے اور چولیاں کرتیاں سبھی غائب ہو گئیں اور ان کی جگہ محض [illegible] وزنوں نے لے لی۔ اماں کے زمانے میں تو سر سے پلو بھی کھسکے [illegible] بنا سر پہ اٹھا لیتیں۔ گرمی کے مارے دم کیوں نہ نکل جاتا ہو [illegible] والی چولیاں پہننی پڑتیں۔ کسی فیشن کی ماری نے ایک [illegible] الی کہ سرے سے آستین ہی ندارد۔ اماں نے پانس پر منگوا کر [illegible] جلوا ڈالی۔" دیدوں کا پانی تو ڈھل گیا ہے بھالی۔ بند گھر [illegible] ہوتا تھا وہ کیا کہ بس سارا تماشہ دیکھ لو۔" مگر [illegible] نہ تھی۔ چھوٹی بیگم تو بہنتی ہی تھیں۔ رفیع الدین نے کبھی ما [illegible]

"رابعہ تو یہ ننگے پاجامے کیوں چلا رہی ہے اب تک۔" مگر وہ خاموش ہی رہ جاتیں۔ رفیع الدین بھی زیادہ کچھ نہ کہتے۔ رابعہ بیگم تو بھائی کی آنکھوں

سنّا تارہ تھیں، اور ہوتیں بھی کیوں نا۔ ؛ اکلوتی بہن ہی تو تھی، اور اب تو رنڈاپے کے سوگ سے ایسی غم نصیب ہو کر رہ گئی تھی کہ کچھ کہنے سننے کو دل نہ چاہتا۔ کبھی وہ آدھی بات بھی نہ کہتے کہ جلے دل کی تو ہے، کیا سہے گی گھر والے کچھ ہی کہہ لیں، یہ کچھ نہ کہتے۔ ہر بات کی آسانی ان کے لئے مہیا تھی، اور اب وہ رہتے سہتے اس گھر کی ہی ہو کر رہ گئیں تھیں۔ جہیز کے وہ ان جوڑے، کرتیاں، چولیاں، پاجامے، کھڑے آڑے دوپٹے۔ ٹھپہ گوٹا لگی اکلیاں ساری کی ساری صندوقوں میں پڑی لرزہی تھیں مگر بھولے بسرے بھی پہننے کے بارے میں نہ سوچا گیا۔ لاکھ لوگوں نے کہا بھی۔

"اے ایسی عمر ہی کیا ہے۔ پہن ڈالو۔ بیوہ ہوئی تو کیا غضب ہو گیا۔"

مگر دیکھنے والی آنکھ ہی نہ تھی تو کسے دکھاتی بیچاری پہن کر۔ ؛ کئی دنوں تک تو صندوق کھول کر بیٹھ جاتی اور ایسی حسرت بھری نظروں سے ٹکر ٹکر تاکتی کہ آنکھیں چھلک اٹھتیں۔ اب تو وقت کے ساتھ ساتھ دل پر کا بوجھ بھی ہلکا ہو گیا تھا۔ مگر وہ کپڑے جوں کے توں رکھے تھے۔ بھائی نے چھپن مرتبہ تو کہا ہوگا۔ "رابعہ کپڑے پہنا کیوں نہیں لیتی۔ ؛ رکھے رکھے خراب ہی تو ہو رہے ہیں۔" مگر وہ بڑی بڑی آنکھیں جھک جاتیں اور پھر تو رفیع الدین کو بھی یارا نہ رہتا کہ مزید کچھ کہہ سکیں۔ اور اب تو ایک زمانہ گزر گیا تھا۔ اپنی وہ بھرپور جوانی، جسے وہ لوگوں کی نظروں سے حرام کے پیٹ کی طرح چھپاتی پھرتی تھی، آہستہ آہستہ سلام۔ رخصت کہہ رہی تھی۔ سخت سخت مضبوط بدن اب ڈھلک رہا تھا، اعضا میں وہ گٹھا ہوا پن کہاں باقی رہ گیا تھا۔ ؛

گیہوں کے گوندھے ہوئے آٹے میں گھنٹے دو گھنٹے بعد سکھنے رکھے کیا

لوچ پیدا ہو جاتا ہے، وہی لوچ اب رابعہ بیگم کے گوشت میں پیدا ہو گیا تھا۔ اپنی جگہ یہ نرمی بری نہیں لگتی مگر جوانی کے رنگ روپ کی بات بھلا کہاں سے آئے۔ وگول گول بازو اب لٹک سے گئے تھے اور گالوں اور آنکھوں کے کونوں پر لکیریں سی پڑتی جا رہی تھیں، جیسے مکڑی جال بننے لگی ہو کالے بدرنگ پاجامے اور سفید ململ کے آڑے دوپٹے اور کوتیاں پہنتے ہی پہنتے ان کی عمر بیتی اب جب کہ کوئی ارمان باقی تھا نہ آرزو، بھائی نے بڑی محبت سے کہا۔ "رابعہ اپنی بھابی کی طرح تو بھی ساڑی کیوں نہیں باندھتی تو رابعہ بیگم کے دل کو بھی یہ بات لگ گئی۔ اب کون دیکھنے اور گھورنے والا بیٹھا تھا کہ جان چرانے کی نوبت آتی۔ و اور پھر کام کرتے ہیں وہ دوپٹہ بھی بار بار اگرتا تھا۔ اور گرمی کے دنوں میں ان تنگ پائنچوں میں تو وہ گرمی ہوتی کہ توبہ اور مہربان تنگ اتنی ہوتی تھیں کہ اگر کوئی چیونٹی گھس جاتی تو نکلی تک گھسائے نہ نکلتی۔ اوپر ہی اوپر سے کھجاتے کھجاتے جان مونی آدھ موئی ہو جاتی، مگر کیا مجال جو پاجامہ ٹخنوں سے ذرا بھی اوپر ہٹ جائے۔

اور یوں زندگی میں پہلی بار جارجٹ کی سفید سادی ساڑی اور جارجٹ ہی کا بلاؤز پہنا تو ایک بار تو خود چھوٹی بیگم بھی انہیں دیکھتی رہ گئیں۔ پتلے بلاؤز میں سے بازوؤں کی سفیدی ایسے چھن رہی تھی کہ محسوس ہوتا تھا اندر بدن میں چراغاں ہو رہا ہے جو یوں اجالا پھٹا پڑ رہا ہے۔ اس عمر میں بھی کیا صورت تھی۔ کیا بھولپن تھا۔ اور وہ معصومیت اور بھولپن قائم بھی کیوں نہ رہتا۔ و نہ بال ہوا نہ بچہ۔ ڈال پر پھل لگیں تو پکی دیکھنے میں تو وہ لدی پھندی ٹہنی پر بہار لگتی ہے مگر جہاں پھل اترے ابھی ٹھونٹھ اور کھاٹری ہو جاتی ہے کہ بس۔ تو اس ڈال میں پھل ہی کب لگے۔

جو یہ نوبت آتی۔ ؟ سفید سفید ساڑی میں پاکیزہ حور سی لگ رہی تھی کہ دیکھنے سے نیت نہ بھرتی تھی۔ منیر میاں نے بھی انہیں دیکھا، مگر یوں، جیسے دیکھا ہی نہ ہو۔ قمیض اچھالتے ہوئے بولے۔

"پچھلی بار دھوبی سارے بٹن توڑ لایا تھا، اب کی بار ذرا جتلا دینا۔"

منیر میاں کے اپنے دل کی طرح ان کے کپڑے، ان کا سامان، ان کا کمرہ بھی کچھ عجیب پھیکا پھیکا اور بے رونق سا تھا۔ عورت کے ہاتھ کی جو گھرداری اور اس کی جو خوبصورتی ہوتی ہے وہ تو چھو کر بھی نہ گئی تھی۔ کپڑے دیکھو تو پڑے ہیں ایک دوسرے سے کشتی لڑتے ہوئے، کتابیں اوندھی سیدھی، کوئی یوں ایک دوسرے سے لپٹی ہوئی جیسے عید کا معانقہ ہو رہا ہو، کاغذ آڑے ٹیڑھے تڑے مڑے ہوئے۔ ہر چیز بکھری بکھری ائی — رفیع الدین کہتے۔ "ارے بھائی ان کاموں کے لئے ہونا ہی چاہیے کوئی چاند سی، سگھڑ سی دلہن۔ کہو تو کرادیں تمہاری شادی کسی اچھی جگہ۔"

اور منیر میاں ہنس کر بولتے۔ "بھائی صاحب! آپ بھی بس خوب ہیں۔ ساری دنیا ادھر کی ادھر ہو جائے آپ اپنا وظیفہ نہیں چھوڑیں گے۔"

اور حقیقت بھی یہی تھی چھوٹی بیگم تو تھک ہار کر چپ بیٹھ گئی تھیں بھولے برے بھی نہ بولتیں کہ "میاں شادی کر لو گھر جنت بن جائے۔" مگر بہنوئی تھے کہ اپنی ہی الاپے جاتے۔ اور چھوٹی بیگم کے چپ رہ جانے کی بڑی وجہ تو یہ بھی تھی کہ بھائی کی عمر وہ دیکھ ہی رہی تھیں۔ رابعہ بیگم بھی سامنے ہی تھیں۔ عورت کے متعلق تو مشہور ہے کہ "بسی تو گھسی۔" یعنی بیس برس کی عمر ڈھلی، سمجھو گھس گئی عورت۔ اور میاں تو تیس کے بھی اوپر جا پہنچے تھے۔ مگر رفیع الدین اپنے رشتے سے آخر دم تک فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ جا بجا

چوٹ کرتے رہنے، تیر چلاتے رہتے، کون جانے کب تیر کہاں جا لگے۔
خالی خول کمرے میں دو چار آ جلے سجلے کپڑے دیکھ کر بول اٹھتے۔
"ارے میاں منیر، ان سفید کپڑوں میں جب تک دو ایک رنگ برنگے کپڑے نہ دکھائی دیں زندگی کا مزہ نہیں آتا۔" مگر منیر میاں زندگی کے اس نزے کے بارے میں سوچتے ہی کب تھے۔ انہیں تو وہی راہبوں کی زندگی پسند تھی۔ جہاں وہ کتابوں کا کیڑا بنے رہتے۔ بے دھڑکے سارا کام غفور ہی نمٹا دیتا۔ بہت ہی اہم بات ہوتی تو رابعہ بیگم تک بات کی پہنچ ہوتی، ورنہ اس کی بھی حاجت نہ تھی۔

قصہ ایک رات کا

اگر اس رات غفور، منیر میاں کے سرہانے پانی رکھنا نہ بھول جاتا تو اس کہانی کا انجام ہی کچھ اور ہوتا۔
ایک تو گرمی کے دن۔ اس پر سے غضب کی امس۔ پیاس کے مارے دم نکلا پڑتا۔ دن بھر پانی پی پی کر پیٹ پر چھکا را آجاتا مگر پیاس نہ بجھتی۔ اور پان کھا کر تو یوں ہی پیاس زیادہ لگتی ہے۔ اس رات منیر میاں دو چار پان کھا گئے تھے اور نیند سے جو ایک دم چونکے تو حلق تھا کہ سوکھا چلا آ رہا تھا۔ نیند سے جاگ کر سرہانے کی میز کی طرف ہاتھ بڑھایا کہ حسب معمول صراحی اور گلاس رکھا ہوگا۔ مگر وہاں تو کچھ بھی نہ تھا پیاس سے جیبھ تو بوبی رہے تھے، دو چار بار پہن کی سنا کر بولے۔
"غفور رے۔ او غفور رے۔"

نیند کا ماتا غفورا اتنی جلدی کیا جواب دیتا۔؟
"ارے کمبخت سرہانے پانی رکھنا بھول گیا۔ اب پیاس لگی ہے تو کیا پیؤں۔؟ تیری ماں کا دودھ۔؟"
رفیع الدین کچی نیند کے تو تھے ہی، ان کی ہائے والے پر اٹھ بیٹھے مگر مذاق کا موقع کیسے کھوتے۔؟ وہیں اپنے پلنگ پر سے پڑے پڑے بولے۔" ارے میاں اس کی ماں کا دودھ کاہے کو پیو، پانی ہی پیو، مگر اس کا بھی ڈھنگ سیکھو۔ شادی کرکے دیکھو بیوی کس طرح ذمہ داری سے کام انجام دیتی ہے۔"
منیر میاں جھلائے بکتے جھکتے اٹھے۔" بھائی صاحب آپ کو تو بس مذاق ہی سوجھتا ہے۔" اور وہ پیر پٹختے مردانے سے زنانے کو چلے۔ کمبخت غفورا ایسا سو رہا تھا کہ ہلا تک نہیں۔ رفیع الدین نے کروٹ لی اور خر خر کرنے لگے۔ چلتے چلتے منیر میاں نے غفورے کی پیٹھ میں ایک بھرپور لات جمائی، مگر وہ پھر بھی نہ ہلا۔
گرمیوں کے دن۔ ہلکی ہلکی چاندنی، بہتی ہوئی چپ چاپ سی ہوا۔ صحن میں پلنگ پڑے ہوئے تھے اور چھوٹی بیگم سوئی ہوئی تھیں۔ ان کے ہاتھ والے پلنگ پر منے میاں، اس سے ذرا ہٹ کر رابعہ بیگم۔ مگر کس انداز سے۔؟
صبح سے دانت میں درد تھا۔ سجاد نے کہا۔" اے ذرا سی مسّی کا بھر لو، سینہ درد غائب ہو جائے گا۔" رابعہ بیگم جھجکیں۔
مسّی تو سنگھار ہے ایک طرح سے۔ مگر منہ سے کچھ نہ بولیں۔ چھوٹی بیگم بھانپ گئیں۔" ارے بھاگیہ وان یہ کون کہے گا کہ سنگھار کی خاطر

لگائی ہے۔ دوا سمجھ کر نہ لگا لو۔" دانتوں پر مِسّی کی اُنگلی پھیری تو وہ دانتوں سے ہوتے ہوئے ہونٹوں پر بھی پھیل گئی۔ گورا گورا دمکتا چہرہ، اس میں اودے اودے ہونٹ، بڑی بڑی آنکھیں اور وہ نرم نرم سے مومیا پپوٹے جیسے موم سے بنائے گئے ہوں۔ بالوں کی ایک لٹ چاند ایسی پیشانی پر آئی ہوئی، جس میں تین چار سفید بال بھی چم چما رہے تھے۔ ایک ہاتھ سر کے پیچھے سے لا کر ماتھے پر ٹکا لیا تھا جیسے نور کے دائرے میں چاند چمک رہا ہو! یہ سب کچھ تو تھا ہی۔ ساڑی پہننے کا اتفاق کہاں ہوا ہوگا رالیہ بیگم کو۔ ایسے اڑ بھنگ پن سے سوئی تھیں کہ ساڑی لہنگے سمیت گھٹنوں کی خبر لے رہی تھی۔

صحن کے ایک طرف کونے میں، تپائی پر صراحی اور گلاس رکھا ہوا تھا۔ منیر میاں کی نگاہ تو یوں ہی پلنگوں کی طرف اٹھ گئی تھی۔ نیند بھری آدھ کھلی آنکھیں تھیں مگر وہ جیسے جھپک کر رہ گئے! اور جھٹ سے ان کی آنکھیں کھل گئیں، جیسے گہری نیند سے اچانک گھبرا کر اٹھ بیٹھے ہوں۔ ہلکی ہلکی چاندنی میں انہوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ پلنگ کی پٹی پر ایک طرف بڑی آہستگی سے رکھی ہوئی پنڈلی مچھلی کی پیٹھ ایسی چمکتی ہوئی، جس پر ڈھلتی عمر کے سائے لرز رہے تھے۔ بالکل آہستگی سے پیر اٹھاتے وہ پائینتی پہنچ گئے۔ اب کے بہت غور سے دیکھا۔ پنڈلی پر بہت ہی ننھے ننھے نرم نرم سے بال تھے! ہوا کا ایک خفیف سا جھونکا آیا اور یہ روئیں لرز لرز اٹھے۔ منیر میاں کا دل چاہا ان روؤں کو ہاتھ سے سہلانا شروع کر دیں۔ ان کی کنپٹیاں سن سن کرنے لگیں۔ ایک دم انہیں شدید پیاس کا احساس ہوا۔ بڑھ کر ایک ہی دم سے ساری صراحی گٹ گٹ کر کے

خالی کر ڈالی، مگر ایسا لگ رہا تھا کنواں بھر پانی بھی پی لیں تو پیاسے ہی رہ جائیں گے۔

اب کے جھجکتے ہوئے اِدھر اُدھر دیکھا۔ مردانے سے خرخر آواز آرہی تھی۔ اِدھر منے میاں مزے سے سو رہے تھے اور چھوٹی بیگم تو سدا کی مستر تھیں نیند کی۔ اور پھر زاہدہ بیگم تھیں جو اپنی اوندھی سیپی جیسی آنکھیں بند کئے یوں سوئی پڑی تھیں کہ لوگوں کی نیند اڑ کر بھاگ رہی تھی۔

منیر میاں سہمے سہمے سے آگے بڑھے۔ اب وہ صندلی اور چکنی چکنی پنڈلیاں بالکل ان کی نظروں کے سامنے تھیں۔ پھر وہ وہیں بیٹھ گئے۔ اور بہت دھیرے دھیرے اس صندلی پنڈلی پر اپنی انگلیاں پھیرنے لگے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے انہوں نے اپنا چہرہ جھکایا اور چٹ سے پنڈلی کا بوسہ لے لیا۔

ہیمیں سی پنڈلی پر ایک سرخ سرخ سا دھبہ ابھر آیا۔ جیسے دہکتا ہوا انگارہ۔!

شجرِ ممنوعہ

پڑوس میں جانے کس کی شادی تھی۔ مسلسل باجے بج رہے تھے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ وہ ڈھول دھبا تھا کہ خدا کی پناہ! دو روز سے یہی ہنگامے تھے۔ آج چوتھی تھی۔ شادی کا دوسرا دن۔

منے میاں جھومتے جھامتے چلے آرہے تھے۔ منہ میں پان اور گلے میں

باسی پھولوں کا یہ اتنا بڑا سا گجرا جوان کے گھٹنوں کو چھوئے لیتا تھا۔
منیر میاں سامنے ہی کھڑے تھے۔ منے کو آتا دیکھ کر اسے گود میں اٹھا لیا
اور مسکرا کر بولے۔

"کیوں بے، شادی کا بڑا ارمان ہے! ابھی مونچھ تک تو نہیں نکلی
اور شادی کی تمنا میں باسی گجرے گلے میں ڈالے پھرتے ہیں۔ یہ عمر ہے
تیری شادی کرنے کی۔ ؟"

اور منے میاں کے گلے سے باسی پھولوں کا گجرا اتار کر منیر میاں نے
اپنے گلے میں ڈال لیا۔

⁂

تین جنازے

بڑے چچا میاں دیوان خانے سے لگی کوٹھری سے نکلے تو پیچھے پیچھے گیندا خالہ بھی ان کے کرتے کا دامن کھینچتی نکلیں، بدحواس اور گھبرائی ہوئیں۔

"میں کیا کروں گی حضور۔؟ یہ راز چھپا تو نہیں رہیگا۔!"

چچا میاں نے خشمگیں آنکھوں سے انہیں دیکھا۔" تو ایسی کونسی عزت والی بی بی ہو تم۔ کون بٹہ لگ جائے گا۔ تمہارے نام کو۔"

گیندا خالہ کے ہاتھ سے ان کا دامن چھوٹ گیا۔ وہ دہلیز کی چوکھٹ پر بیٹھ گئیں۔" مجھے کوئی بٹہ نہیں لگے گا۔؟"

چچا میاں مسکرائے۔"گھر کی لونڈی باندیوں کی عزت ہی کیا ہوتی ہے گیندا بیگم۔ تم خواہ مخواہ اپنے کو اہمیت دے رہی ہو۔"

گیندا خالہ بھڑک اٹھیں۔"چار لوگوں میں بوم ہو گی تو میں کھڑے منہ پر تھوک دونگی۔ کہ دولہا گی نواب حیدر کا ہے۔"

"اچھا، یہ بات ہے۔!" چچا میاں سلگ اٹھے۔"مگر بوم ہونے ہی کیوں لگی۔؟ کیا ڈیوڑھی والوں کے لئے یہ نئی بات ہے۔؟ مگر تمہارا یقین بھی کون کریگا۔ سینکڑوں حرامی حلالی گھر میں بھرے پڑے ہیں۔ انہیں

چھوڑ کون میرا نام لے گا۔؟"

"آنے والا لے گا تمہارا نام۔ تمہاری شکل پر پڑے گا تب تو نہ جھٹلا سکو گے دنیا کو۔

"تمہارا نہیں بگڑے گا تو تمہاری اولاد کے آگے آئے گا۔ بھری جمعرات کو، جب چاروں شامیں ملتی ہیں کھلے آسمان کے نیچے کھڑے ہو کر ہاتھ اٹھا اٹھا کر کوسنے دوں گی کہ خدا یا جیسا مجھے ستایا ہے دلبا ہی بھرے۔"

چچا میاں ایک منٹ تک کھڑے گھورتے رہے، پھر پیر پٹختے ہوئے چلے گئے۔

دوپہر کے کھانے پر چچا میاں ایسے چپ چاپ تھے جیسے کسی بہت ہی قریبی عزیز کو دفنا کر آئے ہوں۔

بڑی ممانی نے چھیڑا۔ "آج یہ تھوبڑا کیوں پھولا ہوا ہے جناب کا!"

"میرا۔ ؟ نہیں تو۔" نواب حیدر بوکھلا سے گئے۔ "کہاں۔ ؛ ہنس تو رہا ہوں۔"

"ہنس رہے ہو یا رو رہے ہو۔؟ آخر بات کیا ہوئی۔؛ پتہ تو چلے کچھ۔"

چچا میاں نے ہاتھ روک لیا۔ "تم لوگ یقین کیوں نہیں کرتے، کچھ بھی تو نہیں ہوا۔ ایسے ہی سر دکھ رہا ہے۔" اور انہوں نے ہاتھ دھو لئے۔ ان کی پسند کے شامی کباب پڑے سوکھتے رہے۔

سب نے ایک دوسرے کو حیرت سے دیکھا۔ ڈیوڑھی والوں کے لئے اس سے زیادہ عجیب و غریب بات اور کیا ہو سکتی تھی کہ چچا میاں بغیر

کسی وجہ سے یوں اداس اور چپ ہو جائیں۔
چچا میاں ڈیوڑھی کی جان تھے۔ گھر کے مالک تھے مگر سب سے یوں بے تکلف کہ پتہ نہ چلتا کہ یہی اس ڈیوڑھی کے نواب ہیں۔ ہمیشہ ہنسنے ہنسانے سے کام۔ لڑکے، لڑکیاں، شادی شدہ، غیر شادی شدہ نوکر، باندیاں، کوئی بھی تو ان کے مذاق سے نہ بچتا۔ عمر تو پچاس پچپن یا اس سے بھی سوا ہو گئی تھی مگر ہنسی دل لگی کی باتیں ایسی کہ لڑکے بھی شرما جائیں۔
ڈیوڑھی میں بڑے ہال سے لگا ہوا ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جو نماز کے لئے وقف تھا۔ مغرب کے وقت جب پورا گھر نماز پڑھنے جمع ہوتا چچا میاں وہاں پہنچ جاتے۔ ایسا موقع تو ہاتھ آتا ہی تھا کہ دو چار لڑکیاں غائب رہیں۔ بس ناک کی ڈنڈی میں دم آجاتا۔
"زہرہ کدھر گئی۔؟ یہ نور بی بی کو کیا ہو گیا۔؟ سلیمہ بی بی کا مزاج کیوں بگڑ گیا۔؟" اور تو اور اپنی بیٹیوں تک کو نہ چھوڑتے۔ نادرہ بیگم نے آج نماز کیوں نہیں پڑھی ہے۔ ؟ صابرہ تو مجھے کہیں دکھائی نہیں دی۔"
نوجوان لڑکیاں شرم سے منہ چھپا لیتیں۔ دوپٹوں کی اوٹ میں ہو ہو جاتیں اور چچا میاں مسکراتے ہوئے چلے جاتے۔ چلتے چلتے مزید ثبوت کے لئے ایک آدھ فقرہ اور کس دیتے۔
زہرہ بیگم جھلا جاتیں۔ "توبہ ہے چچا میاں تو بالکل سٹھیا گئے ہیں"۔
صبح کی نماز میں اگر رفیق میاں، سلیم میاں یا چھوٹے بڑے بھائی نہ نظر آتے تو بس ان کی بیوی کی شامت آجاتی۔ "یہ لڑکے بہت نہیں صبح کی نماز میں کیوں شامل نہیں ہوتے۔؟ زہرہ بیگم تمہارے میاں کی نماز

قضا ہونے کا سارا عذاب تمہیں پر پڑیگا۔ شاکرہ بیگم تم اپنے ساتھ سلیم میاں
کو بھی گناہگار کرتی ہو۔" اپنی دوپلی ٹوپی سر پر جماتے ہوئے کہتے۔ "ارے
میاں خدا کے خوف کا بھی کچھ خیال کیا کرو۔"

شاکرہ بیگم سر سے بیر رنگ چادر تان لیتیں۔ زہرہ بیگم شرم سے
لال ہو جاتیں، اور چچا میاں چلے جاتے تو سر نکال کر شاکرہ بیگم کہتیں
"توبہ ہے اللہ، کتنے خراب ہیں بھائی جان۔ کسی کا تو خیال کرتے ہوں گے۔
یہاں تو کٹ کر رہ گئی۔ کسی کی موجودگی کا بھی لحاظ نہیں کرتے۔"

لونڈیاں، باندیاں، چھوکریاں دوڑ دوڑ کر کام کرتیں تو یہ بھی سدھ
نہ رہتی کہ ازاربند ٹخنوں کی خبر لے رہا ہے۔ چچا میاں لپکنے کے انداز میں بڑی
صاف دلی سے کہتے۔ "رمضانی بوا گرچنے کھلاؤ، نہیں تو ابھی ابھی.....!"
کانپ کر وہ کہہ اٹھتیں۔ "میاں تمہارے پیروں پڑتی ہوں، یہ لو ابھی لے
لو پیسے۔" اور وہ اپنی میلی کچیلی تھیلی میں سے پیسے نکال کر دور پھینک دیتیں۔
چچا میاں مسکراتے ہوئے پیسے اٹھا لیتے اور انہیں لوٹا دیتے۔

باورچی خانے میں چلے جاتے تو گھنٹوں نہ اٹھتے اور نوکر مالک
کا فرق مٹ جاتا۔ مذاق وہاں بھی ختم نہ ہوتے۔ کچھ دنوں پہلے یہ خبر بڑے
زور شور سے سنی گئی تھی کہ چچا میاں گیند اخالہ کے گورے گورے گھٹنے
اور چکنی ہوئی پنڈلیاں دیکھ کر وہ گرچنے مانگنا بھی بھول گئے تھے۔ اور
سچ تو یہ ہے کہ انہیں گرچنے مانگنے کی بھی کہاں رہ گئی تھی۔ گیندا خالہ
جن کے بارے میں مشہور تھا کہ ان کا رنگ اتنا سنہری سنہری اور چمکتا ہوا
ہے کہ جس پانی سے وہ منہ دھوتی ہیں
وہ سنہری ہو کر نیچے گرتا ہے۔ ان کا نام گیندا اسی لئے تو

دکھا گیا تھا کہ وہ گنبد ے کی طرح سنہری تھیں۔ نل سے پانی بھرتے وقت
جب وہ اپنی شلوار اردنچی کر لیتیں کہ بھیگ نہ جائے تو ان کی سڈول
پنڈلیاں، جن پر ننھے ننھے سنہری بال تھے، اتنی خوبصورت نظر آئیں کہ "چاہنے
والوں" کا دل کہہ اٹھتا۔ "گنبدا عمر بھر پانی بھرتی رہے۔"

اور پھر دبی دبی زبانوں سے کچھ ایسی باتیں بھی سننے میں آئی تھیں
کہ باورچی خانے کے بازو والی کوٹھری میں چچا میاں اکثر گنبدا خالہ سے
گرڈ چنے مانگنے جاتے ہیں۔

"آنے والا لے گا تمہارا نام۔"

"تمہارا نہیں بگڑے گا تو تمہاری اولاد کے سامنے آئے گا۔"

نواب حیدر نے چونک کر ادھر ادھر دیکھا۔ یہ کس کی آواز تھی۔

ہشت، کوئی بھی نہ تھا۔

یہ ان کا اپنا وہم تھا جو گنبدا کی باتیں دہرا رہا تھا۔ "لاحول لاقوۃ
یہ ذرا ذرا سی چھوکریاں ناحق اتنی بڑی بڑی باتیں کرتی ہیں۔ کل کی
چھوکری۔ ابھی ابھی کی تو بات لگتی ہے چپا ندبی گو دمیں اٹھائے اٹھائے
پھرتی تھی۔ گھر بھر کے بچے پالنے اگر گنبدا خالہ کہنا شروع کر دیا تو کیا
سچ وہ عزت والی ہو گئی ہے تو وہی اٹھارہ برس کی چھوکری۔" انہوں
نے اپنے دل کو مطمئن کرنا چاہا، مگر دل کے خوف کو وہ دبا نہ سکے۔

بڑے حضرت کے زمانے میں ساری ڈیوڑھی ماما، لونڈیوں اور
باندیوں سے بھری پڑی تھی۔ بہتی گنگا تھی۔ جو چاہتا نہاتا اور پھر پاک
کا پاک رہتا۔ کسی کا حال کسی سے چھپا نہ تھا اور سب اپنی اپنی جگہ پر سمجھتے
تھے کہ کسی کو ہماری خبر نہیں۔

سال دو سال میں دو تین واقعے فرور ایسے ہو جاتے کہ بی اماں کو "نوکر خانے" میں جانا پڑتا۔ وائی آتی، چیخیں بلند ہوتیں، پھر ننھے منے سے بچے کے رونے کی آواز اور بی اماں مطمئن ہو کر اپنے تخت پر آ بیٹھتیں اپنے مخصوص لہجے میں لیکچر شروع کر دیتیں۔

"حرام زادے، مائی ملے اپنا کام کر کے چلتے بنیں، نہ آگا دیکھیں نہ پیچھا۔ کوئی پوچھے ان سے تمہاری بیویاں مر گئی ہیں جو لونڈیوں کے بستر گرم کرتے ہیں جا جا کے۔" پھر ان کا لہجہ بدل جاتا۔ "مگر سارا قصور ان چھنالوں کا ہے۔ جان بوجھ کر اپنے پیچھے دھگڑے لگا لیتی ہیں، اور وقت آ پڑنے پر چلا چلا کر آفتیں مچاتی ہیں۔"

اور یہ ہمیشہ کا معمول تھا۔ یونہی تھوڑی بہت ہائے وائے ہوتی اور سکوت چھا جاتا۔ پانی میں تھپیڑے تبھی تو ایسی کتنی دیر مچل مچے گی۔ ڈب کر کے آواز نکلے گی، بلبلے اٹھیں گے، اور جب تک کہ تھپیڑ تہہ میں جا بیٹھے اوپر کی سطح ایسی پر سکون، جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔

مگر یہ تھیں بی اماں اور بڑے حضرت کے زمانے کی باتیں۔ اب تو کمین مامائیں اور لونڈیاں بھی ایسی نڈر ہو گئی تھیں کہ بات بے بات عزت آبرو پکارنے لگتیں۔ کمینے اپنے جس حوصلے اور عزم سے انہیں بدنام کر دینے اور بددعائیں دینے کی ٹھان لی تھی اس سے نواب حیدر خوف زدہ سے ہو گئے تھے۔ اپنی بدنامی کے خیال سے زیادہ انہیں یہ بات پریشان کر رہی تھی کہ ان کی اپنی بیٹیوں کے کان پر یہ بات گئی تو وہ کیا اثر لیں گی۔ وہ بھی اس صورت میں جب کہ جلنے اڑنے کو کوئی پیام بھی نہ تھے ان کے نصیبوں کے۔ اور یہ بات تو کبھی نہ کبھی پھوٹنی ہی تھی۔

اتنی بڑی بھری دنیا میں کوئی تو ایسا نہ تھا جس کی نظر انتخاب نادرہ بیگم پر پڑ جاتی اور ماں باپ کا بوجھ ہلکا ہو جاتا۔ تین تین سیانی بیٹیاں اور لڑکوں کا یہ کال! چھوٹے ماموں ہاتھ چلا چلا کر لیکچر جھاڑتے۔ "اجی جناب لڑکیوں کو بٹھا کر مت رکھیے۔ شرافت قائم رہے گی جب تک رہیگی، اور پھر ایسا دھوکا ہوگا آپ لوگوں کو کہ بس ٹاپتے رہ جائینگے۔ مگر میں تو کہتا ہوں اچھا ہے۔ آپ لوگوں کو ایسا سبق ملنا چاہیئے۔ کوئی لڑکی بھاگ جائے کسی کے ساتھ، پھر آنکھیں کھلیں گی آپ کی، اور لڑکیوں کو بٹھائے رکھنے کا پورا مزہ آئیگا۔ ارے میاں ان کی زبان چپ ہے۔ آنکھیں تو بولتی ہیں۔ نادرہ بیگم، صابرہ بیگم کے قدم بہکے بہکے پڑنے لگے ہیں۔ ہاں، آگے آپ جانیں۔ آپ کا ہاتھ لوٹے ڈنگا۔ آپ کے گلے میں بندھے گا۔ ہمارا کیا ہے۔"

شاہجہاں بیگم چپ چاپ سنتیں اور ٹھنڈی سانس بھر لیتیں۔

"تم سمجھتے ہو ہم لڑکیوں کا مربہ بنانے والے ہیں۔ ڈھیروں جمار کوئی بھی پلے تب نا۔ میں تو آج ان کے منڈکے ہلا دوں۔"

چھوٹے ماموں غصے سے چیخ پڑتے۔ "بیگا موں کو منت رود آپا جان۔ تم تو شکر ہیں کے کنکر چننے لگتی ہو۔ ہزار تو آئے ہوں گے۔ محلسرا والی بیگم اپنے بیٹے کا پیام لے کر آئیں تو تم نے یہ نہیں کہہ دیا تھا کہ لڑکا ناک میں سے بولتا ہے۔ ارے ناک سے بولنے والے کو داماد بنا لیا جائے مگر ہاؤ، میں کیوں جان کڑھاؤں۔ بدنامی ہوگی پورے خاندان کی تمہارے نواب حیدر کو ہنسی مذاق سے، نا ڑوں سے اور گرڈ چنے کھانے سے تو فرصت ملے۔"

اور آپا جان بے وقوفوں کی طرح ان کا منہ تاکتیں۔

"میں کہتی ہوں کچھ فکر بھی ہے تمہیں، وہ دو بیٹیاں سیانی ہو گئی ہیں۔ ہزاروں پیام آتے ہیں مگر تم کبھی توجہ ہی نہیں دیتے۔ کیا ساری عمر بٹھائے رکھنے کا ارادہ ہے۔ وہ سفید بال چبا کر بیٹیاں بیاہنا۔ میری تو جان عذاب میں ہے مولا۔ ہائے اللہ، کیا ہو گا۔ میری بیٹیوں کا۔؟" شاہجہاں بیگم چھالیہ کاٹتے کاٹتے بڑبڑا رہی تھیں۔

"ارے بیگم، تمہیں تو سارا دن شادیوں کی ہی پڑی رہتی ہے۔ ایسی کونسی بڑی ہو گئی ہیں ہماری بیٹیاں۔ صابرہ تو بالکل گڑیا سی لگتی ہے ابھی۔"

"ارے تمہیں کیوں نہ لگیں گی چھوٹی گڑیاں۔ ہمارے ماں باپ نے ہمیں تو تیرہویں سال ہی بیاہ دیا تھا، یہاں تو بیس بھی ڈھلی جا رہی ہے۔"

"بیگم وہ زمانہ اور تھا، یہ زمانہ اور ہے۔ اس زمانے میں لڑکیوں کی شادی اتنی جلد نہیں کرنی چاہیئے، ان کے نازک کندھے اس بوجھ کے متحمل نہیں ہو سکتے۔"

"تمہاری انہی باتوں سے تو میرے آگ لگ جاتی ہے۔ ہماری بھی تو شادی ہوئی تھی کبھی۔ ہمارے کندھوں میں ایسا کہاں کا زور آ گیا تھا۔؟ ہمارے بھی کندھے نازک تھے۔ اس گھر میں آئے تیس بتیس سال ہونے ہیں، بتاؤ کبھی ساس سسر کو یا تم کو شکایت کا موقع دیا۔؟"

"لاحول ولا قوۃ۔ میں یہ کب کہہ رہا ہوں کہ تم نافرمانبردار رہو یا بیوی کی تابت ہوئی ہو، میرا کہنا صرف اتنا ہے کہ ابھی سے کیا جلدی ہے۔"

شاہجہاں بیگم بھڑک اٹھیں ۔

" پھر وہی جلدی ۔ ارے یہ جلدی ہے ؟ عمر ہیں تو دیکھو اور پھر جانداد کا وہ حال ہے کہ آمدنی گھٹتے گھٹتے پاؤ رہ گئی ہے ۔ لڑکیاں ہیں کہ تاڑ کے جھاڑ کی طرح بڑھتی ہی چلی جاتی ہیں ۔ کل ہی تو صمدو کی ماں آئی تو کہہ رہی تھی ۔ اے بی ، کب تک لڑکیوں کو گھر بٹھا رکھو گی ۔ یہی دن تو شادی بیاہ کے ہوتے ہیں ۔ پکی عمر میں شادی کرنے سے چہروں پر سختا وا آجاتا ہے ۔ کیا کہوں ، میں تو بس کٹ کر رہ گئی ۔ بڑے صاحبزادے کے ڈھنگ تو دیکھ ہی رہے ہو ۔ آنکھیں بند ہو جائیں گی ۔ تو گھر میں جھانکیں گے بھی نہیں ۔ آگے تم جانو تمہارا کام ۔ میں عورت ذات کیا کر سکتی ہوں تمہاری مرضی کے آگے ۔"

اور شاہجہاں بیگم نے زور سے پاندان بند کر دیا ۔ تھوڑی دیر بعد پھر بڑبڑانا شروع کر دیا ۔

" پیغام بھی اجاڑ ایسے کون سے ہزاروں ہزاروں کے ہیں ۔ تین ہی تو پیام سامنے ہیں ۔ نواب جعفر مرزا کا چھوٹا بیٹا ، جو دسویں میں نا پاس ہو گیا ہے ۔ اس کی نسبت نادرہ کو آئی ہے ۔ اور چھوٹی آپا کے بڑے بیٹے کو صابرہ کو مانگتے ہیں ۔ میں تو کہتی ہوں ہاں کر دو بھلا کیا برائی ہے ۔ ! سامنے کے لڑکے ایسے ہی برے دکھتے ہیں ۔ ہاتھ سے چلے جائیں گے تو آنکھیں کھلیں گی ۔ اور وہ موا سالبہ کا بیٹا تو یونہی سا ہے ، مجھے نہیں بھاتا ۔ تم تو کبھی پوچھ تاچھ کرنا جانتے ہی نہیں ۔ "

نواب صاحب نے ناس کی ڈبیہ اچکن کی جیب میں رکھی ، اٹھتے ہوئے بولے ۔ " کہتی تو ٹھیک ہو ، میں غور کرونگا ۔ "

نواب حیدر رپوتر ڈولی کے رئیس تھے ۔ جھوٹ سچ کا حال تو خدا ہی

کو بہتر معلوم ہے، مگر سنتے ہیں کہ ان کے گوموت اٹھانے والے بھنگی بھی سونے چاندی کے تھے۔ اتنی بڑی بڑی جاگیریں تھیں کہ ان کی آمدنی لاکھوں کروڑوں تک جاتی تھی۔ وہی دولت تھی کہ آباؤ اجداد سے لیکر اب تک چلی آرہی تھی۔ مگر جیسا کہ برے دن سدا نہیں رہتے ویسے اچھے دن بھی ہمیشہ نہیں رہتے۔ بہار کا دور ختم ہوا، خزاں آئی۔ اور خزاں بھی آئی تو ایسی کہ سوکھے پتے بھی باقی نہ رہے۔ اب نواب حیدر کی صرف دکھاوے کی شان باقی تھی۔ ورنہ یوں تو ان کی حیثیت بالکل تباہ ہو چکی تھی۔ مگر ٹیپ ٹاپ اور نوابی ٹھاٹ وہی تھے۔ رسی تو کبھی کی جل چکی تھی۔ مگر بل جوں کا توں باقی تھا۔ اگر وہ تنہا ہوتے تو شاید گزر بھی جاتی مگر ماشاءاللہ تین لڑکیوں اور دو لڑکوں کے باپ تھے ایک بیوی کے شوہر اور پھر دنیاداری رہی وہ الگ۔

دو بیٹیاں شادی کے قابل ہو چکی تھیں۔ چھوٹی بیٹی ہمیرہ بھی ایسی چھوٹی تو نہ تھی۔ مگر نادرہ بیگم اور صابرہ بیگم کے سامنے اس کی اہمیت کو نظر انداز کر دینا ہی پڑتا ہے۔ بڑا بیٹا بالکل آوارہ تھا۔ لوگ کہتے کہ اپنے دادا کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔ چھوٹا تو چھ سات سال کا تھا۔

شاہجہاں بیگم اس ڈیوڑھی میں نواب کی بیگم اور نواب کی بہو بن کر آئی تھیں۔ شادی کے بعد پندرہ بیس سال تو بڑے اچھے گزرے مگر ادھر کچھ سالوں سے سسرال کی حالت بالکل تباہ دیکھ رہی تھیں۔ اور اب سب سے بڑی بات یہ کہ وہ بہو نہیں رہی تھیں۔ بلکہ اس ڈیوڑھی کی بیگم تھیں۔ اور برے بھلے ان ہی کو سارے انتظامات انجام دینے پڑتے۔ شاہجہاں بیگم اپنی جگہ یہ سمجھتیں کہ نواب حیدر لڑکیوں کی طرف سے بالکل لاپروا ہیں۔ لیکن حقیقت کچھ اور تھی۔ نواب حیدر دن رات اسی فکر میں گھلے

جاتے۔ اپنی فکروں اور پریشانیوں پر انہوں نے بناوٹی خوشی کا پردہ ڈال رکھا تھا۔ وہ اپنے غموں اور فکروں سے نجات پانے کے لئے سدا ہنستے رہتے۔ نوکروں، ماماؤں۔ بھائی بندوں سے بیہودہ مذاق کرتے ورنہ کوئی بات نہ سنتی کہ بچپن سال کے بوڑھے نواب، جوانی میں بھی ہنسوڑ نہ رہے تھے۔ یکایک کیسے کھلنڈرے بن کر رہ گئے ہیں۔ نواب حیدر اپنی پریشانیاں بیگم کے سامنے ظاہر نہ کر سکتے اور انہوں نے مسکراہٹ اور خوشی کی جو سبز چادر اوڑھ لی تھی وہ اتنی موٹی تھی کہ اس میں سے کبھی پریشانی نہ جھلک سکی۔

مگر آج کی باتوں نے نواب حیدر کی فکر میں کئی گنا اضافہ کر دیا۔

وہ سوچ رہے تھے۔ ؛"بیگم کہتی ہیں میں پوچھ گچھ نہیں کرتا۔ مگر جعفر کے چھوٹے بیٹے کو کون نہیں جانتا۔ ؛ زمانے بھر کے عیب اس میں موجود ہیں۔ پھر بھی بیگم کا یہ کہنا ہے کہ ہاں کر دو۔ اور وہ بیگم کی چھوٹی آپا کا بڑا بیٹا۔ آخ تھو۔ نواب حیدر نے ٹپاخ سے دیوار پر تھوک دیا۔ ایسی منحوس صورت ہے کہ صبح دیکھ لو تو دن بھر کھانا نہ ملے۔ لڑکوں کا کال، جا نمداد کا وہ حال۔ اور لڑکیوں کا آکاس بیل کی طرح چڑھتے ہی چلے جانا۔ نواب حیدر سر تھام کر رہ گئے۔ اور انہیں اپنے دادا ابا یاد آگئے جو اپنی بارہ سالہ بیٹی کلثوم بیگم یعنی نواب حیدر کی پھوپی کے بارے میں کہا کرتے تھے "جوان بیٹی اور مردے کو بٹھانا ایک ہی بات ہے۔" مطلب یہ ہے کہ میرے گھر بھی دو جنازے پڑے ہوئے ہیں اور پھر تیسرا جنازہ بھی۔ میرے خدا! میں انہیں کیوں کر دفناؤں۔؟ اور نواب حیدر نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں اور تکیہ پر سر رکھ دیا۔

"کیوں بھی۔ لڑکوں کو بلایا تھا، پسند آئے؟" شاہجہاں بیگم نے مسکرا کر پوچھا۔

مگر جواب میں نواب حیدر نہیں مسکرائے بلکہ تھکے ہوئے مسافر کی طرح ٹیک لگا کر بیٹھ گئے۔ "تمہاری ضد پہ ملنا پڑا تھا۔ ورنہ میں تو ان لونڈوں کو اچھی طرح جانتا تھا۔"

"ہائے تو کیا تمہیں دونوں میں سے ایک بھی پسند نہ آیا۔ کم از کم جبار کے بیٹے کو ہی پسند کر لیتے۔ نادرہ کو لاتے جاتی۔ اب تو وہ بھی تمہیں کی ہو رہی ہے۔"

"نادرہ تو اٹھ جاتی۔" نواب حیدر چڑ کر بولے۔ "تو کیا نادرہ کوئی بوجھ ہے کہ اسے پھینکوں۔ اس نالائق کو دیکھا بھی ہے تم نے کہ میں اٹھالائی زبان اور تالو سے لگا دی۔ اور وہ تمہاری چھوٹی آپا کا بیٹا، جس کی تعریف میں تم زمین آسمان کے قلابے ملاتی رہو۔ ہزار بار یہاں آچکا ہے۔ اسے کیا دیکھنا۔ ہے بے ہودہ کہیں کا۔ جگہ جگہ معاشقے لڑاتا پھرتا ہے۔ عنایت بیگ نے کل ہی اسے نسیم جان کے کوٹھے سے اترتے دیکھا۔ پتہ نہیں تمہاری عقل کدھر گم ہو کر رہ گئی ہے۔"

شاہجہاں بیگم اس انکشاف پر سر پکڑ کر رہ گئیں۔

کہتے ہیں بیٹی پہلے پڑوس میں جوان ہوتی ہے۔ لڑکی ذرا سیانی ہوئی کہ پاس پڑوس والوں نے ٹوکنا شروع کیا۔

"اے بی لڑکی سیانی ہو گئی ہے۔ کہاں تک بٹھاؤ گی؟"

"لڑکی کو کہاں دیا بہن۔؟ اب تو خاصے ہاتھ پیر نکالے ہیں اس نے۔"

"ابھی لڑکیاں چاہے آپ بیاہ رہی ہوں مگر دوسروں کی چھوٹی چھوٹی بیٹیاں بھی اپنی لڑکیوں سے بڑی نظر آتی ہیں۔ توبہ ہے، کوئی دلی

زبان سے کہتے ہوئے بھی ڈرے اور کوئی ڈنکے کی چوٹ کہہ کر بھی یوں اکڑ دکھائے گویا لڑکی کی شادی کر دینے کا فرض یاد دلا کر بڑا احسان کر دیا ہے غریب لڑکی کی ماں پر۔

ڈیوڑھی میں حیدرآباد کی ایک ماما تھی۔ منہ چڑھی اور بات بے بات بیچ میں دخل دینے والی۔

"الو پاشا۔ ایمعجلی صاحبزادی کو اٹھا دیونا اب تو۔ کل ماسٹر صاحب کے سنگات ہنس بول رے رئیں تھے انوں۔ عورت بچیاں کو کائے کو تو بھی بٹھا کو رکھے گے ماں۔ اس وخت تک تو بانتاں پیلے کرچ دینا۔"

شاہجہاں بیگم کا منہ لٹک گیا۔ سارا خون جمتا ہوا محسوس ہوا دوسرے دن ہی سے ستار سکھانے والا ماسٹر برخواست کر دیا گیا اور ستار کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیئے گئے۔ اور شاہجہاں بیگم کو اپنے بھائی کی بات یاد آئی۔ "لڑکیاں ستار سکھنے کا مزا تب آئیگا۔ جب سہاگ جائے ایک آدھ لڑکی منہ پر کالک تھوپ کر آپ کے۔!"

نادرہ بیگم جو بہکیں تو سب کے ہاتھ پیر ہی ٹھنڈے پڑ گئے۔ کہاں وہ جھکی جھکی شرمیلی آنکھیں اور کہاں بہکے ہوئے بین ابیٹھے بیٹھے اچانک ہی صابرہ بیگم سے بول اٹھیں۔

"تو اپنے دلہا بھائی سے مہندی لگائی کیا رے گی۔؟ مگر دیکھ، تو بھی سنت نہ چھوڑنا انھیں پگڑی یا تو شیٹن پین لینیا، ورنہ وہ تو بس اپنے رشتے سے فائدہ اٹھا کر تجھے مرتی پکڑا تے بھی نہ چوکیں۔"

صابرہ بیگم کو چیخیں مار کر اپنے اماں ابا کو جمع کر لینے کے سوا کچھ نہ سوجھا۔

نواب حیدر اور شاہجہاں بیگم دم سادھ کر رہ گئے ۔ نادرہ بیگم کھلے آسمان کو یوں ٹکر ٹکر تاکتی پڑی تھیں جیسے وہاں سے کسی بلاوے کی منتظر ہوں ۔ مگر یہ بات تھی چند دن پہلے کی اب جب سے اس نے یہ سنا سنا کہ دونوں پیام ناپسند کر دیئے گئے ہیں ۔ وہ ذرا جبر ہوگئی تھی ۔ بجھی بجھی سی رہتی ۔ پیاری پیاری صورت پر کیسی ہولناک اداسی چھا کر رہ گئی کہ ماں کا دل کٹا جاتا ۔

اور ایک دن تو اس نے بڑے اہتمام سے سر پر پلو اوڑھا ، ہاتھوں سے بال برابر کئے اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی دیوان خانے میں آگئی ، جہاں حیدر نواب اپنی بیگم سے پیاموں کے بارے میں بات چیت کر رہے تھے ۔ نادرہ کو آتا دیکھ کر انہوں نے زبان بند کرلی ۔

" ابا حضور ! " اس نے تھرتھراتی آواز سے کہا ۔

" کیا ہے بیٹی ۔ ؟ " نواب صاحب نے اس کے سر پر بڑے پیار سے ہاتھ رکھ دیا ۔

" جی ، میں یہ کہنے کو آئی ہوں ۔ " وہ تھوڑی دیر چپ رہی ۔ پھر صاف صاف بولنے لگی ۔ " میں کہتی ہوں کہ آپ لوگ میری شادی کی فکر نہ کرکے اگر صابرہ کی فکر کریں تو بہتر ہے ۔ کیونکہ میری عمر ...... " اس نے سر سے پلو ہٹایا ، کان کے پیچھے سے ایک لٹ کھینچی اور نواب صاحب کو دکھا کر بولی ۔ " یہ دیکھیئے اس لٹ میں کتنے سفید بال ہیں ۔ "

نواب حیدر ، جو بڑے چچا میاں کے نام سے ڈیوڑھی بھر میں مشہور تھے ۔ بڑے سنجیدہ ۔ بڑے دل لگی باز ، ادھر کچھ دنوں سے ایسے سنجیدہ رہنے لگے تھے ۔ ایسے بدل کر رہ گئے تھے کہ سوچنا پڑتا تھا کہ یہ وہی نواب ہیں یا ان

بگڑی ہوئی دوسری شکل ہے۔" نوکر خانے "بیں جانا تو چھوٹ ہی گیا تھا۔
مگر وہ یہ ضرور سنتے تھے کہ گیندا ہاتھ اٹھا اٹھا کر کوستی ہے۔

"جیسا میرا برا کیا ہے ویسا اللہ تیری جوان بیٹیوں کو بھی نہیں چھوڑیگا۔"
گیندا دیکھنے میں جتنی چنچل اور شریر نظر آتی۔ حقیقتاً ویسی تھی نہیں۔
وہ تو جمیل میاں کی دلہن بننے کے خواب دیکھا کرتی تھی۔ جو باجے تاشے
لے کر آتے اور اسے اپنے گھر کی رانی بنا لے جاتے۔ جمیل میاں بڑی بیگم
کے دور کے رشتوں سے بھتیجے لگتے تھے۔ انہوں نے ایک بار گیندا خالہ
کو پانی بھرتے دیکھ لیا تھا جب کہ وہ بالٹی اٹھائے لچکتی۔ ٹھمکتی دوڑ
دوڑ کر مٹکوں میں پانی ڈال رہی تھیں۔ شلوار گھٹنوں تک چڑھی ہوئی
تھی۔ بالٹی سے پانی چھلکتا اور ان کی سنہری پنڈلیوں پر جم جاتا۔ سنہرے
اور چمکدار موتی! قدم اٹھاتے ہی وہ موتی پھر دل میں گر کر ٹوٹ جاتے
پھر بالٹی کا پانی چھلکتا اور پھر سنہرے سنہرے موتی رلنے لگتے۔

جمیل میاں کو یہ سب کچھ اتنا اچھا لگا تھا کہ ان کا دل ہمیشہ
کے لئے ان کی پنڈلیاں عریاں ہو جائیں۔ انہوں نے بڑی بےباکی سے
گیندا خالہ سے کہا تھا۔ "گیندا میری دلہن بنو گی۔" گیندا خالہ شرما
گئی تھیں۔ مگر انہیں کچھ دن بعد پتہ چلا کہ جمیل میاں نوکر خانے کی ہر
چھوکری کو یہی جملہ کہتے ہیں۔ تو ان کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔ سنہرے
موتی ان کے گالوں پر بھی پھکنے لگے تھے۔ اور پھر وہ تو محض ایک اتفاق
تھا کہ بڑے چچا میاں نے ہاتھوں مجبوراً "گڑ چنے" دینے ہی پڑ گئے۔ مگر
ان کے دل سے لال لال کپڑے پہن کر دلہن بن جانے کی خواہش فنا کب
ہوئی تھی۔

نوکر خانے میں آج کل بڑی گھما گھمی رہتی۔ کھانا کھاتے میں گیندا خالہ برابر منہ بناتیں تو کوئی نہ کوئی لے اڑتا۔ ڈیوڑھی میں تو یہ بات بالکل عام تھی۔ بغیر ڈھول بجے کے، بغیر چڑھاوے کے راتوں کی تاریکیوں میں دلہنیں سجتیں، شادیاں ہوتیں اور بغیر کسی اہتمام کے بچے جنے جاتے مگر گیندا خالہ اپنے آپ میں کٹے جاتیں۔ مومن علی ہاتھ مٹکا مٹکا کر کمر لچکا لچکا کر گاتے۔

"سیاں نے دل لے گئے لال ہٹورے میں"

ہنسی کے فوارے چھوٹ جاتے اور گیندا خالہ کا بس نہ چلتا کہ مومن علی کا منہ نوچ لیتیں۔

اگر لال ہٹورے میں دل چلا جاتا تو کون سی ایسی آفت آجاتی۔ مگر دل تو سلامت تھا۔ لال لال ہٹورے میں عزت اور وہ دلہن بن جانے والی خواہش ضرور چلی گئی تھی۔ گیندا خالہ گھور کر مومن علی کو دیکھتیں وہ ناک پر انگلی رکھ کر بڑے نخرے سے چلاتے۔" اوئی ماں بہرے کو مت گھورو، میں تو مر جاؤں گی مارے ڈر کے۔"

نوکر خانے کے روح رواں ننھے مومن علی۔ کوئی انہیں برا نہ کہتا۔ ان کی ذات سے کسی کو خطرہ نہ تھا۔ گیندا خالہ کا لبوں پر اتر آئیں تو وہ بڑی مہین آواز سے گانے چلے جاتے۔

"اوئی کیا میرا ابرنگ چمکتا وہ بھی آدھی رات کو۔"

مومن علی کے ایرنگ آدھی رات کو چمکتے نہ چمکتے، مگر گیندا خالہ کے آنسو ضرور راتوں میں تاروں کی مانند چمکا کرتے۔

بڑے چچا میاں صبح کی نمازوں سے غائب رہنے لگے تو سلیم میاں

یا چھوٹے بھائی کو یہ کہنے تک کی ہمت نہ پڑی کہ "چچا میاں گرمی کے ہی دن تو ہیں، پانی ایسا ٹھنڈا ابھی نہیں ہے۔ آخر آپ نمازیں قضا کرنے پر کیوں تل گئے ہیں ؟"

لڑکیوں کی پوری پلٹن بھی اگر مغرب کی نماز کے وقت غائب رہتی تو چچا میاں نہ پوچھتے کہ "زہرہ کدھر چلی گئی ؟ نادرہ بی بی نے آج نماز کیوں نہیں پڑھی ؟ میرا قرآن شریف محراب میں ہے۔ نادرہ بی بی اٹھا تو لاؤ ذرا۔"

شاکرہ بیگم بغیر کسی ڈر کے نو بجے تک دروازہ بند کر کے سوتی پڑی رہتیں۔ زہرہ بیگم تو خود ہی زچہ خانہ میں پڑی ہوئی تھیں ان کے چالیس دن پورے ہونے میں ابھی بڑا وقفہ تھا۔ زچہ خانے میں نہ ہوتیں تب بھی بڑے چچا میاں ان سے کچھ نہ پوچھتے۔

نادرہ بیگم نے تو سفید بالوں کی لٹ دکھا کر ماں باپ کو بے فکر کر دیا تھا۔ مگر صابرہ اور ہیرہ دن بھر کد کڑے لگاتیں اور شاہجہاں بیگم کا دل دہلایا کرتیں۔ نادرہ میں تو ابا سنجیدہ پن آ گیا تھا۔ کہ بوڑھوں کی طرح صابرہ اور ہیرہ کے لئے لیتیں۔

ایک دن ہیرا اسکول سے لوٹی تو نواب صاحب دیوان خانے میں بیٹھے تھے۔ قدموں کی چاپ سنکر سر اٹھا کر ہیرہ کو دیکھا اور دیکھتے ہی رہ گئے وہ گھبرا اٹھے۔

اب تک وہ ہیرہ کو ایک ننھی گڑیا سمجھتے آتے تھے۔ مگر آج انہیں اچانک یہ خیال اک دم بدل دینا پڑا۔ کتابیں سنبھالتی جھومتی گنگناتی وہ اندر چلی گئی تو نواب حیدر اپنی بیگم سے بول اٹھے۔ "بیگم یہ ہیرہ اتنی

بڑی کب سے ہو گئی ۔ ؟"

شاہجہاں بیگم چڑ گئیں ۔" واہ بولنے ہوئے ہو ۔ چڑھتی بیل ہے ۔ کھانے کھیلنے کے دن ہیں ۔ نظر کیوں لگاتے ہو ۔ ؟"

" بیگم ۔" نواب حیدر بے بسی سے بولے ۔" دادا ابا کہتے تھے کہ جوان بیٹی کو بٹھا رکھنا اور مردے کو نہ دفن کرنا ایک ہی بات ہے ۔"

بیگم نواب حیدر کا منہ تکتی رہیں ۔

" میں سمجھتا تھا کہ میرے گھر میں دو جنازے ہیں ۔ مگر آج معلوم ہوا کہ مجھے تین مردے گاڑنے ہیں ۔ بیگم ۔ تین جنازے ! اب تک تو دو ہی تھے ۔ مگر یہ تیسرا ..... "

" کیا ہو گیا ہے تمہیں ۔ ؟ کیسے جنازے ۔ ؟ کس کی میتیں ۔ ؟ کیا بک رہے ہو ۔ ؟"

" نہیں سمجھیں ۔ ؟ ارے بیگم سمیرہ ہے تیسرا جنازہ ۔ بیگم ماہ صابرہ ۔ سمیرہ ۔ بیٹیاں نہیں ہیں اپنی ، یہ لاشیں ہیں تین ! یہ تین جنازے ہیں ۔ !" اور وہ زور زور سے ہنسنے لگے ۔" دیکھو یہ تیسرا جنازہ چلا آ رہا ہے ۔" بیگم نے گھبرا کر سر اٹھایا تو سمیرہ جھومتی جھامتی چلی آ رہی تھی ۔

وہ سر پکڑ کر رہ گئیں ۔

معلوم نہیں کس وضع کا اسکول تھا صابرہ بیگم کا ۔ آئے دن جلسے ، پارٹیاں ہوتیں ۔ رات بے رات لوٹنا ان کا معمول تھا ۔ ڈیوڑھی کی حالت کسی سے چھپی ڈھکی تو تھی نہیں ۔ مگر صابرہ بیگم کا یہ معمول تھا کہ ایک سے ایک بڑھیا ساڑی پہن کر اسکول جاتیں ۔ چھوٹے ماموں

تڑپ تڑپ کر آپا جان کو سمجھاتے۔

"دیکھو آپا جان اتنی ڈھیل نہ چھوڑو۔ کسی نے پیچ ڈال دیا تو تاگا پٹیا بھی نہ سوجھے گا جلدی ہیں۔"

گیندا خالہ کا پیٹ چھ آنے ہیں ملنے والے ٹکے اتنا بڑا ہو گیا۔ مگر کسی نے یہ تک پوچھنے کی زحمت گوارا نہ کی کہ "اے بی! یہ کیسا تحفہ ہے؟" اتنی بڑی ڈیوڑھی، ہزاروں کا آنا جانا۔ مالی تنبولی۔ حلالی حرامی۔ کسی کو روک ٹوک نہ تھی۔ پھر کس کا سر پھرا تھا جو بوجھ تاچھ کرتا۔"

مگر بڑے چچا کی ساری تباہی بمنزلہ بھی اور خوش مزاجی رخصت ہو گئی۔ گیندا خالہ نے ہاتھ اٹھا اٹھا کر جو کوسنے ان کی بیٹیوں کو دیئے تھے۔ وہ پھلانے کی چیز تھے۔ نادرہ بیگم بوڑھی ہو رہی تھیں۔ صابرہ بیگم پرہیز سے نکال رہی تھیں۔ ہیرہ کدکڑے لگاتی اور پکے آم کی طرح شاخ سے ٹپکنے کو ہو رہی تھی۔ اگر کوئی اونچ نیچ ہو گئی تو! انہیں بار بار یہ خیال آتا کہ یہ ساری گیندا کی ہائے پڑی ہے ان پر۔ اس کی آہیں جھپا کر نہ رکھ دیں سارے گھرانے کو۔!

گیندا خالہ نے کوسنے دینے بند نہیں کئے تھے۔" نوکر خانے۔" میں وہی دھما چوکڑی مچتی، وہی ہنگامے برپا رہتے۔ مومن علی اب بھی لپک لپک، ٹھمک ٹھمک کر گاتے۔

"موٹر کی پوں پوں بجت جی"

زہرہ زچہ خانے میں تھیں اور ان کے میاں کے کھانے پینے کی بڑی خرابی ہو رہی تھی۔ صابرہ بیگم نے بڑی فرمانبرداری کا ثبوت دیا۔ اور کہاں تو صابرہ بیگم نے باورچی خانے میں جھانک کر بھی نہ دیکھا ہو گا اور اب تو انکو لہ

سے بچا ہوا سارا وقت باورچی خانے میں گیندا خالہ کی صحبت میں ہی گزرتا۔ اگر بیگم کو پتہ چل جاتا کہ صاحبزادی گیندا خالہ سے کھانا پکانا سیکھ رہی ہیں تو گھر سر پہ اٹھا لیتیں۔ بی مغلانی تو ابھی زندہ تھیں۔ ڈیوڑھی کی اور ساری لڑکیوں کو کھانا پکانا اور کس نے سکھایا تھا۔ مگر جو کچھ بھی ہو، گیندا خالہ تھیں بڑی صاف دل۔ "نہیں" کہنا تو انہوں نے سیکھا ہی نہ تھا۔ چاہے وہ "گڑ چنے" مانگے جانے کی بات ہو یا پھر "چمپی کرنے" کی بات ہو۔ عیاری مکاری سے کہو یا بھولپن سے، ان کی عادت ہی نہ تھی کہ کسی کام کو "نہیں" کہیں۔

زہرہ بیگم زچہ خانہ میں تھیں۔ چھوٹے جانی کو روزانہ سر میں چمپی کروانے کی عادت تھی۔ صابرہ بیگم روزانہ کٹوری بھر تیل لے کر جاتیں اور دروازہ بند کر کے گھنٹوں "مالش" ہوتی۔ چھوٹے جانی ان دنوں بڑے خوش تھے۔ زہرہ بیگم کے پاس دو چار منٹ بیٹھتے، اوپری دل سے ننھے بچے کو پیار کرتے پھر اچانک سر کھجا کر بول اٹھتے۔" اوہ! تمہاری زچگی کی وجہ سے میری مالشی کا ان بڑا ان خرابیاں ہوں رہاں ہے۔" (تمہاری زچگی کی وجہ سے میری مالش کا بڑا حرج ہو رہا ہے) زہرہ بیگم اپنے ناک میں بولنے والے شوہر کے لئے جی کڑھاتیں تو صابرہ بیگم منہ دکھاتیں۔ "زہرہ آپا! مجھے اتنا غیر کیوں سمجھتی ہو۔ کیا میں مالش کرنے سے بھی گئی گزری ہو گئی۔"

کہتے ہیں گیندا خالہ بڑی اچھی چمپی کرتی تھیں۔ نواب حیدر کے سر میں ایک بار انہوں نے اتنی اچھی چمپی کی تھی کہ انہوں نے خوش ہو کر سب کے سامنے ہی اک دم ان کا سنہری منہ چوم لیا تھا۔ وہ شرم سے بالکل ہی تپ گیا تھا اور گیندا خالہ پوری شعلہ بن گئی تھیں۔ مگر بڑے چچا میاں سے

اس حرکت کا سرزد ہو جانا کوئی قابلِ گرفت بات نہ تھی۔ وہ تو تھے ہی ہنسوڑ اور ٹھٹھے باز۔ صابرہ بیگم کو چھیڑ کرنا بھی اسی نے تو سکھایا تھا، اور کھانا پکانا بھی۔ اصل بات یہ ہے کہ گنبدا خالہ نے "نہیں" کہنا تو جانا ہی نہ تھا۔
جس دن گنبدا خالہ کے بیٹے نے جنم لیا، اس دن چھوٹے ماموں اپنی اچکن کے بٹن کھولتے بند کرتے، بے چین بے چین سے شاہجہاں بیگم کے پاس آئے۔

"آپا جان، اب بولو۔ کہاں منہ چھپاؤ گی۔ یہ ساری ڈیوڑھی بیا بوم ہوگئی ہے۔ اور اب پورے خاندان میں کٹی ہو جائے گی۔ ہے ہے، کیا زمانہ آگیا ہے توبہ۔ یہ لڑکیاں پیدا ہوتے ہی مر جائیں تو کیا اچھا تھا۔"
"اوئی، دیوانے ہوئے ہو۔ موئی ماما لونڈیوں کی کبھی کوئی عزت ہوتی ہے۔ حرام کے بچے وہ جنیں، وہ کم بخت کسی دھگڑے کے ساتھ نکل بھاگیں۔ وہ کم بخت ہم تم کیوں جان کڑھائیں۔؟"
چھوٹے ماموں نے سر پیٹ لیا۔ "ارے آپا جان، ماما لونڈیوں کو میں نہیں کہہ رہا۔ ارے تمہاری صابرہ نے ناک کاٹ دی پورے خاندان کی۔ سات پشتوں کے منہ پر کلنک تھوپ دی نابکار نے۔"
شاہجہاں بیگم بیٹھے بیٹھے لڑھک پڑیں۔ "کیا کیا صابرہ نے۔؟"
چھوٹے ماموں نے وحشت میں اچکن کے سارے بٹن کھول دیئے۔ پھر جلدی جلدی بند کرتے ہوئے بولے۔
"آپا جان کیا بولوں۔ ؟ باؤلی میں ڈوب مرنے کی بات ہے۔"
سارے ہنگاموں سے دور، "نوکر محلے" میں بڑی گنبدا خالہ بجیا بنتے جا رہی تھی۔ زچگی کے درد ابھی بند نہیں ہوئے تھے، مگر وہ گا رہی تھیں۔

"سیاں نے دل لے گئے لال بٹوے میں"

صابرہ بیگم کا دل بھی آج سیاں لال لال بٹوے میں لے کر چلے گئے تھے۔ صابرہ بیگم لاکھ گئی گزری تھیں۔ تھیں تو شاہجہاں بیگم کی اولاد جب تک کہ پورے خاندان میں معلوم ہوتی انہوں نے باؤلی میں گر کر اپنے آپ کو دنیا والوں کے طعنوں تشنوں سے محفوظ کر لیا۔

کہتے ہیں کہ شاہجہاں بیگم نے صابرہ بیگم کی پیدائش پر بھی اتنی خوشی نہ منائی تھی جتنی کہ ان کی موت پر منائی۔ ڈیوڑھی والے تو یونہی بکتے پھرتے تھے۔ کوئی بات نہ بھی ہو مگر سننے والوں نے یہ بھی سنا کہ شاہجہاں بیگم نے اندرونی طور پر بٹھائی بھی بانٹی کہ ایسی اولاد کا مٹ جانا ہی اصل خوشی ہے۔

چھوٹے حیانی نے تکیے میں سر چھپا کر خوب آنسو بہائے، مگر سب سے چھپ کر وہ لیپے اٹھتے بڑے۔ بھر پور سے گھر میں سے دسے کے حیدر نواب بھی ایسے تھے جن کی آنکھیں اپنی بیٹی کی موت پر نم ہوئی تھیں۔ وہ کیوں روتے تھے ؟ ان کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا۔ گیندا کا چھوٹا سا بیٹا اس کی چھاتی سے چپٹا رہتا۔ آتے وقت اسے چھاتیاں چھوڑتے دیکھتے مگر کسی نے بھول کر بھی نہ کہا۔" اوئی گیندا خالہ! تمہارے چھوکرے کی شکل تو بالکل بڑے چچا میاں جیسی ہے ۔" مگر چچا میاں کو گیندا کے بیٹے کی آنکھوں میں اپنی ہی صورت نظر آتی۔ انہیں لگتا کہ گیندا نے اپنا بدلہ لے لیا ہے۔ فرق ہی کیا پڑا ؟ باپ بدنام نہ ہوا، بیٹی بدنام ہو گئی۔ اور بدنام بھی کیسی ہوئی کہ جان ہی سے چلی گئی بے چاری۔

صابرہ بیگم تو اپنی جان سے گئیں، مگر ممیرہ کے لئے کانٹے بو کر۔ نادرہ

بیگم تو اب کسی شمار ہی میں نہ تھیں۔ لے دے کے ساری فکر بس ہمیرہ بیگم کے لئے تھی۔ مگر صابرہ بیگم نے جو کالک تھوپ دی تھی وہ اتنی گہری تھی کہ چھٹائے نہ چھٹتی۔ نواب حیدر باؤ لے کتے جیسے ہو گئے۔ شاہجہاں بیگم ہمیشہ اپنے سہاگ کی خیر مناتیں۔ ایسے حالات میں ڈاکٹر ظہیر کا پیغام آیا تو کسی کو انکار کرنے نہ بنی۔ یوں بھی انکار کرنے کی وجہ کیا ہو سکتی تھی۔؟ کھاتا کماتا آدمی تھا۔ دیکھنے میں بھی اچھا تھا عمر بھی خاصی تھی۔ مگر لڑکی قبول لینے کے بعد بھی نواب حیدر پاگلوں کی طرح کھوئے کھوئے رہتے ان کے ہونٹ کچھ اس انداز سے کانپتے جیسے کچھ کہنا چاہتے ہوں مگر کہنے کی ہمت نہیں پاتے۔ لڑکے والوں نے اتنا کچھ مانگا تھا کہ وہ نواب صاحب کی کمر توڑ دینے کے لئے بہت کافی تھا۔ شاہجہاں بیگم نے دبی زبان سے احتجاج بھی کیا۔ مگر زبان تو دی جا چکی تھی۔

ڈھول بجے، آتش بازیاں چھوٹیں اور نواب حیدر کی اولاد میں سے ہمیرہ پہلی لڑکی تھی جو دلہن بنی۔ برات آئی بھی۔ گئی بھی۔ مہمانوں میں ہنسی بھی، گپ شپ بھی ہوئی۔ مگر نواب حیدر ایسے بجھے بجھے اور اداس اداس تھے جیسے شادی کا انتظام کر رہے ہوں۔

دوسرے دن ہمیرہ واپس آئی تو تمام لڑکیوں بالیوں نے اسے گھیر لیا۔ بڑی بوڑھیاں بھی پہنچ گئیں۔ گو زبان سے کسی نے کچھ نہ کہا۔ مگر تاڑنے والی آنکھوں نے تاڑ لیا کہ بڑا بھاری دھوکا ہوا ہے۔ ہمیرہ بیگم کے گالوں پر ابھی تک حجوں کی توں چکنی ہوئی تھی مسی کی دھڑی ذرا بھی تو پھیکی نہ پڑی تھی، اور پھول مرجھا ضرور گئے تھے۔ مگر مسلے ہوئے نہیں معلوم ہوتے تھے۔۔

شاہجہاں بیگم نے سر پیٹ لیا۔ نواب حیدر کے سامنے منہ ڈھانپ

وہ بین کرنے لگیں۔ "ہائے میں نے اپنی ایک ہی بیٹی کا سکھ نہ دیکھا۔ جیسی گئی تھی ویسی ہی آگئی میری بیٹی۔ انشاں جوں کی توں جمی ہوئی ہے۔ مسی کی دھڑی کیسی تازی ہے جیسے ابھی لگائی ہے۔ ہائے تم نے پہلے ہی کیوں نہ پتہ چلا لیا۔؟ ہیرے ہولی میری بیٹی۔ میں پوچھتی ہوں۔"

نواب حیدر نے بات کاٹ دی ان کی۔ "مجھے پہلے ہی سے پتہ تھا۔"

"تمہیں پہلے ہی معلوم تھا۔" شاہجہاں بیگم رونا دھونا بھول گئیں ہونق کر بولیں۔ "تمہیں پہلے ہی معلوم تھا۔ اور پھر بھی اپنی بیٹی کو کنوئیں میں لوٹ دیا۔؟"

نواب حیدر بے لیسی سے بولے۔ "بیگم لاش سڑ جاتی تو اس میں بدبو پیدا ہو جاتی ہے۔ ہمیرہ لاش تھی۔ وہ سڑنے کو تھی۔ میں نے آج بڑے فرض سے سبکدوشی حاصل کی ہے۔ میں نے آج ہمیرا جنازہ بھی اٹھا دیا۔ اب میں بڑا مطمئن ہوں۔" انہوں نے اپنا سر ہاتھوں سے جکڑ لیا۔

دوسرے کمرے میں ہمیرہ گم صم بیٹھی تھی۔ لڑکیاں بالیاں خفیف حال سے بے خبر اسے چھیڑے جا رہی تھیں اور ان ہنگاموں سے دور "نوکر خانے" میں مومن علی ٹھک ٹھک کر، ہاتھ نچا نچا کر گا رہے تھے۔ اور گیندا خالہ ہنسی سے دوہری ہوئی جا رہی تھیں۔

"سیاں مورا بھولا، نہ جانے موری بتیاں
نینیاں موری بند پر، جاگوں ساری رتیاں
آکے مورے گھونگھٹ کو کھولا ہی نہیں
گورے گورے گالوں کو چوما ہی نہیں
سیاں مورا بھولا . . . . ."

دل دماغ و داغ

رقیعہ باہر سے بھاگتی ہوئی آئی اور ضمیر میاں کے کندھے کو ہلا ہلا کر بولنے لگی۔

"ابا۔ ابا۔ کو۔ کوک۔" پھولی ہوئی سانس۔ گھبراہٹ اور خوشی الفاظ منہ سے نکلنے نہ دیتی تھی۔

ضمیر میاں کتاب میں ایسے مشغول تھے کہ بیٹی کی بات پر کان ہی نہ دیئے۔ رقیعہ ایسی بے قراری سے ان کے کندھے جھنجھوڑ رہی تھی۔

"اباجی — ابا — کوک — کوک۔"

ضمیر میاں نے اب کے کتاب کو رکھ دیا اور تیز تیز بولنے لگے: "کوک سا لگا رکھی ہے۔ ہکلی کدھر کی۔ بولتی کیوں نہیں بات کیا ہے؟"

"وہ باہر۔ باہر کوک۔" رقیعہ کی زبان پھر سکتا گئی۔ ضمیر میاں نے جھلا کر زور سے جوتے گھسیٹے اور بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر اسے باہر لے جاتے ہوئے بولے۔

"بتا بھلا، باہر کون سی کوک کوک دھری ہوئی ہے۔"

باہر شٹیک میں رسی سے بندھا چھوٹا سا کتے کا پلا تھا۔ سفید رنگ جس پر خاکستری دھبے، جسم بالوں سے بھرا ہوا۔ لمبے کان اور چھوٹی سی دم، جیسے وہ مور چھل کی طرح بار بار ہلائے جا رہا تھا۔

اب رفیعہ نے بڑی خوشی سے ہکلائے بغیر ہاتھ سے اشارہ کیا اور ہنس کر بولی۔

"کتا۔"

"وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں کہ کتا ہے۔ پھر۔؟"

رفیعہ نے بجھی بجھی آنکھوں سے باپ کو دیکھا۔ کیسے باپ ہیں۔؟ ذرا بھی خوش نہیں ہو رہے! جھلا کر بولی۔

"تو میں بھی دیکھ رہی ہوں۔!"

"پھر اس میں اتنی بدحواسی کی کیا ضرورت ہے۔؟ سانس پھولی جا رہی ہے۔ بال بکھر گئے ہیں۔ زبان ہکلا رہی ہے۔ منہ پر پسینے کے قطرے چمک اٹھے ہیں۔ اپنی ساری گڑبڑ بس اسی لئے۔؟ ہونہہ!" انہوں نے بے مطلب نظروں سے کتے کے پلے کو دیکھنا شروع کر دیا۔

"میں اسے پالوں گی۔"

"ہائیں!" ضمیر میاں کے کانوں میں بم گرا۔" کتا پالے گی؟ ارے تو یہ پلا پالے گی۔؟"

"پھر اور کیا کہہ رہی ہوں تو۔" رفیعہ تنک کر بولی۔

ضمیر میاں نے گڑبڑا کر بیٹی کو دیکھا۔ کیسی بیٹی ہے۔

"لاحول ولا۔ کتا۔ ہونہہ کتا۔ توبہ۔ کتا۔"

رفیعہ نے پھر تنک کر ان کی اور دیکھا۔ پھر مسکرانے لگی۔

"واقعی کتا - ابا کتا - سچ مچ کتا - اتا پیارا کتا -"
ضبیر میاں نے جھنجھلا کر دیکھا - یہ تو عین بن ان کے لہجہ کی نقل کر رہی تھی -
"دیکھو بی بی -" وہ انگلی تنبیہہ کے طور پر اٹھا کر بولے -
"کتا پالنا اچھا نہ ہوگا -"
"مگر کیوں - ؟" وہ اسی روکھے پن سے بولی -
"سبھی بات یہ ہے کہ گھر میں رحمت کے فرشتے نہیں اترتے -" وہ سمجھاتے ہوئے بولے -
اس نے حجت سے ایک شرط پیش کر دی - "دیکھئے ابا میاں جب رحمت کے فرشتے اترنے بند ہو جائیں گے تو میں کتا پھنکوا دوں گی -"
"لاحول ولا - یوں بات کے پیچھے پڑ جاتی ہے - اللہ تعالیٰ نے منع کیا ہے کتا پالنے کو -"
"اللہ تعالیٰ نے تو سینما دیکھنے کو بھی منع کیا ہے -" وہ ناک چڑھا کر بولی -
واہ بھئی کیسی بٹیا تھی یہ - وہ صفا باپ کی عادتوں پر روک ٹوک کر نے والی - جھلا کر بولے - "وہ تو دوست لیکر چلے جاتے ہیں -"
بیٹی مسکینی سے بولی - "تو یہ تو بیٹی پال رہی ہے - جس کا گناہ اس کے ہی سر -"
بیٹیوں کو اتنا لاڈ ہرگز نہیں کرنا چاہیئے - انہوں نے جھلا کر سوچا - اب کے سے انہوں نے بہت پیار سے سمجھایا - بٹیا بات یہ ہے کہ کتا بے حد نجس جانور ہے - بہت ناپاک - جس چیز میں منہ ڈال دے وہ پھنکوانی پڑتی ہے - جس جگہ بیٹھ جائے وہ ہمارے تمہارے بیٹھنے کے لائق نہیں رہ جاتی ، اور بھی ..... "

" تو زیا میاں ہم تو اسے الگ رکھیں گے بھئی ۔" وہ زچ آچکی تھی۔
" قسم اللہ کی آپ کے بڑے بھلے ہیں ہر گز نہیں پڑے گا ہمارا کہنا ۔"
سارے حربے آزمائے جا چکے تھے۔ ہر چال پٹ پٹ جاتی تھی۔ اکدم
ان کے منہ پر چاند سا چمک گیا۔
" بھئی رفو بیٹی تم اپنی نانی اماں سے پوچھ لو، وہی گھر کی بڑی ہیں ۔"
" نانی اماں سے پوچھنے گی تو وہ کہیں گی : بیٹی ! گھر کی کرتا دھرتا
تو تمہاری ماں ہیں ۔ ان سے پوچھو، ان سے پوچھوں گی تو کہیں گی " اپنے ابا
سے پوچھو، ابا سے ..... یوں تو مجھے گھر کی مرغیوں بلیوں تک سے اجازت
لینی پڑے گی ۔ جانتے ہیں نہیں پالتی والتی کتا ۔"
بات تو اتنی آسانی سے، بڑے مزے سے ختم ہو گئی ۔ ضمیر میاں کا دل
مطمئن ہو گیا ۔
دو چار دن یونہی گزر گئے تو ایک دن ضمیر میاں کو اچانک احساس
ہوا کہ رقیہ کا منہ سوکھا سوکھا سا ہے، چہرے پر وہ شادابی نہیں، آنکھیں
مسکراتی نہیں۔ ہونٹ ہنستے نہیں اور گھر پر عجیب سا سناٹا ہے۔
انہوں نے بی بی سے پوچھا ۔
" کیا بات ہے جی رقیہ ایسی چپ چاپ دکھائی پڑ رہی ہے ۔"
" جانے نیک بخت کو کیا ہو گیا ہے ۔ بس منہ میں مونگ دبائے رہتی
ہے ۔ نہ کھائے نہ پیئے ۔ دستر خوان پر بیٹھ کر بھی یونہی اٹھ جاتی ہے ۔ پوچھو
تو بس یہی کہتی ہے : بھوک نہیں ۔"
" ہوں ۔" ضمیر میاں خاموش رہ گئے ۔ بچے ضد کرتے ہیں اور
بہل بھی جاتے ہیں ۔

مگر رفیعہ بی تو ایسی بچہ تھیں کہ بہلائے نہ بہلیں۔ نامراد کتے کے پلے کے پیچھے کھانا پینا، ہنسنا بولنا سبھی کچھ چھوٹ گیا۔ انسان کھائے تو دم رہے۔ اور دم رہے تو ہنسے بولے، چلے پھرے۔ کھانا پینا ہی چھوٹ گیا تو کہاں کی طاقت، اپنے بستر پر پڑی رہتی۔

اس دن کھانا ختم ہو گیا تو دسترخوان پر بیٹھے بیٹھے ضمیر میاں بولے۔

"اجی سنتی ہو بٹیا کی یہ درگت کاہے سے ہے۔"

"کاہے سے۔ ؟" انہوں نے حیرت سے پوچھا۔

"کہتی ہیں کتا پالوں گی۔"

اماں سے زیادہ زور سے نانی اماں چیخیں۔ "اوئی کتا۔ !" اور انہوں نے لعنت بھیجنی شروع کر دی۔

"توبہ کہیں مسلمانوں کے گھروں میں کتے پالے جاتے ہیں۔ ؟"

"مگر اب پالنا پڑ گیا۔" داماد غصہ سے بولے۔

"کیوں بھلا۔ ؟" ساس چیخیں۔

"پھر دہی کیوں۔ ؟" داماد چلائے، "آپ ا۔ ۔ امرادی کی حالت تو دیکھیے۔ کتا نہ پالیں گے۔ بچی جان سے جائے گی۔"

تینوں خاموش رہ گئے۔ بیچ لے ماں کی طرف دیکھا، ساس نے داماد کی طرف، اور داماد نے بیوی اور ساس کی طرف دیکھ کر سر جھکا لیا۔ جیسے۔

"اب کر بھی کیا سکتے ہیں۔ ؟"

"دو چار مہینے میں بٹیا رانی سترھویں میں قدم دھرنے والی ہیں۔ جوان بیٹی کا یوں لاڈ کریں گے۔ من مانی کرنے دیں گے تو یہ بھی نہ سوچیں گے کہ بیاہ کے

بعد سسرال بھجوانا ہے۔ وہاں کون ایسے ناز اٹھائیگا۔؟" اور اماں نے غصّے سے منہ پھیر لیا۔

"تو بیوا نے کب بڑی ہنسی خوشی سے کم بخت کو مرجانے دو۔"

اب باپ کے تند لہجہ میں بیٹی کے لئے پیار پھوٹ پڑا تھا۔

"جو یہ دیکھو نیرہ بہن کے طعنے، جب سنو تب جوانی کا ذکر۔ ایسی کون دیواریں پھلانگ رہی ہے وہ۔؟"

ماس نے حیرت سے داماد کی طرف دیکھا۔ کیسے باپ ہیں۔؟ اپنے سامنے کسی کی چلنے ہی نہیں دیتے۔ ہونہہ۔!

رفیعہ کے بال ہوا میں اڑ رہے تھے اور منہ تمتما رہا تھا۔

"ارے ارے۔ ایسے نہیں۔ یوں نہیں۔ ادھر۔ ہاں ادھر۔"

ڈیو مالک کے اشارے پر دوڑا اور دوڑ کر گیند اٹھا لایا۔

"شاباش۔" اس نے بے تابی میں اپنے ہاتھوں سے اس کی پیٹھ ٹھونک ڈالی اور پھر گھبرا کر پھاٹک کی طرف دیکھا۔ "ابا تو نہیں دیکھ رہے کہیں۔"

دبے دبے قدموں سے چلتی اندر گئی تو دیکھتے ہی نانی اماں نے پھٹکار بتائی۔

"ہاتھ دھوئے ہیں تو نے۔؟"

"ہیں تو۔" وہ بیزاری سے بولی۔ "ہاتھوں کو کیا ہوا۔؟"

"ذرا تمیز ہے۔ اس کتے کے پلے کے ساتھ کدکڑے لگتے ہیں۔ گلے چپاتی لگایا جاتا ہے اور پھر کیسی بن کر پوچھتی ہے ہاتھوں کو کیا ہوا۔؟"

رفیعہ نے شرارت سے نانی اماں کی طرف دیکھا اور پھر مسکرا کر بولی۔

"نانی اماں آپ نے کبھی غور سے دیکھا ہی نہیں۔ ورنہ سچ مچ آپ بھی

تیز کی سی تیزی سے رفیعہ بھی اٹھ کر بھاگی۔ آنگن میں اس کے پیچھے اس کے جوان قدموں کی دھپ دھپ اور ہلکا سنہرا آنچل لہراتا رہ گیا۔ نانی اماں نے بڑی تشویش سے باورچی خانے میں بیٹھی بیٹی کی طرف دیکھا۔

"جوانی گھر ڈھونڈ رہی ہے اور بیٹی کے لچھن دیکھو۔ اس عمر میں کوئی یوں دھپا دھپ بھاگتا ہے۔؟"

بیٹی نے سر جھکا لیا۔ "میں کر بھی کیا سکتی ہوں۔؟ وہ تو بھلی خاصی دلجوائی بن کر رہ گئی ہے۔"

تھوڑی ہی دیر میں رفیعہ باہر سے لیکی ہوئی آئی۔ اس کے چہرے پر ناگوار اور غم کی چھاپ تھی۔ اب قدم ملکے پڑ رہے تھے اور وہ انگلی پر دوپٹہ مروڑتی باورچی خانے کے دروازے پر جا کھڑی ہوئی۔

"امی! زخم لگ جائے تو کیا لگاتے ہیں۔؟" اس نے کن انکھیوں سے نانی اماں کو گھورا۔

"کیوں کیا ہوا۔؟" اماں نے تشویش سے پوچھا۔

"ڈیو کی ٹنگڑی پر زخم لگ گیا ہے۔"

"ہے ہے کاہے سے۔؟" ان کے لہجہ سے پریشانی جھلک رہی تھی۔ آخر بیٹی کا درد تو ہوتا ہے۔

نانی اماں نے پتھر پھینکا جو اسے لنگڑاکرتا ہوا دیوار سے ٹکرا گیا خون جھپرہا ۔

رقیہ جلدی نحو پ کر آئی تو اس کی آنکھیں نم نم سی تھیں۔

ادھر کتا، ادھر رقیہ۔ وہ تو زخم کی تکلیف سے پیاں پیاں کرتا اور یہ اپنے زخموں کے درد سے چور تھی۔

اتنا ذرا سا تو تھا ڈبو، اس پہ ایسا کاری زخم! رفو کا سارا کھلایا پلایا انگ سے جھڑ گیا۔ ایسا سوکھا مارا اگلی کا کتا بن گیا۔ یہ تو امی بھی دیکھتی تھیں اور نانی بھی کہ رات بے رات جب باہر سے پیاں پیاں کی آواز آتی تو اندھیرے میں پلنگ چرچراتا اور دروازہ کو دھیرے سے اپنے پیچھے بند کرتا ایک سایہ باہر نکل جاتا۔ باہر سائیں سائیں کرتی رات سرد تھی اور کبھی کبھار چھینٹے گراتے جاتی، مگر رقیہ کا پلنگ خالی ہی ہوتا۔ اور جب کتے کی پیاں پیاں بند ہو جاتی تو وہ سر پہ دوپٹہ لپیٹے دھیرے سے آتی اور بستر پہ پڑ جاتی۔

کئی دنوں بعد طاہرہ بیگم ضمیر میاں سے مخاطب ہوئیں۔

"بٹیا کے رنگ دیکھتے ہیں نا آپ۔!" مگر اب کے سے ان کے لہجہ میں غصہ نہیں پیار تھا۔

"کیا ہوا۔؟"

"دیکھتے نہیں آپ، زرد ہوئی ترائی کا پھول بنی جا رہی ہے۔"

"امی منحوس ترین۔" اماں نے کہیں پتھر مار دیا۔ پتھر تو اس کے لگا اور زخم ان کے لگ گیا۔ جس دن سے وہ پلہ بیمار پڑا ہے اس کا کھانا پینا بھی چھوٹ گیا۔"

"جہیز میں ڈھیر سارے کتے ہی دے دینا میاں تم۔" نانی اماں نے اپنا غبار نکالا۔ اچھا ہے جی بہلا رہے گا۔

امی ہنسیں۔ "اے بیچ یہ نامراد اس کو اتنا پیار کرتی ہے تو کیا سسرال بھی ساتھ ہی لے جائے گی۔؟" "اے تو ہو آگیا۔؟ بلا سے نوکرانی نہ سہی کتا ہی سہی۔ وہ کام بھی تو خوب کرتا ہے نا۔ صابن دانی اٹھا کر وہ لائے۔ گیندیں وہ لپک لائے۔ قندیل اٹھا کر وہ چلے۔ بھلی خاصی نائکہ ہے تو پھر نوکرانی کا کیا کام۔؟"

ضمیر میاں نے حیرت سے ساس کی طرف دیکھا۔ "اچھا! یہ ڈبو اتنا سدھایا گیا ہے۔!!" ان کی حیرت میں ناگواری کا کوئی شائبہ نہ تھا۔ یہاں تو سارے کا سارا آوا ہی! دندھا تھا۔ ساس نے چڑ کر داماد کی طرف دیکھا۔

" میاں اس میں حیرت کی کون بات ہے۔؟ جیسا سکھایا ویسا ہی سیکھ گیا۔"

رفیعہ نے دور بیٹھے بیٹھے سر اٹھا کر دیکھا۔ اماں ابا دونوں بھی اب رضامند ہو گئے تھے۔ اس کا دل کھل اٹھا۔ "اب تو ڈبو جو دل چاہے سو کرے۔ ہائے۔!" اس کا چہرہ چمک گیا۔

جس دن ڈبو کا زخم بھرا ضمیر میاں نے غور سے بیٹی کا چہرہ دیکھا اس کی آنکھوں کے گرد ہلکے سیاہ گھیرے تھے۔ چہرے پر زردی اور گال ڈھلے ڈھیلے سے تھے، مگر اب اس کے چہرے پر خوشی کی ہلکی سی بجری جا رہی تھی۔

"یہ کتنے کے پلے کے لئے اتنی جان جلاتی رہی ہے۔"

اس دن وہ حیرت سے اپنی بی بی سے بولے۔

"عورت، خواہ کسی کی محبت ہو۔ بس باؤلی بن کر رہ جاتی ہے۔"
بی بی نے ذرا اچنبھے سے ان کی صورت دیکھی۔
"دیکھو نور رفیعہ کا رنگ، کتنے کے پلے کے لئے کیسی باؤلی سی ہو کر رہ گئی۔
کتے کے بنا اس کا دل ہی نہیں لگتا جیسے۔"
"انسان تو انسان ہے، مگر جانور بھی کم نہیں ہوتا۔ اس کتے کا حشر
بھی آپ نے دیکھا۔؟ رفیعہ کا دیوانہ ہے۔ کتا تو یونہی وفادار اور محبت
والا ہوتا ہے۔ پھر یہ ڈبو تو زیادہ ہی دیوانہ ہے۔ اتنا تو وہ بھی دیکھے
ہے کہ گھر میں اور کوئی اس کے گن نہیں گاتا۔ بس جو ہے سو رفیعہ۔ ایک آدھ
بار رفیعہ کام میں الجھی رہے اور باہر نہ جائے تو بار بار دروازے میں
آکر جھانکتا ہے۔
"اور کوئی سنے تو کہے باتیں بنا رہے ہیں، مگر یہ حقیقت ہے طاہرہ بی بی
اس دن رفیعہ کی طبیعت خراب تھی۔ اس نے کھانا نہ کھایا تو ڈبو بھی بھوکا
ہی رہا۔"
"بھلا اس نے کیسے سمجھا ہو گا کہ رفیعہ بھوکی ہے۔ کچھ اس کے سامنے
تو بیٹھ کر کھانا نہیں کھاتی۔" وہ حیرت سے بولیں۔
"اب بی بی یہ تو دل کی بات ہے۔ لاکھ جانور ہے اور بے زبان
بھی، مگر محبت تو سمجھتا ہے۔ سوچا ہو گا روز تو رفیعہ بار بار اٹھ اٹھ کر
جاتی ہے۔ دیکھتی ہے۔ پانی کے پیالے کی خبر لیتی ہے تو کبھی روٹی لا کر
ڈالتی ہے۔ آج نہ گئی تو سمجھ لیا کہ ضرور ایسی ویسی کوئی بات ہے۔ خود
بھی بھوکا رہا۔"
تھوڑی دیر ضمیر میاں چپ رہے، پھر بولے۔" اور ایک بات تو

بالکل انسانوں کی سی کرتا ہے۔ اسی دن سب کی آنکھ بچا کر رفیعہ کے کمرے میں گھس گیا۔ رفیعہ نے کہیں مذاق سے اسے کہہ دیا۔ "تو کھانا نہ کھائے گا تو میں مرجاؤں گی، اور یونہی جھوٹ موٹ بیہوش ہو کر پڑ گئی۔ بی بی اس کی بے قراری تم سے کیا بیان کروں! حیرت اس بات پر ہے کہ اس بے چارے نے کیا مطلب سمجھا ہوگا۔ ؟"

طاہرہ بیگم ذرا آزردگی سے بولیں۔ "جانور کی بات چھوڑئے انسان کی، سب محبت کے سمجھے رہتے ہیں۔ مجھے تو یہی خیال بار بار ستاتا ہے کہ اس کی شادی ہوگی تو ڈبو کا کیا بنے گا۔ ؟"

"ہیں۔ ؟ کیا بنے گا سے مطلب۔ ؟ ارے وہ ساتھ جائے گا۔ اور کیا بنے"

"ساتھ جائے گا۔ ؟" وہ حیرت سے بولیں، "اور سسرال والے یہ نہ کہیں گے کہ نجس اور منحوس جانور ساتھ کر دیا۔ جانے کیسے لوگ ملیں۔ ؟ کیا سوچیں۔ ؟ فرض کرو تنگ خیالات کے ہوئے اور جو کہہ دیا کہ ہم نہ رکھیں تو۔ ؟"

"تو ادھر وہ ادھر یہ۔" وہ سنجیدگی سے بولے۔

"ہے ہے خدا نہ کرے، کیسی بات منہ سے نکالتے ہیں۔"

"میرے منہ سے نکالنے کا کیا ہے، دیکھ لینا کبھی ایسی جدائی کی نوبت آئی تو ایسا ہی ہوگا۔ اس دن ڈبو میاں گھوم گھام کر ذرا دیر سے تشریف لائے تو رفیعہ روٹھ کر بیٹھ گئی اور اسے غصے سے دیکھ کر بولی۔

"اچھا۔ ! یہ وقت ہے آنے کا۔ جاؤ اب میں کبھی تو بات نہ کروں۔" وہ بھی سمجھ گیا کہ مالکہ کا مزاج سٹھ کانے نہیں ہے۔ لگا خوشامد کرنے۔ پاؤں چاٹے، دم ہلائی۔ آزو بازو گھیرے ڈالے اور قدموں میں پڑ گیا۔

میں ٹھیک میں بیٹھا سارا تماشہ دیکھتا تھا۔ رفیعہ یونہی غصے میں اٹھ کر چلی گئی۔ میں نے اندر سے بسکٹ کا ٹکڑا پھینکا تو اٹھ کر سونگھا تک نہیں پھر میں نے دوسرا بسکٹ اس کی ناک کے سامنے لے جا کر رکھ دیا مگر منہ موڑ کر بیٹھ رہا۔ بڑی دیر بعد رفیعہ اندر سے روٹی لئے آئی تو لپکا۔ اور جونہی اس نے روٹی اس کے سامنے ڈالی مزے مزے میں کھانے لگا۔ کھاتا جاتا اور رفیعہ کی صورت کو دیکھتا جاتا۔ ایسی باتوں کی سمجھ اسے کہاں سے آئی۔؟ ادھر رفیعہ بی بی کا یہی حال ہے۔ ادھر ڈبو میاں بھی کچھ کم نہیں رفیعہ سے کبھی زیادتی ہو جائے تو بیماری تمہاری طرح روٹھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ جنہیں دو گھنٹے کی سہار نہیں ہوتی وہ عمر بھر کی جدائی کا سہن کیسے کر پائینگے بھلا۔؟"

"آج کل تو میں بس یہی دعا مانگتی رہتی ہوں کہ خدا دونوں میں کبھی جدائی نہ ڈالے۔"

"جدائی پڑے گی ہی کیسے۔؟ ہم لاکھ ماریں باندھیں وہ خود رفیعہ کے پیچھے پیچھے چلا جائے گا۔"

"اس کے جانے کی تو چھوڑو۔ سسرال والوں کا ڈر مجھے کھائے جاتا ہے۔"

اب تک تو یہ تھا کہ رفیعہ کے پیار میں ایک جھجک تھی۔ رکاؤ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اماں ابا اس کے کتے کو اور اس کے پیار کو کچھ پسندیدہ نظر دل سے نہیں دیکھتے، اس لئے ڈری ڈری سی رہتی۔ مگر اب اتنی ناسمجھ تو تھی نہیں۔ بھانپ گئی کہ دونوں نے نہ صرف حالات سے سمجھوتہ کر لیا ہے بلکہ خود بھی کتے کو پیار کرنے لگے ہیں۔ رہیں نانی اماں، سو ان کا کیا تھا۔ ہماری کی ڈگڈگی

تھیں۔ کوئی سنے نہ سنے ہم بجائے جاتے ہیں۔ اور یوں بھی اولاد اور خصوصاً بیٹی اکلوتی ہو تو ماں باپ ہر برائی کو سہار جاتے ہیں۔ بیٹی ٹھیری پہ گھڑی۔ آج ہے کل چلی۔ اس کا دل دکھائیں تو چین کہاں پائیں۔ ؟ اس کا برا کام بھی بھلا اور بھلا تو بھلا ہی بھلا۔

رفیعہ نے ڈبو کو اولاد کا سا پیار دیا۔ وہی کچھ کیا جو مائیں اپنے بچوں کے لئے کرتی ہیں۔ کبھی ڈبو نے یونہی سر ٹھنکیوں سے وہاکر لمبی تان دی تو رفیعہ کا دل ڈوب ڈوب گیا۔ کبھی وقت پر گھر نہ لوٹا تو جی کلپ کلپ گیا۔ کبھی مقررہ خوراک سے کم کھایا تو دل بیٹھ گیا۔ دن کا کوئی گھنٹہ خالی نہ جاتا ہوگا کہ دو اس کی خبر لینے باہر والے آنگن میں نہ جاتی ہو۔ کبھی سردی پڑنے لگی تو اندر سے پرانی روئی گھسیٹ لائی اور گدیلہ سا بنا کر بچھا دیا۔ کبھی بادل برسے تو چائے پلانا نہ بھولی۔ گرمی ہوئی تو اس کے نہانے کا خیال کبھی دل سے نہ ہٹتا۔

اور ڈبو نے بھی اس پیار کا جواب پیار سے دینے کی کون کمی کی۔ ؟

رفیعہ اپنے ماں باپ کی اکلوتی اولاد، لے دے کے گھر میں نانی اور ماں، باپ باہر کے آدمی۔ اتنے بڑے سارے گھر بھرے دھائیں دھائیں پھرا کرتی۔ اب اس کو ایک ساتھی جیسا مل گیا تھا۔ رفیعہ کا کمرہ باپ کے کمرے سے ملا ہوا تھا۔ ڈبو کو کبھی ادھر اکر مالکن کی یاد ستاتی تو بیٹھک میں کھلنے والے دروازے کی راہ چپکے سے اس کمرے میں آجاتا۔ بیچ کا دروازہ بند ہو جانے سے ماں اور نانی کو پتہ بھی نہ چلتا کہ ادھر کیا کارروائی ہو رہی ہے۔ کبھی کبھار یوں ہوتا کہ رفیعہ اپنے کام میں الجھی ہے اور ڈبو کی خبر لینا بھول گئی۔ ایسے میں ڈبو چپکے سے کھڑکی سے جھانک جاتا اور پھر دروازہ

کھلا پا کر اندر گھس آتا۔ کبھی پاؤں چاٹتا، کبھی قدموں میں لوٹیں لگاتا۔
کبھی یونہی آنکھوں میں پیار بھرے اسے تکے جاتا یا پھر دم ہلاتا کھڑا رہتا۔
رقیعہ کی طبیعت کبھی خراب ہو جاتی، منہ لپیٹے پڑ جاتی تو ڈبو کا دل
اپنے پہلو سے کہیں اڑ جاتا، کھانا پینا اس پر حرام ہو جاتا رقیعہ کھائے تو
وہ بھی کھائے، ورنہ کھانا ایسا کون ضروری ہے۔؟
ایسی باتوں سے رقیعہ کے دل میں ڈبو کی محبت دونی ہو جاتی۔ کبھی
کبھار آنکھوں میں آنسو بھر کر وہ اپنے بے زبان دوست سے بولتی۔
"ڈبو کبھی مجھے چھوڑ کر جانا پڑا تو میں کیسے زندہ رہونگی۔؟"
ڈبو زبان سے بات نہیں کر سکتا تھا۔ مگر آنسوؤں کی زبان خوب
سمجھتا تھا۔ ایسے موقعے پر وہ بے کل ہو جاتا۔ بار بار گول گول گھومتا، زور
زور سے دم ہلاتا اور جب رقیعہ اس کی بے تابی دیکھ کر ہنس دیتی تو وہ
مطمئن ہو جاتا، اس کے قدموں میں لیٹ کر اس کے تلوے چاٹنا شروع
کر دیتا۔ اس سے بھی زیادہ بے کل وہ اس وقت ہو جاتا جب کسی بات پر
تنک کر رقیعہ بولتی۔
"دیکھو ڈبو تو ایسے ستائے گا تو میں مر جاؤں گی۔ ہاں۔" اور وہ
اپنی گردن جھکا کر، آنکھیں موند کر مرنے کا یوں ڈراوا دیتی کہ ڈبو تڑپ جاتا۔
جانے ڈبو نے مرنے کا کیا مطلب سمجھ رکھا تھا۔ یہ تو ہوتا ہی تھا۔ کہ جہاں ڈبو
نے کسی چیز کے کھانے سے انکار کیا یا کوئی اوندھی سیدھی حرکت کر دی کہ
رقیعہ بول اٹھی۔
"دیکھو ڈبو میں مر جاؤں گی۔ ہاں۔" تو وہ یوں چکر پھیریاں
کھانے لگتا جیسے دم سے بھڑوں کا چھتہ لپٹ گیا ہو۔ سنتے ہی دیر وہ بے کل

بے کل سا تلملاتا رہتا اور جب رقیہ اس کے منہ میں روٹی یا بسکٹ کا ٹکڑا رکھ دیتی تو کھاتا جاتا اور چمکیلی آنکھوں سے اسے دیکھتا جاتا بالکل کہتا ہو ۔ "اب سے ایسا کلمۂ بد منہ سے نہ نکالنا ۔ ہاں ۔ سمجھیں ۔"

ابا میاں بیٹھک میں سے سارا تماشہ دیکھا کرتے ۔ ایسی نا قابل یقین باتیں وہ اپنی بی بی کو سنانا نہ بھولتے ۔

"اجی سنا ، رقیہ نے جب یہ کہا تو ڈبو نے کیا کیا ۔؟"

"اجی دیکھا ، وہ کیسے روٹھ جاتا ہے ۔ جیسے ہم تم ہوئے ، جانور نہ ہوا ۔"

طاہرہ بیگم اداسی سے بولتیں ۔ "ہاں کتا بڑا سمجھدار جانور ہوتا ہے ۔ جانے اللہ میاں نے اس کا پالنا کیوں ٹھہرا دیا ہے ۔؟ ان کی اداسی کا مطلب ضمیر میاں سمجھ جاتے کہ "سسرال میں رقیہ کا جی کیسے لگے گا ۔؟"

بیٹیاں ماں باپ کے گھر زندگی گزارنے کے لئے تھوڑی ہی پیدا ہوتی ہیں ۔ ایک دن تو انہیں سسرال جانا ہی پڑتا ہے ۔ اور رقیہ بی بی کو بھی جانا ہی پڑا ۔ اماں یا وا کو معلوم تھا کہ ادھر رقیہ اور ادھر ڈبو کیا کیا فیل مچائیں گے ۔ جس دن برات کو اترنا تھا ۔ اماں نے ڈبو کو گودام کے ساتھ والے کمرے میں بند کر دیا ۔

" اللہ جانے سسرال والے کن گنوں کے ہیں ۔ پیٹ میں جھانک کر کس نے دیکھا ہے ؟ محض اتنی بات پر ابھی سے دل برا کر لیں کہ ساتھ میں منحوس کتا چلا آیا تو آگے بٹیا کی زندگی کا کیا بنے گا ۔؟"

روٹی اور ہنڈیاں سامنے پڑی رہیں ۔ صبح سے شام ہوگئی مگر ڈبو نے کسی چیز کو منہ نہ لگایا ۔ ادھر باجوں کی دھیمی دھیمی آواز کانوں میں

پڑی اور ادھر رفیعہ بی نے ہلکی ہلکی آوازوں سے رونا شروع کر دیا۔ مالکہ کے رونے کی آواز کانوں میں پڑتے ہی ڈبو کا دل اڑ گیا۔ اس نے اِدھر اُدھر اچکنا اور بے معنی طور سے گودام میں گھومنا شروع کر دیا۔

ادھر رفیعہ نے بے جگری سے رونا دھونا مچا رکھا تھا۔ آنسو تھے کہ بہے چلے جاتے تھے۔ ساتھ کی سکھی سہیلیاں سمجھاتے سمجھاتے تھک گئیں۔

"اے بی رو مت نہیں۔ کیا آج پہلی بار تمہیں پیا کے گھر جا رہی ہو۔؟"

"سچ سچی ایسا رونا تو ہم نے کبھی نہ دیکھا۔ ارے یہ تو انتی پرانی ریت ہے، کون یوں آنکھیں کھونے کے پیچھے پڑ جاتا ہے۔؟"

رفیعہ بے تکے پن سے بولی۔

"میں تو اپنے ڈبو کے واسطے رو رہی ہوں۔ ہائے۔! میں چلی جاؤں گی۔ تو وہ تو مر ہی جائے گا۔ وہ تو میرے بنا روٹی کو سونگھتا بھی نہیں۔"

ساری سکھیوں کے منہ ستّ گئے۔

"اری پاگل! سہاگ رات کو دلہنیں دلہوں کے سپنے دیکھتی ہیں یا کتوں کے لئے روتی ہیں۔؟ تھو! کیا بیہودہ لڑکی ہے۔!"

"ہم کو اچھا لگتا ہے جی ہمارا کتا۔ ہم تو مر جائیں گے، ہاں۔" اور رفیعہ نے دگنی شدت سے تلملا تلملا کر رونا شروع کر دیا۔

سسرال کی عورتوں نے دلہن کو سجایا سنوارا، زیورات پہنائے۔ مسی افشاں لگائی، ماں باپ، عزیزوں سے گلے ملوایا اور لے چلیں۔ پھولوں سے لدی سجی سجائی موٹریں ایک طرف رفیعہ کے دولہا بیٹھے اور ایک طرف رفیعہ ساتھ میں ساس، نندیں اور دوسری طرف رشتہ دار عورتیں۔ باجوں کے ساتھ ہی موٹر چیونٹی کی چال چل رہی تھی۔

ادھر گھر بھر میں ایک دم سناٹا سا پڑ گیا۔ رفیعہ کی مہین مہین آوازیں ختم ہو گئیں۔ ڈبو نے گول گول گھومنا بند کر کے صورتِ حال کا سنجیدگی سے جائزہ لینا شروع کیا۔ کمرے میں کاٹھ کباڑ بھرا پڑا تھا۔ کھڑی ہوئی بے کار چارپائیاں لڑھکی ہوئی تپائیاں، میز، فالتو صندوقیں۔ الابلا۔ گھر کا جتنا بے کار سامان تھا سب اسی کمرے میں ٹھونس دیا گیا تھا۔

ڈبو نے بلیوں کی طرح جست لگائی اور کھڑی چارپائی پر کود گیا۔ چارپائی سے اچھلا تو دیوار میں اونچی کیل سے اٹکی چوکی پر لٹک گیا۔ وہاں سے اچھلا تو روشن دان میں جا بیٹھا۔ روشن دان میں بیٹھ کر گھر کا جائزہ لیا۔ دھیرے سے قدم اٹھا کر کھپریل پہ پاؤں جمائے۔ کھپریل پر آہستہ آہستہ چل کر کھیے تک آیا۔ آنگن میں مہمان بیبیوں کے لئے تخت بچھے تھے۔ اندر کھانے دانے ہو رہے تھے۔ آنگن میں کوئی نہ تھا۔ ڈبو منڈیری سے اچھلا اور تخت پر کود پڑا۔

موٹر چیونٹی کی چال چلتی ابھی گھر سے چند ہی قدم پہنچی تھی کہ ڈبو بھی خاموشی سے برات میں جا شامل ہوا۔ اجنبیوں کو دیکھ کر اس نے بھونک بھونک کر آسمان سر پہ اٹھا لیا۔ نہ کسی کو کاٹنے دوڑا، نہ کسی کو خشمگیں نگاہوں سے گھورا، نہ پیچھے لپکا۔ یوں خاموشی سے پیچھے چلتا رہا جیسے میت کے ساتھ ساتھ چل رہا ہو۔ باجوں کی تیز تیز دھپڑ دھپڑ کے باوجود اس کے کانوں میں رفیعہ کی سسکیوں کی ہلکی ہلکی سی، سی، سنائی دے جاتی۔

برات سسرال میں جا کر رک گئی۔ براتی بھی اتر پڑے اور دولہا دلہن بھی۔ جب دولہا دلہن سجے سجائے کمرے میں لے جائے گئے تو ڈبو بھی چپکے سے سبز جھیوں کے پاس دروازے سے لگ کر بیٹھ گیا۔ دولہا دلہن کے لئے کھانا آیا، دلہن شرمائی سہمی سی بیٹھی تھی۔ بھلا اپنے ہاتھ سے کیسے

کھانے لگ جاتی۔ دولہا میاں نے اپنے ہاتھ سے بیروں کی طرح کھلانا
شروع کیا اور دھیرے سے بولے۔
"کھاؤ نا۔ کب تک روٹھو گی۔؟ اب تو....." وہ شرارت سے ہنس کر
چپ ہو گئے۔
پہلے تو رفیعہ یونہی بیٹھی رہی۔ مگر جب ان کا اصرار بڑھتا ہی رہا۔
تو اس نے گھونگھٹ کی آڑ سے ہاتھ نکالا اور ایک نوالہ توڑا ہی تھا کہ ایک
دم ڈبو آنکھوں میں پھر گیا۔ رفیعہ کا تو معمول تھا۔ کہ جب تک ڈبو نہ کھا
لیتی وہ نوالہ توڑتی بھی نہ تھی
ہائے رے وہاں۔ اسے کس نے کھانا دیا ہو گا۔؟ بڑا تیوری کی گڑبڑ میں کسی کو
اس کی یاد آئی ہو گی ؟ ہائے نامراد دن بھر سے اس تنگ کمرے میں بند رہا تھا
"پچس، پچس۔" وہ سسک سسک رونے لگی۔ دروازے پر بیٹھے ڈبو نے
اپنی موجودگی کا دھیرے سے احساس دلایا۔
"عیوں، غاؤں، غیاؤں عیوں۔"
رفیعہ نے بیتابی سے گھونگھٹ الٹا تو دیکھا کہ ڈبو تو وہیں دروازے
سے لگا بیٹھا تھا۔ وہ لپکی اور ایک دم دروازے میں پہنچ گئی۔ ہاتھ کی روٹی
اس کے آگے ڈال دی اور بے تابی سے "ڈبو، ڈبو" کہہ کر پچکارنے لگی۔ اسی
دم کمرے میں اسے کسی غیر کی موجودگی کا احساس ہوا اور اس نے گھبرا کر پیچھے
دیکھا۔ دولہا میاں مسکرا رہے تھے۔ شرم کے مارے اس کا جی کٹ کٹ گیا۔
نیچی نیچی پلکیں جھکا لیں اور اس کا نمکین سلونا چہرہ پھر سے ایک
ہاتھ لمبے گھونگھٹ کی اوٹ میں چلا گیا۔
بیچ رات ڈبو کی خبر لینے گودام کے ساتھ والے کمرے میں پہنچیں تو

دیکھا روٹی، ہڈیاں اور پانی کا پیالہ جوں کے توں رکھے ہیں، مگر خود ڈبو میاں غائب ہیں۔ سارے بین ڈھونڈ یا پڑ گئی۔

"کہاں گیا۔؟ کدھر گیا۔؟ کہاں گیا۔؟ کدھر گیا۔؟"

"بھاگ گیا ہوگا۔" کسی نے سنایا۔

"اے لو، بات سنو۔ بھلا کتے بھی کہیں گھر چھوڑ کر جاوے ہیں۔؟" کسی بڑی بی نے کہا۔

"تو پھر دلہن کا پالا تھا۔ دلہن کے ساتھ چلا گیا ہوگا۔"

"وہ لی کتا ہی تھا۔ بلی تو نہ تھا کہ اچک کر روشندان یہاں سے باہر کو ہو لیا۔"

"نامراد نے کہیں جان تو نہیں دے دی۔" طاہرہ بیگم نے ہول کر سوچا۔

"اگر وہ گیا تو سمجھو رقیہ بھی گئی۔" انہیں کسی پل قرار نہ آ رہا تھا۔

دس بجتے بجتے جب سسرال سے دلہن کی واپسی ہوئی تو ڈبو میاں آگے آگے جھومتے جھاتے چلے آ رہے تھے۔

"ہائے یہ تیرے ساتھ ہی چلا گیا تھا۔؟" اماں نے حیرت سے پوچھا۔ ساتھ کی سکھی سہیلیوں نے جب کرید کرید کر سہاگ رات کی باتیں پوچھیں تو رقیہ نے کتے کی باتیں زیادہ کہیں اور دولہا کی کم۔

"تھو۔ ایسا بھی کوئی کیا کرتا ہے۔؟ یہ لڑکی تو نری پاگل ہے۔ ہونہہ"

طاہرہ بیگم اور ضمیر میاں نے سوچا تھا کہ سسرال والے کیا کہیں گے اور کیسی نگاہ سے دیکھیں گے۔ سسرالیوں نے تو اس بات کا کوئی نوٹس ہی نہ لیا۔ کتا رہتا نہ رہتا۔ ان کا کوئی اعتراض ہی نہ تھا۔ دولہا میاں اپنی نئی نویلی سلونی دلہن کے عاشق تھے۔ انہیں بلی پیاری تھی، اس کا کتا بھی پیارا۔ ڈبو نے اپنی نئی موشی سے گھر بھرے میں اپنی جگہ

جاتی کہ کسی قسم کی ناامیدی کا سامنا ہی نہ کرنا پڑا۔
رفیعہ ایسے گھر میں پیدا ہوئی تھی جہاں آگے پیچھے کوئی نہ تھا۔ لے دیکر اسی کی ذات سبھوں کے پیار کا مرکز تھی۔ نانی ہیں تو نثار، باپ ہیں تو ہر جا بے جا ضد پوری کرنے کو تیار، اور ماں تو ماں ٹھہریں بھولے بھٹکے کبھی جھڑک بھی دیتیں تو پھر ایک گھنٹہ آنسو بہاتیں کہ "ہائے میں نے اپنی لاڈو کو کیوں جھڑک دیا۔؟"
اب تک اس نے صرف پیار کیے جانے، چاہے جانے کی لذت ہی چکھی تھی۔ پیار کرتے ہیں۔ چاہتے ہیں تو مزہ تھا اس کا اسے علم نہ تھا۔ دوہا میاں اسے یوں دل و جان سے چاہتے تو وہ بھی اپنا پیار لٹاتی۔
"پیار کرنا بھی اتنا بھلا ہوتا ہے۔؟" وہ اپنے آپ میں سوچے جاتی۔ ماں باپ سے ضد کر کے ہر بات پوری کروا لینا اور تھا، اور اب میاں کی ضد پوری کر دینا اور۔ اس کر لینے اور کر دینے میں کتنا بڑا فرق تھا! اب تک وہ ماں باپ سے خدمت کرواتی آئی تھی، اب وہ خود کسی کی خدمت کرتی تھی اور اس میں لطف بھی لیتی تھی۔ بچپن میں گڑیاں کھیلی تھیں، ہنڈ کلیا پکائی تھی۔ چھوٹے موٹے گھر کی دیکھ ریکھ کی تھی، اب سارے میں جان پڑ گئی تھی۔ اب یہ سب کچھ جیتا جاگتا ماحول بن گیا تھا۔ یہاں بے زبانی نہ تھی، خاموشی اور وہماتی نہ تھی۔ ساس، سسرے، نند، دیور اور پھر سب سے بڑھ کر اپنا پیارا دلہا۔ ان سب کو اور سب سے بڑھ چڑھ کر میاں کو پیار کرنے میں، ان کی خدمت کرنے میں اس کو عجیب لطف آتا اور پہلے کے پہلے ہر ہر کام لپک لپک کر کر دینے میں اسے بڑی خوشی ملتی۔ اس خوشی میں وہ ہر لمحہ ڈوبی رہنا چاہتی۔

اس دن معین میاں آفس جانے لگے تو ساڑھے نو ہو رہے تھے۔ پونے دس بجے آفس پہنچ جانا پڑتا تھا۔ رفیعہ نے ناشتہ میز پر لا کر رکھا تو ہنس کر بولے۔

"تمہاری وجہ سے آج آفس کو دیر ہو گئی۔"

"کیوں، میں نے کیا کیا بھلا۔؟" وہ حیرت سے بولی۔

وہ منہ کچھ بن سے بولے۔ "کبھی نو بجے تک تو ہم ایک جان تن کے ساتھ ہوا۔"

"ہائے ہائے۔" رفیعہ شرما کر بولی۔ "ایسی بے حیائی کی باتیں کبھی نہ کیجئے۔ کوئی سنے تو کیا بولے۔؟"

"اچھا۔" معین میاں ہنس کر بولے۔ "ہوا سو ہوا۔ اب تو جلدی سے ناشتہ کر لیں۔"

معین میاں نے آج تک کبھی دلہن کے بغیر نوالہ نہیں اٹھایا تھا۔ اب اس وقت گڑبڑ دیکھ کر رفیعہ بولی۔

"صرف ایک پراٹھا تو میز پر ہے۔ اتنی جلدی میں ساتھ کھانا ایسا کیا ضروری ہے۔؟ ابھی ماما پکا کر بھیجتی ہے۔ آپ کھا لیجئے۔ اتنے میں اور آجاتے ہیں۔"

"نا بھئی ہم اکیلے نہ کھائیں گے۔ چاہے وہ ایک نوالہ ہی کیوں نہ ہو۔"

"اور جو آفس جانے میں دیر ہو رہی ہے اور۔؟" رفیعہ نے لاڈ سے پوچھا۔

معین میاں نے اپنے مضبوط پنجے میں اس کی نازک کلائی دبوچ لی۔

"بھجو گی یا پھر رات کی طرح۔"

"ہائے ہائے، آپ اس قدر بے تکے ہیں۔ اب یہ رات دن کی باتیں یاد دلانے کا کون موقع ہے۔؟" اور رفیعہ نے بڑی بھری شرمیلی نظروں

سے میاں کو دیکھتے دیکھتے نوالہ منہ میں رکھ لیا۔
رفیعہ نے آج تک کبھی ڈبو کے بغیر نوالہ نہ اٹھایا تھا۔ میز کے نیچے بیٹھے ہوئے ڈبو نے پہلے تو ذرا حیرت، اور پھر ناگواری سے رفیعہ کو دیکھا۔ ہاں وہ اکیلی ہی تو کھا رہی تھی۔ آج اسے ڈبو کی یاد نہ آئی۔ ڈبو نے بے چینی سے دم ہلائی اور وہاں سے اٹھ کر مہندی کے پودے تلے جا بیٹھا۔
ناشتے کے بعد نوکر نے جھوٹے برتن اٹھائے اور مہندی کے پودے تلے ڈبل روٹی کے جھوٹے ٹکڑے اور ہڈیاں ڈال دیں۔ ڈبو نے تھوتھنی اٹھا کر ہوا میں کچھ سونگھا اور پھر گردن دبا کر سوتا بن گیا۔
دو بجے کے کھانے کے بعد اچانک رفیعہ کو ڈبو کی یاد نے آ گھیرا۔ رکابی میں روٹی اور گوشت کی بوٹیاں لے کر وہ مہندی تلے پہنچی۔ ڈبو نے اس کی آمد پر کسی قسم کی خوشی کا اظہار نہ کیا۔ ٹانگوں میں گردن دبائے یونہی پڑا دیکھتا رہا۔ رفیعہ اس کی ناراضگی کی وجہ سمجھ گئی تھی مسکرا کر بولی۔
"ڈبو راجہ کو غصہ آ گیا۔" اور ٹکڑے سامنے ڈال کر بولی۔ "او بسم اب کھا بھی لو اور ختم کرو غصہ۔"
ڈبو نے اٹھ کر دونوں پنجے پسارے بدلے اور پھر لیٹ گیا۔
"نہیں کھائے گا۔" رفیعہ نے ذرا تیزی سے پوچھا۔
ڈبو نے مالک کو دیکھا تک نہیں۔
"اچھا یاد رکھو۔ تو نہیں کھائے گا تو میں سچ مچ مر جاؤں گی۔"
اکدم ڈبو اٹھ بیٹھا۔ دم گھما گھما کر دونوں چکر پھیریاں کھائیں اور روٹی پر پل پڑا۔

اس دن تو یہ ہوا تھا کہ ناشتے کے وقت ڈبو بھلایا گیا تو کہیں
دوپہری کو یاد آیا، اب تو یوں ہونے لگا کہ ڈبو جب کا ہی ہے۔ دو دو وقت
گزر گئے ہیں مگر مالکن کو یاد ہی نہیں آ چکتی۔ کبھی دن بھر میں ایک
آدھ بار یاد آ گئی تو وہ دوڑی دوڑی آئی اور اپنے مرتے کا ڈرا دا دے کر
اسے کھانا پلا پانی۔ لاکھ کتا سہی، مگر محبت اور نفرت کا رد بدل خوب سمجھتا تھا۔
جان گیا کہ اب اس کا ایک اور دعوے دار پیدا ہو گیا ہے۔ لیلیٰ نے ہی کتے
کو نظر انداز کر دیا تو مجنوں کی جوتی کو غرض پڑی تھی کہ وارے صدقے
جاتا۔ پہلے جہاں معین میاں آفس سے آتے ڈبو لپکا پڑتا اور پیروں
اور جوتوں کو رال سے لتھ پتھ کر دیتا۔ اور وہ بھی پیار سے چمکار دیتے۔
اب جب کبھی موٹر سائیکل گھڑ گھڑاتی اور دروازہ کھڑ کھڑاتا تو ڈبو یوں منہ
بند کئے سویا پڑا رہتا۔ معین میاں نے اس کی اس تبدیلی کو مانند
[illegible] نہ کیا۔

ڈبو کی خاک سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اچھی بھلی ہنستی کھیلتی رقیہ
کو کیا ہو گیا ہے کہ اب بستر سے لگ گئی ہے۔ کھانا پینا سب [illegible] لے کر
اُگل دیتی ہے۔ کھانے [illegible] دو یہاں نہ پہنچتے۔ جب دیکھو تب [illegible] کے
ڈھیر ہیں، نارنگیوں کے چھلکے دکھائی پڑتے، ورنہ پہلے تو ہڈیاں بھی
ہوتی تھیں اور روٹی کے ٹکڑے رہتے۔ کچرا رستے کے ڈھیر میں [illegible] باورچی
خانے کے پیچھے لگا رہتا تھا۔ اس میں تو خیر اب بھی وہی نعمتیں پڑی رہتیں
مگر یہ رقیہ کے کمرے کے ساتھ والے ڈرام میں اب لے دے کے وہی
نارنگی کے چھلکے، انار کے چھلکے۔ معین میاں دلہن بی بی کے آگے پیچھے ہوتے
بس بچھے جاتے [illegible] کہ [illegible] ملنے گود میں کر لیتے۔ ماتا [illegible]

دلہن بی بی کو آدھ، آدھ کر کے ابکائیاں آتیں، قے ہونے لگتیں۔ ادھر سے ساس دوڑی آتیں، ادھر سے نند۔ اور پھر خود دولہا میاں! ڈبو کی بن آئی دنوں اور بھی اچھی اچھی سی ہو گئی۔ رات بھر چوکسی سے جاگتا رہتا۔

پھر ایک رات اندھیرے کو چیرتی دلہن بی بی کی چیخیں سارے میں پھیل گئیں۔ سارے گھر میں بھگدڑ پڑ گئی۔ نوکر ادھر ادھر دوڑنے لگے۔ ڈبو مہندی تلے لیٹا سارا تماشہ دیکھتا رہا۔ پھر زورا طوفان تھا اور اندر سے ننھی مہین چیخوں کی آوازیں آنے لگیں۔ جیسے دلہن بی بی کئی برس چھوٹی ہو گئی ہوں اور باریک آواز سے روتی ہوں۔

ڈاکٹرنی باہر نکلی اور معین میاں سے مسکرا کر بولی۔

"گرل۔ بالکل چھوٹی سی، مدر کی کاپی۔"

معین میاں کھڑے کھڑے زور سے اچھلے۔ پھر ماں کی موجودگی کا خیال کر کے شرمندہ ہو گئے۔

رضیہ نے اب تک گڑیوں سے کھیلا تھا۔ کتے سے کھیلا تھا، میاں سے کھیلا تھا، مگر اس قسم کی عجیب و غریب زندگی بھر کی مسرت کے برابر تھا جس کی آتی جاتی سانس اس کی اپنی زندگی کا پیغام تھی۔ بچی کے دم دونوں میاں بیوی اور قریب آ گئے۔ معین میاں آفس سے بددل ہو گئے۔ اتوار کے انتظار میں مرے جاتے۔ اور جب اتوار آتا تو تینوں، ماں، باپ اور بچی، کمرے میں قہقہے لگاتے، مسکراتے، ہنستے پھر شام کو بٹیا رانی اور آدھو بازو ماں باپ، سیر کو نکل جاتے۔

بچی کبھی ماں کی گود میں، کبھی باپ کی گود میں۔ معین میاں پہلے ہی کیا کم رضیہ کے دیوانے تھے، اب تو بالکل ہی مٹ کر رہ گئے۔ اس نے انہیں

ایک عام آدمی سے اکدم باپ کا درجہ دے دیا تھا۔ اور رفیعہ بی بی کو ماں کا رتبہ معین میاں نے دم قدم سے ہی تو ملا۔ دونوں کی محبت پہلے سے دگنی تگنی ہو گئی۔ اور بچی ان کی محبت کا زندہ ثبوت تھی۔

ایک ستارہ ٹوٹ جائے تو آسمان سونا نظر نہیں آتا۔ دوسرے ستارے اس کی کمی پوری کر دیتے ہیں۔ ڈبو ایسا ہی ٹوٹا ستارہ تھا۔ جس کی کمی رفیعہ نے محسوس نہ کی۔ وہ رفیعہ کے دل کے آسمان سے ٹوٹ کر گر بھی گیا تو کیا تھا۔ وہاں دو دو ستارے چمکتے تھے۔ آسمان کی روشنی میں کیا فرق پڑا۔ وہ اس کی زندگی سے دور ۔ دور۔ اور دور ہوتا گیا۔ ہو گیا۔ مگر معین میاں اور بچی کی زندگی نے سارے اندھیرے اجالوں سے بدل کر رکھ دے۔ ایسے ستارے کا غم کون کرتا ہے۔ کوئی کرے۔؟

انسان اور جانور کا سوال نہیں ہے۔ سوال ہے محبت کا، جو کسی کی بٹیر بھی لگانہ برداشت نہیں کر سکتی۔ اس لا پرواہی کا لازمی نتیجہ یہ تھا۔ کہ ڈبو دونوں باپ بیٹی کا دشمن بن گیا۔ اس کی حیوانی عقل نے اسے یہی سمجھایا کہ جس طرح بن پڑے انہیں ستائے۔

ڈبو کو چیزیں منہ میں اٹھا کر ادھر ادھر لانے کی عادت تو تھی ہی۔ معین میاں جوتے اور موزے اتار کر رکھتے تو وہ موزے منہ میں اٹھا کر باہر لاتا اور ادھر ادھر پھینک دیتا۔ وہ آفس جانے کو اٹھتے تو سارے میں ڈھونڈتا پڑ جاتی۔ موزے کبھی نہ ملتے۔ ڈبو سب کو پریشان دیکھ کر مارے خوشی کے ایک پیر پہ ناچنے لگتا۔ کبھی معین میاں کے جوتے اٹھا کر کیچڑ میں پھینک آتا۔ کبھی تالی نظر آجاتی تو جا کر رکھ دیتا۔

بچی دونوں میاں بی بی کی جان ایمان تھی۔ اس لئے بچی کو بھی

اپنا دشمن تصور کر لیا۔ وہی نو شتی جو کانٹا بن کر آ گئی تھی۔ ورنہ رفیعہ جس نے اسے پھولوں کی طرح رکھا تھا۔ اب کانٹوں کی طرح کھٹک رہی تھی ڈبو اس کی ساری چیزیں خود برباد کر دیتا۔ رفیعہ کی آنکھ بچا کر بچی کا سارا دودھ پی جاتا، بوتل میں لگا نپل چبا ڈالتا۔ رفیعہ پریشان ہوتی غصہ ہوتی تو دور بیٹھا چمکیلی آنکھوں سے مار کھانے کا ارادہ دیکھا کرتا۔

اب دل کے زخموں کا مرہم بیٹی تھی شاید بہی کوئی وقت ایسا آتا ہو جب رفیعہ ڈبو کو روٹی ڈالتی ہو۔ نوکر ہی کھانا اور پانی لا کر سامنے ڈال دیتے، کھائے نہ کھائے۔ کبھی کبھار بچی کو لئے وہ ادھر وائے دالان میں جاتی تو سبز جمبیوں سے اتنے اتنے اسے چمکار کر پوچھتی

"کیوں ڈبو کھانا کھا لیا۔؟"

شاید اس کے دل میں ابھی تھوڑی بہت محبت باقی رہ گئی تھی۔ ڈبو کی شرارتیں حد سے بڑھتی گئیں۔ مگر رفیعہ پر یہ بھید نہ کھلا۔

گھر میں نند کے ایک نہ دو پورے سات بچے تھے جو دن بھر دل جلانے اور مستیاں کرتے۔ ایک دن ان میں۔۔۔ کسی نے اس زور سے ڈھیلا کھینچ مارا کہ ڈبو کی ٹانگ میں اتنا بڑا زخم لگ گیا۔

آج سے کئی دنوں پہلے نانی اماں نے پتھر کھینچ مارا تھا تو رفیعہ پر راتوں کی نیند حرام ہو گئی تھی۔ آج پھر اس کے زخم لگ گیا تو وہ باہر آئی اور بچوں کو ڈپٹ کر بولی۔

"توبہ! اتنے سمجھدار ہو، بے زبان کو مارتے شرم تو منہ آتی ذرا سی۔؟" اور وہ نوکر سے کہہ گئی۔

'رحیم' ذرا اس کی خبر لیتے رہنا۔ زخم بڑھ جائے تو جلد ٹھیک نہیں ہوتا۔" رحیم روزانہ ایک سڑا ایسا مرہم تھوپ جاتا اور ڈبو اس کے

ادھر اور بڑھ رہا تھا۔ زخم کو نوچ نوچ کر بچھڑے سے ہرا کر لیتا۔ زخم بڑھتا رہا۔
مگر رفیعہ کا دھیان ادھر گیا ہی نہیں، کیونکہ ادھر منی کی طبیعت خود
خراب تھی۔ دونوں میاں بی بی کا سارا سارا وقت بٹیا رانی کی تیمار داری
میں صرف ہو جاتا تھا۔

ڈبو نے زخم کھرچنا چھوڑ دیا۔

زخم اچھا ہوا تو ڈبو اور زیادہ شریر ہو گیا۔

سارے فساد کی جڑ تو منی ہی تھی۔ اب تو منی کے ریشمی قیمتی فراک
گم ہو جاتے، جوتے غائب، دودھ کا بگونا خالی۔ تیل پھیلے چیز۔ رفیعہ
نے ایک دن الجھ کر میاں سے شکایت کی۔

"بھئی یہ آپ کی آپا کے بچے اس قدر شیطان ہیں، دیکھئے نا۔
منی کے سامان کی گتیاں بنا گئیں نپل ہیں تو پھٹے ہوئے۔ چھپے ہوئے
فراک غائب، جوتے گم، کھلونے ٹوٹے پڑے ہیں۔ کوئی ایک بات ہے۔"

معین میاں نے بھی بچوں سے بھانجیوں کو بلا کر ان کی پیشی کی تو
وہ دیدے ٹپ ٹپا کر ان کی طرف دیکھنے لگے۔

"ماموں جان ہم نے تو ایک چیز کو بھی ہاتھ تک نہ لگایا۔"

"شرارت کرتے کرتے اب جھوٹ بھی بولنے لگے۔" رفیعہ نے جل
کر میاں سے شکایت کی۔

ایک دن ڈبو میاں اکیلے منی کا بنا نیل پھاڑنے کی کوشش میں
مصروف تھے کہ رفیعہ کسی کام سے ادھر نکل آئی۔ اس کام سے فراغت ہوئی
تو دودھ پر پل پڑے۔ وہاں سے ہٹے تو رفیعہ کی آنکھ دل میں خون اتر آیا۔
"ہوں، تو یہ آپ کی کارستانی تھی۔ اور بچے بیچارے ناحق ہی

ملعون ہوتے رہے۔"

ڈپٹ کر اس نے رحیم سے کہا۔ "نے جا کر نیم کے تنے سے مضبوط رسی سے باندھ دے۔ خبردار جو کھلا رکھا۔"

ڈبو کے دانت خاصے تیز تھے۔ اس نے تھوڑی ہی دیر میں رسی چبا ڈالی اور سیدھا نصیبوں کے پاس موجود! رقیبہ نے اسے کھینچا کر دیکھا اور وہیں کا ٹوٹا پھینکتی ہوئی بولی۔

"رحیم، جا لوہے کی زنجیر خرید لا۔"

اب دن بھر ڈبو میاں زنجیر سے بندھے رہتے۔ نوکر چاکر وہیں جا کر ڈال دے، کھانا پڑتا۔ دو ایک دن تو بڑی خاموشی سے گزارے پھر جو بھونکنا شروع کیا ہے تو زمین آسمان ہلا دیئے۔ رقیبہ تو مر بھی جاتی تو زنجیر نہ کھلواتی، مگر بھونکنے کی آواز سن سن کر اماں سوتے میں چونکنے اور ڈر ڈر کر چیخیں مارنے لگیں۔ ماں کا دل کیسے برداشت کرتا؟ ڈبو میاں پھر آزاد تھے۔

کسی چیز کو چین نہ رہا۔ کھانے کی چیزیں غائب، پہننے اوڑھنے کی چیزیں پھٹی پائی گئیں۔ کھلونے ادھر ادھر، ڈبو نے سارے گھر کا چین آرام تباہ برباد کر دیا۔

رقیبہ اتنے پر بھی سہن کر بیٹھی، مگر ایک دن تو ڈبو نے غضب ہی کر دیا۔ رقیبہ کسی کام سے ننھی کو اکیلا چھوڑ دالان میں آئی، واپس جو کمرے میں آئی تو کیا دیکھتی ہے کہ ڈبو پلنگ کے اندر ... بیٹھا منہ پر منہ رکھا ہوا تھا اور اپنے پنجے سے منی کے گالوں پر چپتیں لگا رہا تھا۔

"ڈبو!" رقیبہ پوری طاقت سے چلائی اور ڈبو تیزی سے کمرے

"ایسی بھی بے مروتی کوئی کیا کرتا ہے۔!" اور جا کر مہندی تلے بیٹھ گیا۔

رفیعہ کی تکتکی جو ٹوٹی تو اس کے منہ سے ایک سہمی ہوئی چیخ نکلی۔

"ہائے وہ کبھڑا آگیا۔"

"گھر کا چین بھی لٹ گیا"

منی کا بوٹن[1] کا رسم ہونیوالا تھا۔ میکے والے بھی آئے تھے اور سسرال والے بھی جمع تھے۔ رفیعہ کا رنگ اڑا اڑا تھا۔ اماں نے حیرت سے پوچھا۔

"کیا ہوا بی بی، ایسی باؤلی کیوں نظر آرہی ہے۔ گھر میں سب اچھے تو رہتے ہیں نا تیرے ساتھ۔؟"

رفیعہ نے کتے کی ساری واردات کہہ سنائی۔ سبھوں کے سامنے ذکر چل نکلا۔ اماں غصے سے بولنے لگیں۔

"نامرادے تجھی کیا تھا نہ پال۔ اب کو کھ میں درد پائی تو رہ بٹیا کو چپا کر نہ پھینک دے تو مجھے کہنا۔ پہلے تو اتنا منہ لگایا کہ اولاد کی طرح چاہا اور اب منہ پھیر دیا تو وہ کہاں برداشت کریگا۔"

رفیعہ نے کانپ کر کانوں پر ہاتھ رکھ لئے۔ "ہائے اماں ایسا نہ کہیئے، پھر میری زندگی میں کیا رہ جائے گا۔؟"

"میں تو کہتی ہوں کمیٹی والوں سے کہہ کر زہر کھلوا دو۔" ساس نے رائے دی۔

---

[1] احچہ نے بچہ کو پہلی بار اوپر کا دودھ چٹانے کو بوٹن کہتے ہیں۔

"اے بہن ایسا غضب بھی نہ کرنا کہیں۔" امالن نے کہا۔
"پلید روت یونہی منڈلا منڈلا کر گھر بھر کے تباہ کر دیگی۔"
"پھر اس کا کوئی حل بھی ہے۔؟" ہیبن میاں نے لمبی سی سانس لی۔
"بس ہے تو یہی کہ رفیعہ اسے ویسا ہی پیار کرے۔" امالن نے اپنے تجربے کی بات بتائی۔ "ہم بوڑھے ہوگئے، آنکھوں سے ایسی باتیں ہم نے دیکھی ہیں۔ حویلی والے اعظم میاں نے ایک ..." وہ اپنی یادداشت سے کوئی قصہ اکھیڑنے لگیں۔

مگر رفیعہ کے لیے یہ ناممکن تھا جس نے اس کی بچی کو مار ڈالنے کا تہیہ کر لیا ہو وہ پیار کیے جانے کا مستحق تھا۔ وہ جب دیکھتی کہ کیسے منی کو طمانچے لگا رہا تھا۔

"اب آخری حل یہی ہے کہ منی کی اچھی طرح حفاظت کرو۔ اسے اکیلا چھوڑ دو مت۔"

ڈبو کی دشمنی ہولی کی توں برقرار تھی۔ مگر اب زرتب یہ تھا کہ ایسا موقع نہ ملتا تھا۔ رفیعہ ہر دم بچی کے ساتھ رہتی گھومتی رہتی۔ اب بچی نے گھٹنوں گھٹنوں رینگنا شروع کر دیا تھا۔ سارا آنگن ایک کر ڈالتی۔ رفیعہ بھی اس کے ساتھ ساتھ کچھوے کی سی چال چلتی رہتی۔ کبھی منی سو جاتی تو رفیعہ اس کے جاگنے تک پالنے کے پاس بیٹھی رہتی۔

گرمیاں اپنے شباب پر تھیں جسم کی ٹنکیاں لگتیں پانی کا چھڑکاؤ ہوتا۔ بجلی کے پنکھے چلتے، ہاتھ کی پنکھیاں چلتیں۔ مگر گرمی جوں کی توں بحال۔ گرمی نے لوگوں کے حواس گم کر دیئے۔ سنی پانچ مہینے کی ننھی گول مٹول، گرمی نے اسے بھی مرجھا کے رکھ دیا۔

"اس دن رات کے کوئی سات آٹھ بجے تھے۔ دونوں میاں بی بی کمرے میں باتیں کرنے بیٹھے تھے منی پالنے میں مزے سے سو رہی تھی۔

"بہت سالی گرمی ہے!" معین میاں شرارت سے بولے۔ "کمرے میں تو سو بھی نہیں سکتے۔"

"آپ تو جب کرتے ہیں شرارت کی بات کرتے ہیں۔" رفیعہ شرما کر بولی۔

"ارے اس میں شرارت کی کیا بات ہوئی بھئی۔ دیکھئے آنگن میں سونا پڑتا ہے۔ ننھی بچی کا ساتھ اور ڈبو کم بخت کا ڈر۔ اگر کمرے میں سوتے رہتے تو کاہے کی فکر تھی۔؟" اور انہوں نے شرارت سے سگریٹ کا دھواں رفیعہ کے گالوں پر اور آنکھوں میں چھوڑ دیا۔

رفیعہ نے آنکھیں من منائیں اور لپک کر ان کے منہ سے سگریٹ کھینچ لیا۔ "توبہ ہے اگرمی تو غضب کی ہے اور سگریٹ دھونکے جا رہے ہیں۔ کلیجہ جل جائے گا۔ ابھی کیا گندی لت۔" اور اس نے جلتا ہوا سگریٹ دور اٹھا کر پھینک دیا۔

معین میاں ہنسے۔ "بھئی تم نے جو سگریٹ پھینک دیا تو اس کا کچھ دوسرا بدلہ بھی تو ملنا چاہیئے۔"

رفیعہ ناز سے بولی۔ "بس چپکے سے سو جائیے۔ بدلہ ودلہ کچھ بھی نہیں ملے گا۔"

معین میاں نے گردن اٹھا کر باہر کو جھانکا اور بولے! "ابھی تو باہر بستر بھی نہیں بچھے ہیں۔ کہاں سوئیں۔؟"

"یہیں سو جائیے نا۔"

"اتنی گرمی میں۔؟"

"ہونہہ، باہر تو جیسے برف پڑ رہی ہے نا- آپ لیٹیے۔ میں پنکھا جھلتی ہوں-"

معین میاں ناں ناں کرتے ہی رہے مگر رفیعہ نے انہیں پکڑ کر لٹا دیا۔ اور خود پائنتی بیٹھ کر پنکھا جھلنے لگی۔ معین میاں کی آنکھیں بند ہونے لگیں اور خود رفیعہ کو بھی اونگھ آ گئی-

ایک دم شور ہوا گرمی اور آنچ سے دونوں گھبرا کر اٹھ بیٹھے دونوں نے ہڑبڑا کر دیکھا۔ لال لال شعلے بلند ہو رہے تھے- خس کی ٹٹی پوری کی پوری جل رہی تھی۔ کھونٹیوں پر لٹکے کپڑے کتابوں سے اشکتے کرتے اور ایک ساڑی ادھر ادھر جل رہی تھیں۔ تیزی سے معین میاں نے رفیعہ کا ہاتھ پکڑا اور گھسیٹ لیا دم گھونٹ دینے والے دھوئیں میں رفیعہ نے ہاتھ چھڑانے کی کوشش کی "میری منی-!"

مگر معین میاں تب تک اسے گھسیٹ کر باہر لا چکے تھے۔ چیخ پکار سن کر سارا گھر باہر جمع ہو گیا۔ آنچ اونچی ہوتی جا رہی تھی- لال نیلے شعلے اوپر اور اوپر ہوتے جا رہے تھے-

"ہائے میری منی-! ہائے میری گڑیا-!" رفیعہ گلا پھاڑ کر چیخے جا رہی تھی-

ڈیوڑھی کا گھر دیکھتے دیکھتے آگ کا گھر بن گیا تھا۔ معین میاں بدحواس کھڑے لمبی لمبی سے اونچے شعلوں کو دیکھ رہے تھے اور رفیعہ اپنی سدھ بدھ بھول کر چیخے جا رہی تھی-

"ارے میری منی کو کوئی نکال لاؤ۔ ارے میری گڑیا کو کچھ بھی کرکے بچاؤ-"

اتنی سستی زندگی کس کی تھی جو جلتی آگ سے کود پڑتا۔؟ رفیعہ کو بد حواس دیکھ کر ڈبو کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ مارے خوشی کے تھوتھنی گول گھومنے لگا۔ اس نے بھانپ لیا کہ اور تو سب ہیں، بس منی نہیں ہے۔ رفیعہ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر وہ اچکنے پھدکنے لگا۔

رفیعہ کے چہرے پر لمبے لمبے آنسو بہہ رہے تھے۔ وہ چھاتی پیٹ کر بولی۔ "ہائے میری منی! میں تو تبھی لئے آتی تھی۔ مگر میرا ہاتھ پکڑ کر گھسیٹ لائے۔ ہائے۔!" وہ بلک بلک کر چھاتی پر دو ہتڑ مار رہی تھی۔ سب سن کھڑے تھے۔ آگ بلند ہوتی جا رہی تھی۔

"میں لاتی ہوں اپنی منی کو۔" وہ لپکی۔ مگر معین میاں نے اسے جکڑ رکھا تھا۔ اس نے خود کو چھڑانے کی کوشش کی مگر بیک وقت کئی ہاتھوں نے اسے جکڑ لیا۔ ساس چلائیں۔

"دلہن پاگل نہ بنو۔ پیٹ میں جو ننھا جی ہے اس کا تو خیال کرو۔ ایک کے پیچھے اسے بھی گنوا دو گی۔"

"مجھے چھوڑ دو، میں لاؤں گی اپنی بچی کو۔" وہ اچھل اچھل کر خود کو آزاد کروانے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

"پاگل نہ بنو رفی۔" معین میاں دکھ بھرے لہجے میں اسے سمجھاتے ہوئے بولے۔ "بچی کیا ہماری تمہاری جان سے بڑھ کر تھوڑی ہے۔ خدا کو یہی منظور تھا تو ہم کیا کر سکتے ہیں۔؟"

"نہیں نہیں، نہیں۔" وہ چیختی ہوئی بولی۔ "میں جاؤں گی۔ مجھے کوئی نہیں روک سکتا۔"

ڈبو خوشی سے گول گول گھوم رہا تھا۔ آج اس بے زبان کی ہائے

خدا نے سن لی تھی کہ رفیعہ کی مامتا یوں کلپ رہی تھی۔
"ارے مجھے چھوڑ دو۔ منی کے بغیر میری زندگی میں کیا رہ جائے گا۔ خدا کے لئے مجھے نہ روکو۔"
سائیں سائیں آنچ لپک رہی تھی اور رفیعہ بھیانک آواز سے چیخ رہی تھی۔ چیخے جا رہی تھی۔
"خدا کے لئے مجھے چھوڑ دو۔" وہ جلتے کمرے کی طرف لپک کر بولی۔ "مجھے چھوڑ دو، ورنہ میں مر جاؤں گی۔"
گول گول گھومتا۔ اچکتا ڈبو اک دم کھڑا ہو گیا۔
"ورنہ میں مر جاؤں گی۔! ورنہ میں مر جاؤں گی! ورنہ میں مر جاؤں گی۔"
آگ میں تیزی آ گئی تھی اور لال لال شعلے ہر سمت بڑھتے آ رہے تھے۔ اس نے ایک نظر دبی ہوئی رفیعہ پر ڈالی اور پھر اک دم دو تین چک پھیریاں کھا کر دم ہلاتا اندر کو بھاگ گیا۔ رفیعہ کے بین جاری تھے۔
اندر کمرے کی ایک کڑی دھڑ سے گری اور ادھر رفیعہ کا دم نکل گیا۔ اس کی سانس وہیں رک گئی۔ وہ دیدے پھاڑے کمرے کی طرف دیکھ رہی تھی کہ اک دم سیڑھیوں پر ڈبو نمودار ہوا۔ گدیلا اس نے منہ میں یوں پکڑ رکھا تھا۔ کہ ایک جھولی سی بن گئی تھی۔ وہ اپنی جان سے [illegible] جھولی کو گھسیٹتا ہوا تیزی سے سیڑھیوں سے اترا۔ اس نے ادھر ادھر کان پٹپٹا کر دھوئیں سے بچنے کی کوشش کی اور ایک جست لگا کر آنگن میں پہنچ گیا۔ اس کے جسم کے سارے بال جل گئے تھے۔ [illegible] نیچے لٹک آئے تھے۔ آنکھیں پچ پچا رہی تھیں۔ [illegible] جیسی بالوں کی دم اک دم ننگی ہو گئی تھی۔ جھولی میں سے باریک گھٹی گھٹی سی

چیخوں کی آواز آرہی تھی۔ اس نے ہانپتے ہوئے زور لگایا اور تیزی سے آگے بڑھ کر جھولی رفیعہ کے قدموں میں ڈال دی۔

زمین پر پڑتے ہی جھولی کھل گئی اور منی اٹھ بیٹھنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارنے لگی۔

ڈاپ نے چمکیلی آنکھوں سے مالکن کو دیکھا اور کان ہلاتا مہندی تلے جا کر بے دم سا ہو کر گر پڑا۔

⁂

آنکھ مچولی

"چنا۔!"

ماں اتنی زور سے چیخی کہ آنگن کے پیڑ پر بیٹھا کوا بھی پر پھڑپھڑا کر بھاگ کھڑا ہوا۔

"ہاں ماں۔" اب چنا بغیر رکے مشین کی طرح، جذبات سے خالی آواز میں کہے جا رہی تھی۔ "میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ میرے اور بھیا میں کسی بات پر نوک جھونک ہوئی اور پھر دونوں میں چل گئی۔ کبھی بھیا اٹھا کر پٹخنے۔ کبھی میرا بھیا کو دے مارنے۔ جانے کتنی دیر یہ دور یہی ہوتا رہا۔ میں نے گھبرا کر آنکھیں ہی بند کر لیں۔ ماں۔ مگر— جب آنکھیں کھولیں تو— تو—"

پہلی بار اس کی آواز کانپی اور وہ چیخ کر رو پڑی۔ "تو ماں میری ان نامراد آنکھوں نے دیکھا کہ بھیا تو زخموں سے چور چور تھا۔ ہائے میا۔ اسے میرے نے میری آنکھوں کے سامنے اٹھا کر بہتے پانی میں پھینکا۔"

ماں کے خیالات کی چکی گھر گھر چلنے لگی۔

عورت جب پہلے پہل ماں بنتی ہے تو آسمان کی ساری بلندیاں

اس کے قدموں میں سرنگوں ہو جاتی ہیں۔ نیلے نیلے آسمان سے جنت بیچھے اتر آتی ہے اور اس کے قدموں تلے بچھا دی جاتی ہے۔ شاداں کے قدموں تک پہنچتے پہنچتے ان بلندیوں نے کئی برس لگا دیئے۔

شاداں بیاہ کر سسرال آئی تو جس جس نے سب سے پہلے بھی دعا اس کے کانوں میں انڈیلی۔

" اللہ چاند سا پوت دے۔!"

" مولا جلد ہی گود بھر دے۔!"

اور تو اور جب رات ڈھلے شبیرے نے اس کا لال لال گھونگھٹ اٹھایا تو تھوڑی دیر کی کھسر پھسر کے بعد دھیرے سے یہی کہا۔

" اب جلد ہی باپ بنا دینا۔"

شاداں کا نازک سا دل ہل گیا۔ وہ اس چھوٹے سے گھر میں کتنوں کی مسرت کا سامان بن کر آئی تھی۔

"بیٹا — بیٹا — بیٹا۔" محلے ٹولے میں جدھر بھی جا نکلتی سب اس کو دیکھتے ہی چھیڑنے لگتے۔ شاداں ہنستی، شرماتی اور بھرے بھرے بدن کی لڑکیاں دوپہریوں کو خالی وقت میں بیٹھی ایک دوسرے سے ٹھٹھول کیا کرتیں، ہلکے پھلکے بدن والی شاداں کو دیکھ دیکھ کر بولتیں۔

" بی نبتو تمہاری بیل پہ ترائی کب کھلے گی۔؟"

شاداں گلابی پڑ جاتی۔

محلے والیاں ساس سے پوچھتیں۔

" اری جھنا ماں تیری بہو کو کچھ ہے۔؟"

ساس یونہی مایوسی سے سر ہلا دیتی۔

ایک دن محلے کی تجربہ کار جمو خالہ بولی۔ "اری بوا بہو کے ہاتھوں ترائی کا بیج کیوں نہیں بوا تی۔؟ مہینے [illegible] میں آپی پتہ چل جائیگا۔"
ساس کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ارے اس بات کا اسے خود کیوں نہ خیال آیا تھا۔
اس دن شاداں بھینس کا دودھ دوہتی بیٹھی تھی کہ ساس نے پکارا۔
"شادو، اری او شادو۔"
بھری گگری پہنچ کر شاداں کرتے کے دامن سے ہاتھ پونچھتی ہوئی آئی۔
"مجھے بلایا ماں۔؟"
"یہ لے ذرا بیج سامنے والے تھانولے میں تو ڈال دے۔"
"مگر اس موسم میں۔؟" شاداں حیرت سے بولی۔ "بیج جل کر نہ رہ جائے گا۔؟"
ساس ہنسی۔ "پھل پکنے والا ہو تو کڑے موسم میں بھی بیج نہیں جلتا۔ تو ڈال تو دے۔"
"پہلے بھینس کے سامنے سے بتولہ کی ٹوکری تو ہٹا لوں۔" وہ بیج کو پلو سے باندھتی ہوئی بولی۔
دن ادھر اُدھر ڈھل گیا مگر بنو کو یاد ہی نہ آئی کہ بیج بونا ہے۔
شبیر سے لوٹا تو ہنستے ہنستے بولا۔
"بیج زمین میں ڈال دیا تھا نا۔؟"
شاداں تنک کر بولی۔ "گھر بھرے کو بیج ہی کی پڑی ہے، کیا دھرا ہے اس بیج میں۔؟ یونہی ترائیاں کھانے کا ارمان آ رہا ہے تو نورن بوا کے ہاں سے ڈھیری بھر لا دوں۔؟"

شیرے نے اس کی کلائی پکڑ لی۔ "اری دِوانی، جتنے پھل بیل پہ آئیں گے اتنے ہی تیرے یاں بچے ہوں گے۔ ہاں ری جبرت سے کیا دیکھتی ہے۔؟ جو خالہ یونہی نئی بہوؤں کی کوکھ آزمانی ہے۔"

"ہائے مولیٰ۔!" شاداں چھاتی پر ہاتھ مار کر بولی۔ "تو کیا تم بھی یہی سمجھتے ہو کہ یہ سچ بات ہے۔؟"

"اور کیا! وہ جو کونے والے گھر میں مریم بوا رہتی ہے نا، اس کی گگانی بیل میں کبھی پھول کھلا نہ ترائی پکی۔ دیکھ لے اس کو ایک بھی بچہ نہ ہوا۔"

"ہٹو، کیسی باتیں کرتے ہو۔ ایسا بھی کہیں ہوا ہے بھلا۔! وہ تو بس اوپر والے کی دین ہے، خواہ مخواہ کے وہم ہیں سارے۔" اور مارے غصے کے شادو نے پلو سے بیج کھولا اور دور پھینک دیا۔

"اگر ایسی بات پر یقین نہیں آتا تو چل پیر جی کے مزار پر۔" وہ اس کا بازو گھسیٹ کر بولا۔

"وہاں جانے سے بھلا کیا ہوگا۔؟"

"مراد پوری ہوگی، اور کیا۔"

شاداں اس کے سامنے بیٹھتی ہوئی بولی۔

"ہاں جی، خدا بڑا ہے کہ تمہارا پیر۔؟"

شیرے سٹ پٹا کر بولا۔ "بڑی لمبی لمبی باتیں کر رہی ہے ری بھلا کون کافر بولے گا کہ پیر بڑا ہے۔؟"

"تو پھر جو بڑا ہے اسی سے کیوں نہ مانگیں۔؟" اس نے شیرے کا ہاتھ پکڑ کر اسے گھسیٹا اور خود بھی ہاتھ اٹھا کر بولی۔ "کہو، اے مولیٰ! ہمارے گھر ایسا کرڈہل، بہادر پوت بھیج کہ چلے تو زمین ہل جائے۔ بیٹھے تو

چار پائی ٹوٹ جائے اور ایسی بیٹی دے کہ گھر بھر میں اجالا ہو جائے۔"
شبیرے نے اس کی کہی بات دہرائی ہی تھی کہ ادھر سے ساس آگئی۔
"ہاں ہاں، موئے لکھے مانگ بیٹی کی ہی دعا۔ کولہے سے بٹھا کر رکھے گا کیا۔ بیٹی لے کر کیا کریگا۔ ابھی آئی ابھی چلی۔"
شبیرے نے جھینپ کر بولا۔ "ماں بیٹے کی دعا بھی تو مانگی ہے۔ تو نے سنا نہ ہوگا۔"
بڑھیا نے نفرت سے ہونٹ سکوڑے۔ "بیٹی، ہونہہ، بیٹی! بڑا پہاڑ لڑا دھ کائے گی بیٹی! میں نے تو پانچ بیٹوں کی نیاز منت مان رکھی ہے۔ ہاں۔!" اور وہ شادو پر ایک گہری نظر ڈالتی ہوئی چلی گئی۔
چھ سال کی مدت کچھ یونہی معمولی سی مدت تو ہوتی نہیں۔ شبیرے اور رشیدے کی شادیاں ساتھ ہی ساتھ ہوئی تھیں۔ بعد بارش ہوئی تھیں اور رشیدے کی بیوی مسلسل بیٹے جنتے جنتے ایسے تنگ آگئی تھی کہ بچے کے ذکر ہی سے بھاگ اٹھتی۔ ادھر گھر کا کام کرتے کرتے شادو کے کومل گلابی ہاتھ سخت اور کھردرے ہو چلے۔ ان ہاتھوں سے اس نے ہر ہر کام کر لیا۔ نہ کیا تو بچے کا پنگوڑا ہلانے کا زندگی بخش کام۔
ساس نے کھلم کھلا چار عورتوں میں بیٹھ کر کہنا شروع کر دیا۔
"میں تو تبھی کہتی تھی کہ کھوڑ جسم کی ہے۔ کیا بچے جنے گی۔ مگر جب سے وہ مونڈی کاٹا اس کی کون ادا پر ریجھا۔"
"اچھا۔!" کوئی بنا دٹی حیرت سے پوچھ ہی لیتی۔ "تو شبیرے نے اپنی پسند سے بیٹی اٹھائی۔"
اب بات گزر گئی تھی۔ چھپا کر کیا لینا تھا۔ ساس ڈنکے کی چوٹ پر کہتی۔

"پھر کیا، بیاہ نہ لاتی تو مر ہی جانا۔ جب دیکھو تب گچھا اڑے سے سنہری پھولوں کا گچھا لوٹ آکے چلا شادو کی طرف۔ پھول نہیں تو کبھی پوپو سیٹی۔ کبھی ملیدہ۔ کبھی ایک کبھی! ڈھمک۔" سارے چھپے ڈھکے راز ساس یوں مزے مزے سے کھول رہی تھی۔

"سنہری پھول۔؟ وہ کیوں۔؟"

اب ساس کو غصہ آجاتا۔ "اے نو کیا بھولی بنتی ہو۔ کبھی تمہارے دھگڑے خالی ہاتھ تم سے ملنے آئے تھے۔؟ خالی ہاتھ جائیں تو پریتم پیارے کیسے کہلائیں۔؟ پھول تو ہونے ہی چاہئیں۔" جانے وہ کدھر کھو جاتی، اس کے جھری دار چہرے میں سنہری سنہری آگ جھلملا اٹھتی۔ "بھلا سنہری پھولوں کا مطلب کون نہیں سمجھتا۔؟ ہر گھر پیچھے تو سنہری پھولوں کا واسطہ دے دے کر کہتی ہیں۔ مولیٰ کرے ہمارے پیار کی آگ کبھی یونہی جلتی رہے۔!"

چکی گھمانے گھمانے شاداں بہت، بہت پیچھے پہنچ جاتی۔ آم کے نیلے کھرڑے کھرڑے پیر شل ہو گئے ہیں۔ سیرا ہے کہ آ ہی نہیں چکتا۔ اے لو! پیلے پیلے پنچے کھڑکھڑائے۔ یہ کبھاری بھاری قدموں کی چاپ کیسی ہے۔؟ ہائے میں یہ کیسے پھولوں میں نہائی جا رہی ہوں۔

"ہوں۔ تو اتنی دیر کر دی۔"

"ماں جو برآمدے میں چاول کر ڈھڑیاں ڈالتی بیٹھی تو اٹھنے کا نام ہی نہ لے۔ بھلا کیسے آتا۔؟ مگر سچ بول، میرے لئے گھڑیاں گننا کبھی تجھے بھلا لگتا ہے نا۔؟ بول۔؟"

یہ انتظار کیا جان لیوا۔ پھر بھی کتنا میٹھا۔ کیا مسرت بخش ہوتا ہے۔

آنکھ مچولی

چکی کا ہتّھا آہستہ ہونا۔ اور آہستہ۔ اور آہستہ، اور پھر رک جانا۔ اور صرف ایک یاد شاداں کے ذہن میں باقی رہ جاتی۔
"اگر مولیٰ مجھے اولاد بھی دے دیتا تو ہمارے پیار میں کون کمی رہ جاتی۔"
"بہو۔ اناج پس گیا۔ ؟" ساس کی آواز سن کر وہ پھر گھمر گھمر چکی چلانا شروع کر دیتی۔
شاداں آگے ہی دھان پان تھی۔ سسرال کی رد ٹی بہوؤں کے انگ یوں لگ جاتی ہے کہ دلہن کا پیار جی کو لگا رہتا ہے۔ گھی سے تر تر اتی چھ روٹیاں اتنا خون نہیں بڑھاتیں جتنا محبت اور پیار میں ڈوبا ہوا ایک لفظ۔ تبھی تو سسرال سے لوٹتی ہیں تو چہرہ پونم کا چاند بن بن کر جگمگاتا ہے مگر شاداں تو جوں کی توں ہی رہی۔ آتے ہی اس کے دل کو بچے کی وہ لگ لگاہٹ رہی کہ اپنا آپا بھول گئی۔ جسے دیکھو وہی یہ بات سناتا۔
اور اب چھ برس کی مدت سے مستقل کڑھن نے تو رہی سہی رونق بھی چھین لی۔ گال کہاں تو ایسے چمکیلے اور روشن روشن جیسے سنہری پھول پھلواڑے کے پردے پر نہیں ان کے گالوں پر ہی کھل اٹھے ہوں اور اب بڑی بڑی نکھرتی آنکھوں کے نیچے ایسی سیاہیاں جیسے رونے میں کاجل پھیل کر آنکھوں سے نیچے اتر گیا ہو۔ سہاگ رات کے بعد پھر کبھی شبیرے نے ایسی لگن سے بچے کا نہ کہا۔ مگر یہ شاداں کا دل تھا کہ آپ ہی آپ اس کی چاہت کئے جاتا۔ اتنا تو دیکھتی سمجھتی تھی کہ بچے کی ماں بن کر سسرالیوں میں محبت اور عزت دگنی ہو جاتی ہے۔ شبیرے کو دیکھ کر اس کا جی چاہتا کہ وہ جب کبھی باہر سے تھکا تھکا۔ پسینے میں ڈوبا گھر آئے تو کوئی اس کے قدموں میں لپک پڑے۔

"ہابا ! بابا - !"
وہ ہنس کر اسے اٹھالے اور اس کے پاس لے آئے - شرارت سے بولے -
"کیوں ری - ! میرے بچے کو پیٹ بھر دودھ بھی نہیں پلاتی - ؟"
"واہ ! بڑے آئے تشکا بتا لے کر - تمہیں کیا خبر - ؟"
"پھر دیکھ یہ میرا کرنا کیوں چوس رہا ہے، یہاں سے - !" اور سوچ سوچ کر شاداں کلپ کلپ اٹھتی -
پھر جیسے شاداں نے حالات سے سمجھوتا کر لیا - کام میں یوں مگن رہتی جیسے خود کو بھول جائے گی - سبھرا آنا اور یونہی کمرے میں آ جانا ہنس کر بولتا -
"بڑی تھکن ہو رہی ہے شادو، قسم مولیٰ کی - ہاں -"
"چائے بنا کر لادوں - ؟" وہ اٹھتے ہوئے بولتی -
"اری پاگل ہے تو بھی - میں چائے پانی کو کب پوچھتا ہوں بھلا -"
اور وہ ایسی شریر ہنسی ہنستا کہ شاداں شرم سے دوہری ہو جاتی -
"یہ اب تک مجھے کتنا پیار کرتا ہے - ؟ کوئی سری کا ہوتا تو مزے دوسری لے آتا -"
ایسے ہی ایک دن سنہری پھولوں کو جھومتا دیکھ کر اس کا دل دکھ گیا - اس لئے وہیں کھڑے کھڑے اوپر والے سے دعا مانگی -
"تو سب دیکھتا ہے - تجھ سے کیا چھپا ہے - مجھے کچھ نہیں چاہیئے - میں کچھ نہ مانگوں گی - بس اتنا چاہتی ہوں کہ میرے پیار کی سنہری آگ یونہی جلتی رہے -"

شبیرے نے اپنا پھٹا ہوا کرتا جسم سے اتارا اور شاداں کی طرف پھینکتا ہوا بولا۔

"اری شادو، وہ لکڑی کاٹنے والا شامو دادا ہے نا، اس کا کرتا بالکل پھٹ گیا ہے۔ مجھ سے مانگ رہا تھا۔ یہ اسے دیدینا۔"

شاداں نے ہنسی، خوشی، ناز اور شرم سے اس کی طرف دیکھا اور کرتے کو سنبھالتی ہوئی بولی۔

بس بہت خیرات کر چکے، آگے کام آئیں گے پھٹے کپڑے۔"

"کیا مطلب۔؟" شبیرا حیرت سے بولا۔ "پھٹے کپڑے بھلا کس کام آسکتے ہیں ری۔؟"

"تم تو بالکل ہی ویسے ہو۔ آج کل کے تو کنوارے لڑکے بھی ایسی ویسی باتیں سمجھ جاتے ہیں اور تمہاری شادی کو چھ برس ہو گئے پھر بھی بچوں کی سی بات کرتے ہو۔!"

"مولی قسم میں سمجھا ہی نہیں تو کیا کہہ رہی ہے۔!"

شاداں ہنس کر جھکی اور بولی۔ "کان میں کہنے کی بات ہے۔ ہاں۔!"

اس کے گرم گرم سانسوں میں ڈوبے چند الفاظ شبیرے کے کانوں میں پڑے ہی تھے کہ وہ اچھل پڑا۔ اک دم اس نے شادو کو دونوں ہاتھوں پر اٹھا لیا اور نیچے اوپر گھمانے لگا۔ شرارت سے اس کے منہ پر گال رکھ رکھ کر بولا۔

"ہاں۔! بالکل میٹھا ہے۔"

ساس مرغیاں ہنکا لتی ادھر سے گذری تو بہو بیٹے کو دیکھا۔ جان بوجھ کر دونوں کو نظر انداز کرتی وہ آنگن میں اتر گئی۔

اور جب اس دن رنگ بھری دوپہری کو سب محلے والیاں باتیں ٹھنڈگاری بیٹھی تھیں۔ پاندان کھلا تھا۔ سہاگ راتوں کی، میاؤں کی ان کے بیہودہ انداز سے پیار کر لے کی باتیں ہو رہی تھیں تو سہجینہ کی طرح شادان کا منہ اترا ہوا نہ تھا۔ بیبن بوا نے پاندان اس کی طرف کھسکا کر کہا۔

"شادان، سب کے ہونٹ لال ہیں، تو کیوں سوکھا منہ لئے بیٹھی ہے"
شادان نے منہ پھیر لیا۔ "بوا پان کے نام سے تو ابکائی پہ ابکائی چلی آتی ہے۔"

سب نے ایک دوسری کو دیکھا اور اک دم شادان کی جان پر ٹوٹ پڑیں۔

"اری کیا۔؟"
"اری کیسے۔؟"
"اری کتنے دن ہوئے۔؟"
"اری زچگی کون سے ماہ پڑ رہی ہے۔؟"

اور سارے گاؤں میں پھیل گئی کہ جھنامان کی بہو کے ہاں بچہ ہونے والا ہے۔

اب رات کو جو کوئی پاس پاس لیٹتے تو شادان ہنس کر دور کھسک جاتی۔

"کبھی دور ہٹو۔"
"واہ، یہ ظلم کیوں۔؟"
"سکینہ بوا بولتی تھی ـــــ" اور وہ ہنس کر گنگنا نے لگتی جب بات

پوری کر جاتی۔

" سکینہ بوا کی ایسی تیسی۔ وہ رہے اپنے میاں سے دور۔ "

شیرا صاف ڈھٹائی پر تل جاتا۔

اک دم شاداں خاص اداؤں کے سے انداز سے کروٹ پلٹ کر پوچھتی۔

" ایک بات پوچھوں ۔ ؟"

شیرا پورا کان بن جاتا مگر وہ کھسیائے جاتی۔ شرمائے جاتی۔

" ہائے ! میں نہ پوچھونگی۔ شرم لگتی ہے۔ "

" اچھا اچھا۔ سمجھ گیا، تیرا مطلب جان گیا۔ بدمعاش کدھر کی۔"

" کیا بدماشی کی میں نے۔ ؟ " وہ ہنس کر بولی۔

" اب تو یوں شوشہ چھوڑ جائے گی تو ظاہر ہے میں خوشامد کرنے کرنے تیرے گدگدی شروع کر دوں گا اور ـــ اور ۔ ہاں۔ "

" بس بس ، اسی دھوکے میں نہ رہنا۔ "

" اچھا یہ بات ۔ ؟ "

" ہاں اور کیا۔ اب تمہاری پروا کسے ہے۔ ؟ "

ہنس کر شیرا اسے پکڑ لیتا اور دنیا بھر کے عام باپوں کے لہجہ میں پوچھتا۔

" بٹیا کہ بیٹا ۔ ؟ "

" جو بھی ہو جائے ۔ "

" ہاں ، جو بھی ہو جائے ۔ ہمیں تو بس اولاد چاہیئے ۔ "

مگر سدا من کو صرف اولاد ہی نہیں بلکہ بٹیا چاہیئے تھا۔ مارے خوشی

کے اس نے آئے گئے سے کہہ کہہ کر منہ سکھالیا۔ "بہو کو بیٹا ہونے والا ہے اری سننی ہو سکو لیوا، میری بہو پوت جنے گی۔"

بجو خالہ نے لاکھ بار منع کیا کہ یوں سارے میں بات پھیلایا نہیں کرتے، لوگ جادو منتر کر دیتے ہیں۔ مگر ساس کی خوشی تو وہ سورج تھی کہ نہ یا دل دبکے نہ بدلی۔ چھلکے جاتا ہے۔ اتنی خوشی کی بات چھپائی بھی کیسے جائے۔

بازو کے گھر والی حسینہ خالہ جب سے حج کر آئی تھیں حاجن اماں کہلاتی تھیں اور جھوچھا بھی کرتیں۔ کالی دھاریوں والی کاسنی چادر جو گاؤں کے منگل ہاٹ میں ڈیڑھ ڈیڑھ روپے کو ملتی تھی۔ اوڑھ کر وہ ہر گھر میں جاتیں اور اپنی دعائیں مفت بانٹا کرتیں۔ شاداں پر ان کی خاص نظر عنایت تھی۔ جھنا ماں کو مخاطب کر کے بولتیں۔

"جھنا بہو سے کہہ وہ دن گئے جب منوں وزن اٹھا لیا کرتی تھی۔ اب بوجھے اٹھانا چھوڑ دے۔"

شاداں کو پاس بٹھا کر ہر وہ بات پوچھ ڈالتیں کہ کبھی شیرے نے بھی ایسی باتیں نہ پوچھی ہوں گی۔ شاداں ہنسی روکتے روکتے لال لال ہو جاتی اور پھر رات کو شیرے سے بولتی۔

حاجن اماں پوچھتی تھیں تیرا بچہ گول گول گھومتا ہے کہ نہیں۔"
شیرے کی حیرت دوچند ہو جاتی۔

"ہائیں۔! اتنے سے پیٹ میں بھلا بچہ کیسے گھوم سکتا ہے۔ کیا سچ ایسا ہی ہوتا ہے۔؟" اور دونوں حیرت سے سوچتے سوچتے سو جاتے۔

کہاں تو شاداں بڑے بڑے بوجھ، من من بھر کے جوار کے تھیلے اٹھا کر پھینک دیتی اور ہانپتی تک نہ تھی، اور اب اتنے ذرا سے

پیٹ کے بوجھ کو سنبھالتے سنبھالتے اس کی جان پر آ بنی تھی۔ شاداں کا وہ ہلکا پھلکا۔ دھان پان سا جسم اب نئی نئی مونگ پھلی کی طرح بھر گیا تھا۔ اور کولہوں کے پاس بوٹی بوٹی گوشت کے جیسے تھے وہ آپ ہی آپ بھڑکتے تھے۔ بازو بیزار اور گالوں میں سنہرے پھول چھٹکنے لگے تھے۔ اور پھر اس کے علاوہ پیٹ خوب اونچا اونچا ہو گیا تھا اور پھر اس سے بڑھ کر فتیرے کو شاداں کے چھیڑنے کا ایک بہانہ ہاتھ آ گیا تھا۔ اندھیرے اجالے وہ اسے کہیں نہ کہیں ماں کی آنکھ بچا کر پکڑ لیتا اور ہنسی ہنسی بولتا۔

"بول رے بات پھولی کیوں جا رہی ہے۔ ؟ شاباں تو دیکھ ذرا! ابھی ابھی تک تو دھان پان تھی۔"

شاداں شرما کر دونوں ہاتھوں سے اپنا دوپٹہ پورے جسم کے گرد لپیٹ لیتی۔

"تم کھانا نہیں کھاتے کیا۔ ؟"

"کھاتا تو ہوں، پھر۔ ؟"

"تو بس آنے والے کا رزق بھی اللہ نے اتار دیا ہے۔"

اتنے دنوں کے بعد آج بشیرے کی سمجھ میں آیا کہ شاداں کیوں اتنے دنوں سے پیٹ کپڑے جمع کر رہی تھی۔ ماں نے کھلے کھلے لفظوں میں بغیر کسی شرم کے ساری بات کھول کے رکھ دی اور آنگن میں کھڑا اراموردا اکیلا تو الجھ رہا تھا یا اب خوش ہو کر بولا۔

"واہ ری جیت لوا۔! بہو کا پیٹ اتنا پھر اونچا نکل آیا اور مجھے کبھی ہی نہیں۔ اچھا اب پرانے کپڑے کر کیا جا تولہ ؟ جنا کی پر اب تو نیا کرتا ہی دوں گا۔"

سانس بھرنے لگی۔ "اب ڈریں گے، دیکھنا ضرور ڈریں گے۔"
شاداں کی چھاتی اب ہمیشہ جلتی رہتی۔ بشیرا اٹھتے آتے گھنٹے سے
پھلٹ آتا۔ اپنے ہاتھ ہی پاس بلاتا۔ جس چیز کی شاداں چاہت کرتی دیکھا
کھانے پینے چل جاتا، چاہے شہر سے کیوں نہ لانی پڑتی۔ مگر چھاتی کی جلن
جوں کی توں برقرار تھی۔
حاجن اماں نے سنا تو بولیں۔ "ووئی ایسی جلن جھلا تو ڈر سے
بیٹے سے کہاں ہائے بیٹی پیدا ہوگی، دیکھ لینا، اسی کی جلن ہے ساری۔"
"تو بیٹے سے چھاتی کی جلن کا کیا تعلق بھلا۔؟"
"ارے بیٹی کے سر پہ جھنڈولے لیے بال رہتے ہیں کہ نہیں۔ وہی ماں
کی چھاتی پہ چلتے رہتے ہیں۔"
شاداں نے ہنس کر بشیرے کے تصور میں چھوٹی سی شاداں ابھر آئی
گدی گوری سی چھوٹے چھوٹے ہاتھوں پیروں والی، سر پہ ابھار مارتے ہوئے
گھونگھریالے بال اور ہونٹ، عین بین شاداں کے ہونٹ دیکھ لو۔ اس نے
بچی کے خیال میں سامنے بیٹھی شاداں کے ہونٹوں پہ اپنی انگلیاں رکھ دیں۔
شاداں جھلا کر بولی۔
"ہائے، کچھ شرم ہے کہ نہیں۔؟"
بشیرے تو لوہی کھویا ہوا تھا۔ اسی بے خیالی سے بولا۔
"ارے واہ! شرم کیسی؟ اپنی بچی کو پیار بھی نہ کروں۔؟"
شاداں دوہری ہو گئی۔ "ہائے میرے مولا ... ..."
نیند میں شاداں ایسے زور سے چلائی کہ بشیرے کی آنکھ جھٹ سے کھل گئی۔
'موری، مری'، کے علاوہ وہ کچھ کہتی ہی نہ تھی۔ بشیرے کا سر لپک نیچے گرا۔

دیا تھا۔ "ارے کیا ہوا۔ کاہے سے مری۔" مگر وہ تو یونہی رٹ لگائے تھی۔

"ہائے مری۔ مولیٰ تیری دہائی۔ ہائے، ہائے۔"

شبیرے کو اور تو کچھ سوجھا نہیں، جھٹ سے کنڈی کھول کر آنگن میں لپکا اور جھنجوڑ کر بولا۔

"ماں ماں، شاداں مر رہی ہے۔"

ماں گھبرا کر اٹھ بیٹھی اور دوسرے ہی لمحے کمرے کو لپکی۔ تھوڑی دیر میں باہر نکلی آئی اور غصے سے بولی۔

"پاگل کہیں کا۔ کہیں سونے سے اٹھ کر یوں کہا کرتے ہیں کہ شاداں مر رہی ہے۔" پھر ہنس کر بولی۔ "ارے گدھے شاداں مر نہیں رہی جی رہی ہے۔"

شبیرا اچھل کر بولا۔ "ماں تیرا مطلب ہے اسے بچہ ہو رہا ہے۔"

"چل ہٹ، بے شرم۔ شرم نہیں آتی ماں سے ایسی باتیں پوچھتے۔"

گاؤں میں کوئی تنہا نہیں ہوتا۔ ایک کے دکھ پر ساری آنکھیں نم ہو جاتی ہیں اور ایک کی خوشی ساروں کے ہونٹوں پر ہنسی بکھیر دیتی ہے۔

شاداں کی چیخیں ادھر گھر میں گونجیں نہیں کہ ادھر ادھر سے عورتیں جھانکنے لگیں۔ کسی نے دائی کو بھی بلا لیا۔ یوں ماں خود کیا کسی دائی سے کم تھی۔

شبیرے کو اس لیے تو بڑا غصہ آیا کہ جب دروازے بند کر کے اسے کمرے سے باہر نکال دیا گیا۔ اب بند کمرے سے دبی دبی چیخیں باہر آ رہی تھیں۔ جو اندر یقیناً بے حد تیز ہوں گی۔ شاداں درد کی شدت میں کراہ

کراہ کر چلا رہی تھی۔

"ہائے مری۔ او شبیرے مری۔"

شبیرا پہلے تو چپکا کھڑا سنتا رہا۔ پھر دروازے پر شہو کا دیکھ بولا۔

"ماں! شادان مجھے کیوں پکار رہی ہے۔؟"

کوئی جواب نہ ملا۔ شبیرا بے قراری سے بولا۔

"ماں! شادان مجھے کیوں پکار رہی ہے۔؟"

"ہاں ہاں، وہ تیرے ہاتھوں صفائی کرانا چاہتی ہے۔ اس لئے پکار رہی ہے۔"

ماں کی غصہ بھری آواز آئی۔

شبیرے وہیں بت بنا کھڑا رہا۔ یقیناً شادان بہت بڑی مصیبت میں مبتلا تھی، تبھی تو اتنا چلا رہی تھی۔ ورنہ ایسے ویسے درد کو تو وہ یوں ہنس کر ٹال جاتی تھی۔

ایک بار بھینس نے سینگ مار دیا، اس کا بال بھی بیکا نہ ہوا۔ جوار کے کھیت سمیت ایک بار اوندھے منہ گر پڑی مگر اف نہ کی۔ یونہی ایک بار بڑے سے تیتر کے وزن سے بری طرح جھونک کھا گئی مگر ہنستی ہی رہی پھر اب۔؟"

"او شبیرے۔ ہا۔ مر گئی۔"

چلاتے چلاتے اس نے "او، او" کر کے ابکائیاں لینی شروع کر دیں۔

"ارے پریم دوانی" ساس جھلا کر بولی "یوں اللہ سانس تو نہ کھینچ۔ بچہ اوپر چڑھ جائے گا۔ تو جلدی نہ اترے گا۔ نیچے زور ڈال۔"

شادان نے ہونٹوں پہ دانت گاڑ کر پوری طاقت نیچے کی طرف

پھینکنی شروع کر دی۔

صبح کا اجالا نمودار ہو رہا تھا۔ دور سے مؤذن کی آواز آئی اور مطلبی شیرا جھٹ پانی کے چھپکے منہ پہ مار نماز کو کھڑا ہو گیا۔ اُدھر صبح کا سورج چمکا اور اِدھر شاداں کی چیخوں میں کمی ہو گئی۔

پھر تھوڑی دیر یونہی خاموشی رہی اور اس ایک لمحے کی خاموشی میں شیرا کئی بار مرا اور کئی بار زندہ ہوا۔ پھر اک دم سے "چیاں۔ چیوں" کی میٹھی میٹھی آواز باپ کے کانوں سے جا ٹکرائی۔

"اری واہ ری شادو، واہ!" وہ کھڑے کھڑے ہی چلایا

"اللہ تجھے اچھا رکھے، ماں کو آج دادی بنا دیا۔"

تھوڑی دیر بعد دروازہ کھلا، شیرا شریف بن کر دور جا کھڑا ہوا تھا بھلا ماں کے سامنے کیسے بیوی کے پاس جائے۔؟

"تو آنول رومیں میں گاڑ دے، تب تک میں بھینس دوہ کر بچے کے لئے تازہ دودھ لے آؤں۔" ماں دائی سے مخاطب تھی۔ اس کے ٹھنڈے سبھاؤ سے شیرا سمجھ گیا کہ شیرے نے منہیں ننھی شاداں نے جنم لیا ہے مگر اس کے دل میں تو خوشی کے چاند چمک رہے تھے۔ ماں تھال پہ گئی کوی جھٹ دو چھتی پہ پڑی کالی دھاریوں والی سوسنی چادر اوڑھ شاداں کے پاس جا بیٹھا۔

شاداں ہنس کر بولی۔

"یہ عورتوں کی طرح چادر کیوں اوڑھ رکھی ہے۔؟"

"ماں پیچھے سے آکر دیکھے گی تو سمجھے گی کہ حاجن اماں ہے۔ ورنہ مجھے تو مار ہی ڈالے۔"

کھن کھناتی ہنسی ہنس کر شادان پڑھی لکھی عورتوں کی طرح سے بولی۔

"مولوی جی کہتے ہیں ماں کے قدموں تلے جنت ہوتی ہے۔ شیرے آج میرے قدموں بھی آسمان سے چاند اتر کر آبیٹھا ہے۔" اس نے ناز اور غرور سے اپنی پائینتی دیکھا، جہاں ننھی سی گٹھڑی پڑی تھی۔

شیرے نے آگے بڑھ کر اسے ذرا ڈر ڈر کر دور دور سے چھوا۔

"ہائے رے۔ کیسی نکی نکی سی ہے۔ نرم نرم ہے۔ یہ۔ یہ۔" پھر ہنس کر بولا۔ "تیرے جیسی ہی ہے ری شادان۔"

شادان کے منہ پر خوشی ہی خوشی تھی۔

"مجھے تو مولی قسم بیٹا بھی ہوتا تو اتنی خوشی نہ ہوتی۔" شیرے کی باتیں ختم ہونے میں نہ آرہی تھیں۔ "تجھے خوشی نہیں ہوئی کیا۔؟" وہ احمقوں کی طرح بولا۔

شادان کو ساس کا رونا یاد آگیا، الجھ کر بولی۔

"کیوں۔؟ اسے نو مہینے پیٹ میں نہیں رکھا کیا۔؟ اس کے پیدا ہوتے درد نہیں لگے کیا۔؟ سر سے پاؤں تک پسینے کے ریلے بہہ بہہ گئے، تب باہر آئی۔ ایسی کیا اوپر کی آئی ہے کہ خوشی نہ ہوتی۔؟"

"ماں بنتے ہی تجھے اتنی ساری باتیں کہاں سے کرنی آگئیں۔ جیسے بڑی تجربہ کار ہو گئی۔ ابھی اتنی ذرا سی تو ہے۔!"

شادان ہنس دی۔ اب کے سے اس کی ہنسی میں تھوڑا سا غم بھی تھا۔

"خوشی کیسے نہ ہوتی شیرے۔؟ مگر میں نے آج پھرا پنے مولا سے

ایک بار وہیں دعا مانگی ہے کہ میرے پیار کی آگ کو جلتا رکھیو۔"

شبیر نے حیرت سے اس کو دیکھا تو بولی۔

"ہاں شبیر ہے عورت کو سب کی خوشی کا خیال رکھنا ہے۔ ہم تم خوش ہو لیں تو کیا ہے۔ وہاں کا بھی حق ہے، اس دل کی بھی آرزو ہے۔"

اں دودھ کا کٹورا لیے آئی تو ساجن اماں کو بیٹھا دیکھ کر خوشی سے بولی۔

"دیکھو۔ بوا، اللہ نے فضل کیا ہے۔ راتوں رات درد اٹھے اور بھر ہونے .....!" شاداں کی سہمتی صورت دیکھ کر ماں نے کالی دعا پڑھی والی سہمتی چادر کو غور سے دیکھا بھلا ساجن اماں اتنی آڑی چپڑی کب ہے۔ اس نے آگے جھک کر چادر پر ہاتھ پھیرا۔ کھینچ سینکی۔ "ارے کم بخت ہوئے جو دو کے غلام، شرم تو نہیں آئی ذرا سی . . ."

سانس کی نالی ہونٹوں پر بھی لا کر نا قابل اعتبار تھی مگر شاداں کیلئے اس کا کیا رتبہ تھا کہ کوئی شاداں کے دل سے ہی پوچھتا۔ اس کے ننھے منے ریچھ جیسے اسے ایک ماں کا درجہ دے رہا تھا۔ وہ اور شبیر اس کر دونوں غور کرتے، سوچتے رہے کہ اس بیٹا کو کیا نام دیں؟ جس نے ان کی زندگیوں میں چھپے پھول کھلا دیے تھے، آنگن کو بھر دیے تھے۔ رنگ بھر دیے تھے، خوشبوئیں بھر دی تھیں۔ بڑے سوچ بچار کے بعد دونوں نے مل کر بچی کا نام چاندنی رکھا۔ کوئی چاند کہتا۔ کوئی چندا۔ کوئی چندر وا اور گھر کے بگڑتے وہ چنا مانی پڑ گیا۔

چنا ابھی گھٹنوں گھٹنوں ہی رینگتی بھی نہ تھی کہ ایک دن پھر شاداں شبیر کو پیچھے کپڑے سے سلتی نظر آگئی۔

شبیرا کرتا پہنتے پہنتے رک گیا۔ "ارے اتنی جلد! پھر سے وہی بات"

وہ کِھل کِھلا کر ہنسنے لگا۔ "اری، او ری شاداں بی بی، ہولا تجھے اچھا رکھے! تو تو میرا گھر بھرنے پر تل گئی ہے۔"

ممتا کے تسکین دہ احساس اور خوشی نے اس کے سینے میں ابھری ابھار دیا اور چھل چھل دودھ اس کے کرتے کے اوپر سے بہنے لگا

اس رات بالکل پچھلے سال کی سی واردات ہوئی۔ شاداں سوتے سے چونک کر اٹھی، مگر اب اس کی تڑپ میں وہ الھڑپن اور ناتجربہ کاری نہ تھی۔ کراہتے ہوئے بولی۔

"مجھے جنائی کے درد لگ رہے ہیں۔" پاس ٹری بچی کو باپ کی گود میں دیکھ بولی۔ "اسے باہر لے جاؤ، مجھے چیختے چلاتا دیکھ کر سہم جائے گی۔"

شیرے نے بڑی عزت، محبت، عقیدت اور کچھ کچھ عبادت کرنے کے سے انداز سے شاداں کی طرف دیکھا، جو ایک بار ماں بننے میں اتنی تکلیفیں اٹھا چکی تھی اور اب دوبارہ اس زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہوتے ہوئے بھی کس قدر پرسکون تھی۔

سب کچھ پہلے جیسا ہی ہو رہا تھا۔ مگر ہر بات میں ایک اطمینان اور سنجیدگی چھائی ہوئی تھی۔ عورت چاہے تو اپنی جان دے دے، اپنا ہر احساس قربان کر دے، مگر اس ایک نام کو جو جیون مرن کا سنگی ساتھی ہوتا ہے، کڑے سے کڑے دکھ میں بھی نہیں بھولتی۔ اب شاداں کا وہ الھڑپن اندر پہنچا پھوٹ آیا تھا اور وہ تڑپ تڑپ کر پکار رہی تھی۔

"شیرے۔ شیرے۔ مر گئی ۔۔۔ ہائے۔ آہ۔"

شیرا باہر کھڑا ہوا بید کی طرح کانپ رہا تھا۔ کانپے جا رہا تھا۔ اس کے

ادھر اُدھر شاداں نے چیخیں، شیرا نے سب کچھ تبا دیا تھا کہ رات اس پر کیا کیا بیت گئی تھی۔ "آج وہ پھر اسی راستے سے گزر رہی ہے۔"
چیخیں رکیں۔ رات کے سناٹے میں اور اضافہ ہو گیا۔ کوئی شیرے کے کان کے پاس سرگوشی کرتا گزر گیا۔
"میرے مولا! اب کی بار مجھے چاند کی صورت دکھا تاکہ اس کی وجہ سے سارے میں اجالا ہی اجالا پھیل جائے۔" یہ یقیناً شاداں کی آواز تھی جو کراہنے کراہتے بھی دعا مانگے جا رہی تھی۔
"اے خدا۔!! اے مولیٰ۔! میرے پیار کی آگ کو جلتا رکھیو۔"
سناٹا ٹوٹا اور تیز تیز چیخیں در و دیوار سے ٹکرانے لگیں۔ اسی دم ساس کی خوشیوں سے بوجھل آواز، جس میں آنسو بھی بھرے ہوئے تھے۔ تیرتی آئی۔
"اوئے شیرے۔! ارے سنتا ہے! تجھے بیٹا ہوا ہے۔ تیرے باپ نے دوبارہ جنم لیا ہے! ہاں دیکھ تو۔!"
شیرا شیر کی سی تیزی سے لپکا اور دروازہ بھڑ بھڑا کر اندر گھس گیا۔ کمرے میں ایک مدھم سا دیا جل رہا تھا، مگر جب اندر داخل ہوا تو دیکھا زمین پر اس جگہ۔ جہاں شاداں کا چہرہ تھا۔ کئی چراغ، کئی چاند، کئی سورج ایک ساتھ جھلملا رہے تھے۔ یہ ماتا کی وہ روشنی۔ وہ ضیاء وہ تابناکی وہ مقدس آگ تھی جو اور کسی کے نہیں ایک ماں کے چہرے پر ہی جل سکتی ہے۔ شیرا اس بے پناہ روشنی سے خائف سا ہو گیا اور دبے پاؤں، یوں جیسے عبادت گاہ میں داخل ہوتے ہیں، دھیرے سے جھک کر بولا۔

"شاداں - میرے بیٹے کی ماں - !"

شاداں کے چہرے کے آس پاس نور کا وہ ہالہ روشن... اور روشن ... اور روشن ہو گیا اور وہ دھیرے سے گنگنا تی ہوئی بولی "شیر سے پھر سے کہو- میرے بیٹے کی ماں - میرے بیٹے کی ماں - میرے بیٹے کی ماں- ہاں میں تمہارے بیٹے کی ماں ہوں -"

بٹیا ماں باپ کی اس خوشی سے دور نہیں رہنا چاہتا تھا- اس لئے تیز تیز رونے لگا -

"سردی لگ رہی ہو گی -" شاداں دھیرے سے بولی -

"سردی ! یہاں کہاں کی سردی - ؟" شیرا حیرت سے بولا -

"تم تو سمجھتے ہی نہیں - ماں کے پیٹ کی گرمی کی بات ہی اور ہوتی ہے - رعنی کا گدیلہ کہاں کہاں رکھ دیا ماں نے - ؟" وہ اِدھر اُدھر دیکھتی ہوئی بولی -

شیرا ہنس کر بولا - "ماں تو گاؤں بھر سے میں نیوتہ دینے گئی ہے - ٹھہر میں دیکھتا ہوں -"

دو پہر سے کمروں - کونوں میں گدیلہ نہ پا کر شیرا پھر شاداں کے پاس آیا تو چیخ پڑا - "یہ کیا ؟ اری یہ کیا کرتی ہے شادو - ؟"

شاداں جیسے ابھی ابھی ، چند لمحوں پہلے بچے کو جنم دیا تھا - دھیرے دھیرے قدموں سے چلتی ہوئی کونے میں ، طاق میں روئی تلاش کر رہی تھی -

"اتنی جلدی نہیں چلا کرتے شادو - ماں دیکھے گی تو غصہ ہو گی - تو اتنی کچی ہے ، بگاڑ ہو جائے گا -"

شاداں نے گھوم کر اپنے بیٹے کے باپ کو دیکھا - ہاتھ اونچا کر کے

طاق سے روٹی کی تھبیں نکالتی نکالتی بولی۔
"شیرے، عورت جب ایک بیٹے کی ماں بن جاتی ہے تو آسمان اور زمین کی ساری طاقتیں اس کے سامنے جھک جاتی ہیں۔ اب میں کمزور نہیں۔ اب۔ اب،" وہ لال لال سے کپڑے کی طرف غرور سے دیکھتی ہوئی بولی۔ "اب میں تیرے بیٹے کی ماں ہوں۔!"
شاداں ہنس کر بولی۔ "ہاں شیرے بیٹے کا نام سوچا۔؟"
"بیٹے کا نام۔ بیٹے کا نام۔؟" شیرا منہ ہی منہ میں سوچنے کی خاطر گنگنا گنگنا کر بولنے لگا۔ "بیٹے کا نام! سچی کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے تیس مار خاں رکھ دے۔"
شاداں ہنسنے لگی۔ "واہ، کیا نام بھی سوچا۔ سچی دل لگی مت کرو۔ سچ مچ اچھا سا نام سوچو، ہاں۔"
"پھر کچھ سمجھ تو پڑے۔"
"واہ، اپنی بیٹی کے وقت سمجھ پڑا اور اب میرے بیٹے کی بار عقل سو گئی۔"
"اچھا۔" شیرے اس کے پاس گھس کر بولا۔ "یہ تقسیم کب سے کرلی۔ بیٹی میری اور بیٹا اپنا۔!"
شاداں محبت سے اس کی آنکھوں میں جھانک کر بولی۔ "یہ تمہارا ہی چھوٹا سا روپ ہے۔ میرا دل ہے، یہ تو میرا ہی ہے۔"
شیرے نے چاندنی کو گلے سے لگایا۔ "اس میں مجھے تیری ہی من موہنی شکل دکھائی پڑتی ہے۔ سچ مچ برابری ہے۔"
شاداں خوشی سے پاگل ہو کر بولی۔ "تم نے بیٹیا مجھے دے دیا نا؟"

"بالکل۔!"

شادان سنجیدہ ہو کر بولی۔ "تو یہ حق بھی میرا کہ جو نام چاہوں رکھوں"

اس کی سنجیدگی پر شبیرا ہنس کر بولا۔ "ارری پگلی تو اس میں پوچھنے کی کون سی بات ہوئی۔؟"

وہ گیلی گیلی آواز سے بولنے لگی۔ "تو اس کا نام میں بادل رکھ رہی ہوں"

"ارے واہ رے بادل خاں۔" شبیرا ہنستا جاتا اور بولتا جاتا۔

"واہ ری میا، خوب نام دیا پتر کو۔ بادل خاں۔"

شادان جھلا کر بولی۔ "نہ رکھو، خود ہی سوچ لو۔"

اب شبیرا سنجیدہ ہو گیا۔ "مگر ذرا تو سوچ ری یہ کیسا نام ہوا۔؟ بھلا کہیں بادل بھی رکھنے جیسا نام ہوا۔؟ ایسا ہی ہے تو چاند رکھ دے۔"

شادان پھر کسی عورتوں کے انداز سے بولی۔ "چاند تو اجالا پھیلاتا ہے اس لئے چاند کہلاتا ہے۔ سو چاندنی نے یہ نام حاصل کر لیا۔ یاد ہے تم کی وہ گھونٹ نا بجی تو اسی نے دور کر دی نا۔ تم نہیں جانتے بادل پیاسی دھرتی کی پیاس بجھاتا ہے۔ یہ ننھا بچہ بادل بن کر مجھ پیاسی زمین پر برسا اور جیون بھر کے لئے میری پیاس بجھا گیا۔ بھلا بولو تو یہ بادل نہ ہوا تو پھر کون ہوا۔؟"

شبیرے نے اسے حیرت سے دیکھا۔ اتنی ذرا سی تو تھی شادان مگر کبھی کبھار ماں سے بھی زیادہ بڑی اور عقل مند نظر آنے لگتی تھی۔

"واہ رے میرے بادل خاں۔" شبیرے نے بچے کو گود میں اٹھا لیا اور گھوم گھوم کر بولنے لگا۔ "واہ رے بادل خاں سارے ناؤ رے میرے......"

چاندنی اور بادل، بادل اور چاندنی گھر بھر کے زندگی کا سامان بن گئے۔

خیا ماں بدلو سے سال بھر بڑی تھی۔ مگر سال بھی نہ گزرا تھا کہ بدلو اسے پیچھے چھوڑ گیا۔ ساتھ ساتھ ہوتے تو بدلو بڑا نظر آتا اور خیا چھوٹی۔ ماں کو تو سبھی اولاد ایک جیسی پیاری ہوتی ہے، پھر بھی بدلو شاداں کا دل تھا۔ جو سدا اس کے پہلو میں دھڑکتا رہتا تھا۔ کبھی چوٹ بدلو کے لگتی تو خون اس کے نکل آتا۔ بیمار وہ پڑتا، گوشت اس کا گھٹنے لگتا۔ ہنستا وہ، زندگی اس کی لمبی ہو جاتی۔ ماں کی توجہ اور بے پناہ پیار نے اسے سوکھی جواری بھرا تھیلا بنا دیا۔ پھدپھد سارے میں بھاگتا پھرتا۔ چونکہ سال بھر بعد ہی بدلو چلا آیا تھا اس لئے خیا نے ایک سال بھر ہی دودھ پیا۔ بدلو کوئی چار سال مسلسل ماں کا دودھ پیتا رہا۔ ساری دنیا کی کھلائی پلائی۔ پھل میوے ایک طرف اور ماں کے دودھ کی طاقت ایک طرف۔ بدلو مہینے سے ہاتھ بھر اونچا نکل آیا۔ ماں باپ اور دادی۔ تینوں کے دلارے دو ننھے منے وجود۔ ان میں بدلو زیادہ پیارا تھا کہ بیٹے کی جون میں پیدا ہوا تھا اور ماں کا ایسا دلارا کہ زندگی کی ہر چھوٹی بڑی مسرت اسی کے وجود کی مرہون منت ہو کر رہ گئی۔ بھینس دودھ کرا تھی تو شاداں اسے یونہی کچا کچا تازہ دودھ پلا دیتی۔ ابال کے کراڑھتی تو ساری اوپر کی بالائی کھلا دیتی۔ اتنے دنوں سے وہ ساری دنیا سے ٹوٹ سی گئی تھی۔ سب اسے ناک سے بتاتے تھے اب وہ ایک بیٹے کی ماں تھی۔ اس سے کبھی پیار نہ کرتی۔ وہ اپنی زندگی بھی وار دیتی تو کم تھا۔ بھولے بسرے کبھی شیرا اسے گھر کی دے دیتا تو منہ دیکھ بات نہ کرتی۔ ایک بار ایسے ہی کسی

بات چھپا کر باپ نے ایک شوشہ ماری، شاداں نے بتیں وہ کہاں
نہ کھایا۔ وہ تو اس آنکھ کو پھوڑ ہی ڈالتی جو اس کے بدلو کو بُری نظر
سے دیکھتی، چاہے وہ کوئی بھی ہوتا۔

(۲)

لڑکیاں خودرو جنگلی بیلوں کی طرح بس لپکی پڑتی ہیں۔ بڑھی چلی
جاتی ہیں۔ چنا بھی لڑکی ہی تھی اور یونہی بڑھ رہی تھی۔ مگر بدلو لڑکا ہو کر
بھی دھیرج سے کام نہ لے رہا تھا۔ بڑھا جا رہا تھا۔ دونوں آگے ہی آگے
بڑھے چلے جا رہے تھے۔ بڑھتے بڑھتے جیسے چنا کے پاؤں تو کسی نے یوں ہی
روک لئے۔

"بس بیٹی بس، لڑکی ذات کو یوں کدکڑے تھوڑی لگانے چاہئیں۔"
مگر بدلو کو کون روکتا۔ وہ بہت دور جا کر انہوں نے پیچھے پلٹ کر دیکھا
تو ٹھٹھک کر رہ گئے۔

"ارے! اس ورش نے سنبھالے ہیں، ہم نے کچھ سوچا ہی نہیں، اتنی
جلدی ماں بوڑھی کیسے ہو گئی ۔ !"

ادھر عمر کے اس پار شاداں کھڑی تھی۔ ملگجی سفید کالے بال!
کاٹھی جو کسی زمانے میں تنی ہوئی رہی ہوگی اب ڈھیل پڑ گئی تھی۔ ہاتھ پاؤں
جیسے انگڑائی لینے کے بعد کوئی ڈھیلے چھوڑ دے۔ سخت، مضبوط اور گول
گول چھاتیاں، جن کا رس پی پی کے اب بدلو اور چنا یوں جوانی کو موڑ
پر کھڑے مڑ مڑ کر اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے، نیچے کو ڈھلک پڑی تھیں۔

بہار پھر آتی ہے، اس کے پیچھے پیچھے خزاں۔ ہرے ہرے، پیلے
پیلے پتوں کی یہ آنکھ مچولی ہمیشہ جاری رہتی ہے۔ ہرے پتے پیلے ہو کر
نیچے گرتے ہیں، پھر پیلی پوشاک سرخ اور ہرے ملبوس سے بدل جاتی
ہے۔ پھر وہی بہار، پھر وہی خزاں، وہی خزاں اور بہار کا آنا جانا
دنیا کیسے رنگ بدلتی ہے مگر پیار بھرے دل کبھی رنگ نہیں بدلتے
وہ یونہی دھڑکتے جاتے ہیں۔ چاہے وہ شاداں ہو یا شبرا، چھنا بال
ہو یا رسول خاں، کلثوم ہو یا چھنا۔ بیبنہ ہو یا سکو ہوا۔ بدلو ہو یا میرا، کبھی
محبت کبھی اپنا مقام بھول ہے۔

گگڑی پیچ کر شاداں دھیرے سے بولی: "جیون کی ایک بڑی ضرورت
یہ بھی ہے۔ تو کیا جانے۔؟"

گیہوں کی بوائی کا سا دن تھا۔ بدلو جو صبح سے جاتا تو شام کو ہی لوٹتا
پسینے سے تر بتر، منہ سرخ سرخ، بال پیشانی پر جھکے ہوئے۔ شاداں کا دل
اس کو دیکھ دیکھ خوش بھی ہوتا، ڈوب بھی جاتا۔

"ہائے میرا لال! ساری گھرداری سنبھالے ہے۔ ہائے کھیتوں کی
پیکھڑی دھوپ اسے بیمار نہ ڈال دے۔!"

اس دن دھوپ میں زیادہ ہی تیزی تھی۔ شاداں نے جلدی جلدی
ٹھلیا بھری، میٹھی کھٹی لسی کناروں سے چھلکنے لگی۔ چھنا آنگن میں پڑے
چھپر والے چولھے کے پاس بیٹھی روٹیاں پکا رہی تھی، شاداں پکار کر بولی۔
"روٹی لپیٹ کر ابھی دیتی ہے۔ دھوپ تو دیکھ کیا غضب کی ہے
ذرا بدلو کو لسی پلا آؤں، پھر تو روٹی لے کر چلے جانا۔"
جیسے کے شاداں اٹھی اور ٹھلیا سنبھال چلی۔ کھیت میں پہنچی

کر ادھر دیکھا، ادھر دیکھا، یہاں، وہاں۔ کہیں بدلو ہوتا تو دکھائی بھی دیتا۔ للو کی جھونپڑیا کے پیچھے سے ہنسی کی آواز آئی تو جھانک کر دیکھا۔

"ہائیں، ری کلثوم تو ان گنوں کی ہے۔!" وہ من ہی من میں جھلا کر بولی۔

"یہ کام کا وقت ہے یا ٹھٹھول بازی کا۔؟" انجان بن کر وہ دور تک گئی اور ہونٹوں کے آزو بازو ہتھیلیوں کی دیوار کھڑی کر کے زور سے چلائی۔

"بدلو ـــ ہوئے بدلو۔"

کھیت میں آواز گونجی اور بدلو، بدلو کہتی واپس آگئی۔ اک دم جھپاکے سے کاسنی دوپٹہ اڑا، چوڑیاں چھنکیں اور جھکے جھکے کوئی سایہ سا لپک گیا۔ بدلو انجان بنا نکل آیا۔

"ماں! ارے اتنی دھوپ میں تو۔؟ میں تو یونہی جھونپڑی میں جا کر بیٹھ گیا تھا۔" وہ آنکھیں چرا کر بولا۔

شاداں درشتی سے بولی۔ "یوں کام کے وقت اندر جا کر بیٹھ جانا ہے، بھلا کسان کی اولاد کو دھوپ سے کیا ڈر۔؟"

بدلو نے سر اٹھا کر ماں کو دیکھا۔ "ماں! تجھے کیا معلوم جھونپڑی کے اندر کیسی ٹھنڈک ہے۔!"

"لے یہ لسی پی لے۔" ایک دم اس کی نگاہ اس کی جیب سے جا ٹکرائی۔

"یہ پھول کیوں بھر رکھے ہیں۔" وہ الجھ کر بولی۔

"ماں۔ ماں۔ یوں ہی۔ بس اچھے لگتے ہیں نا۔" وہ سٹ پٹا گیا۔

"شاداں نے اس سے کچھ نہیں کہا۔ لسی کی خالی ٹھلیا لئے جب وہ گھر جا رہی تھی تو اس کا وزن پھولوں سے بھی ہلکا ہو گیا تھا۔ اس کا دل خوشی سے اڑا جا رہا تھا۔

"کلثوم ایسی بری بھی نہیں۔ اچھی خاصی ہے۔ ہاں بس بال بے حد بڑے ہیں، اور لوگ کہتے ہیں کہ لمبے بال منحوس ہوتے ہیں۔ ہونہہ تو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔؟" وہ دل ہی دل میں بدلو کو دولہا بنا دیکھ رہی تھی۔ اس کے آس پاس باجے بج رہے تھے۔ اور تنہائی کے باوجود وہ اپنے ساتھ ساتھ برات لئے چل رہی تھی۔

اس دن چنا کانپ رہی تھی۔ اس کا رنگ جو پہلے ہی جیسے دشباب تھا اب سفید پڑ رہا تھا، بلکہ ہلدی ہو رہا تھا۔ وہ سہمے سہمے آئی اور کونے سے لگ کر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں پھٹی ہوئی تھیں۔ اور منہ سے بات نہ نکل رہی تھی۔ گھر میں اس وقت کوئی نہ تھا۔ شاداں رشید چچا کے ہاں محلے کی چار چھ عورتوں کو لے کر کلثوم کو مانگنے گئی تھی۔ ڈھور ڈنگر کھیت پر تھے۔ دادی حسب معمول کھانستی پڑی تھی۔ اور گھر بھر پر بھیانک سناٹا چھا رہا تھا۔

شاداں کوئی گھنٹے بھر بعد لوٹی تو خوشی کے مارے مری جا رہی تھی۔ اپنے آپ میں باتیں بھی کئے جا رہی تھی۔ "اتنا تو دیکھتے ہی ہیں کہ سارے محلے، بلکہ سارے گاؤں بھر میں بدلو اپنے نام کا ایک ہی ہے۔ کون کام وہ نہیں کرتا۔ گھر وہ سنبھالے، خط وہ پڑھے، کشتیاں وہ لڑے۔ اس دن دنگل میں میسر سے کو کیسی اپٹ دی کہ سارے میں واہ واہ ہو گئی اور میسرا کیسے کھسیا گیا تھا۔ اور گلی ڈنڈے میں پالی والوں کو کیسی کھٹائی

پلا دیں۔ اتنے پر بھی اگر نام کو نہیں۔ اپنے بڑوں سے کیسے جھک کر لینا ہے۔"
جوانی اور سہاگ کے سارے ارمان پورے ہو جاتے ہیں تو یہ ارمان بھی اپنی جگہ برا نہیں لگتا کہ پوتوں، نواسوں کے ہاتھوں اپنے سفید بال نچوائیں۔
ٹینک پھیر دو گھر کو لوٹے اور پھر گھنٹیاں بجنے لگیں۔ سب اپنے اپنے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔
شام کا اندھیرا اٹھ گیا مگر بدلو نہ آیا۔
بہت دیر ہو گئی، اندھیرا گہرا ہونے لگا۔ پھر بھی بدلو نہ آیا۔ شاداں نے دروازے کے باہر جا کر دو ایک بار جھانکا۔ اور پھر دل کو تسلی دے لی۔
"کھیت پر صرف بوائی ہی تو نہیں کرتا نا۔ وہاں۔" اور وہ دل ہی دل میں ہنس پڑی۔
پھر شام گہری ہوئی اور رات آئی۔ رات ہلکی سیاہ تھی۔ پھر گہری ہونے لگی۔ بدلو پھر بھی نہ آیا۔
نیلے آسمان پر تارے چمک اٹھے مگر بدلو نہ آیا۔
چاند دھیرے دھیرے اپنی جگہ سے سرکنے لگا۔ مگر بدلو پھر بھی گھر سے باہر ہی تھا۔
شاداں نے باؤلوں کی طرح ادھر ادھر چکر کاٹنے شروع کر دیئے پھر وہ چلا کر چنا سے بولی۔ "تیرا ابا کہاں رہ گیا؟" یہ تو سوچ کر پریشان ہو گی۔"
چنا کے دید سے پیچھے ہوئے تھے۔ ماں اس کے قریب آئی اور

خوف سے بولی۔ "چنا تو بولتی کیوں نہیں۔؟"
چنا نے سارا زور لگا دیا مگر اس کی زبان نہ کھلی۔
شاداں نے اس کے بال کھینچے گال پر ایک تھپڑ لگایا "منہ سے بولتی کیوں نہیں، سو کیوں رہی۔؟"
چنا پھر بھی سوئی رہی۔ ماں نے اسے کنفورٹ ڈالا۔ دھیرے دھیرے اس کی آنکھیں ہنسیں اور زبان کھلی۔
"ماں! بھیا اب کبھی نہیں آئے گا۔ وہ فوندی میں بہہ گیا ماں۔"
"چنا۔!" ماں اتنی زور سے چیخی کر آنگن کے پیڑ پر بیٹھا کوئی پنچھی پر پھٹ پھٹا کر بھاگ کھڑا ہوا۔
"ہاں ماں۔" چنا بغیر رکے، مشین کی طرح، جذبات سے خالی آواز میں کہے جا رہی تھی۔ "میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ منیرے اور بھیا میں کسی بات پر نوک جھونک ہوئی اور پھر دونوں میں ہاتھا پائی۔ کبھی بھیا اٹھا کر منیرے کو پٹخے، کبھی منیرا بھیا کو دے مارے۔ جانے کتنی دیر اور میں کھڑی دیکھتی رہی۔ میں نے تو گھبرا کر آنکھیں ہی بند کر لیں ماں۔ مگر جب۔ جب آنکھیں کھولیں تو۔ تو وہ بہا جا رہا تھا ماں۔"
"جب سے کشتی میں بھیا نے منیرے کو اپٹ دی تھی تب سے وہ اس کی جان کا لاگو ہو رہا تھا ماں۔ کتنے جا لے اس سے لڑائی کے بہلنے نکالتا تھا۔ اور بھیا طرح دے جاتا تھا۔ مگر آج تو دور سے دیکھ کر کلثوم کا نام لیکر چھیڑنے لگا۔ ایسی ہی کوئی گندی بات کبھی بھیا کو غصہ آ گیا۔ سہن نہ کر سکا۔ دونوں میں وہ لڑائی ہوئی کہ میرے جسم کا بال بال کھڑا ہو گیا۔ بھیا کیا اس سے ہارنے والا تھا۔؟ مگر اس کمین نے،

ہوا کہ اسے جہان کی دنیا سے اٹھائے۔ ایسا پتھر سر پر مارا کہ وہ چکرا ہی گیا۔ میں جھاڑیوں پر چڑیلوں کے ڈر سے اندر ہی بیٹھی تھی۔ یہ سب کچھ دیکھ کر تو مری گئی۔ آنکھیں بند کر لیتی تو گھبرا کر زمین پر ہی آ پڑتی۔ بڑی دیر بعد میں نے آنکھیں کھولیں تو...."

پہلی بار اس کی آواز کانپی۔ سرسر کھیسرتے الفاظ رک گئے اور وہ بہچ کر رو پڑی۔ "تو وہ زخموں سے چور چور تھا۔ میں نے اسے پھینک دیا باب۔ اس کی جان لے لی۔ ہائے وہ مر جائے کتے بھی اس کی لاش کو نہ اٹھائیں۔ دنیا کا کوئی سکھ نہ دیکھے۔"

"کاسے ادھر سے آدھر ہونے لگے۔ پھر ویسی ہی جگمگاتی صبح نمودار ہوئی جیسی پدلو کی پیدائش کے دن ہوئی تھی۔ ہلکی ہلکی ہوا سے شادال کے بال بکھرے تو بہنا نے دیکھا کہ اس کے سارے بال روئی ایسے سفید ہو رہے ہیں۔ آنیر بلے گھر گھر جانے وہ خیالات کی چکی رکی اور شادال کی آنکھ جھپکی تو دیوار پر ٹنگے چہرے سے جا ٹکرائی، جس سے شیرا ہر بقر عید پر بکرے ذبح کرتا تھا۔

"مجھ پر دانہ پانی حرام ہے۔" وہ اپنے آپ سے کہہ رہی تھی۔

صبح گزری، سہ پہر، شام، رات اور پھر صبح۔ دنوں اور راتوں کا یہ چکر چلتا رہا۔ کوئی تین چار دنوں بعد شادال واپس آئی، چھرا اس کے ہاتھوں میں لٹک رہا تھا۔ سفید بالوں میں مٹی بھر گئی تھی۔ کپڑے ڈھیلے ہو کر نیچے کو آ پڑے تھے۔ اس نے جندے کو ڈپٹ کر پوچھا "وہ سور کا جنا کدھر گیا تھا تجھے معلوم ہے۔۔؟"

"مجھے نہیں معلوم ماں۔ میں تو ڈر کے مارے پتوں میں یوں چھپی

بیٹھی تھی کہ کسی کو نظر بھی نہ آسکوں۔ پتوں کے بیچ سے میں نے دیکھا تو ضرور تھا۔ پھر وہ رنگ نہ دیکھ سکی کہ کہاں چلا گیا۔"

شاداں بالکل ہی دیوانی بن کر رہ گئی۔

راتوں کو گھر سے نکل جاتی اور دن کو کھیتوں کھیتوں خاک چھانتی پھرتی۔ جانے منیرا اس کو کہاں آگ لگا کر کدھر کھسک گیا تھا۔ شاداں کی کمر سے چھرا یونہی لٹکتا رہتا۔ گاؤں میں کسی کو پتہ نہ چلا کہ بدلو کہاں چلا گیا۔ سب یہ سمجھے کہ شہر بھاگ گیا۔ شاداں کی حالت دیکھ دیکھ لوگ زہر بھری باتیں بدلو کو سناتے۔

"ماں کو دیکھو کہ آنکھ کی پتلی بنائے رکھا۔ اور اولاد کو دیکھو کہ اڑنے کو پر ہوئے تو پھر سے اڑ گیا۔"

"شہر کی ہوا ہی ایسی ہوتی ہے کہ ماں کی محبت ہی بھلا دے۔ کچھ تو خیال کرتا۔"

شاداں دیوانی کسی کی بات کا جواب دیتی نہ کسی سے اپنا غم بتاتی اپنی ہی دھن میں مگن رہتی۔

اتنے دن گزر گئے کہ گیہوں کی سنہری بالیاں ہواؤں سے لہرا کر سارے بھاسو ندھی سوندھی لپیٹیں اٹھانے لگیں۔

شاداں پکی پکی دیوانی بن گئی۔ اپنے آپ میں ہنسے جاتی۔ گاؤں کے ہر جوان کو روک کر اس کی صورت دیکھتی۔ لوگ دکھ سے بولتے۔

"نامراد اپنے بدلو کو کھوجتی ہے۔"

مگر نامراد بدلو کو نہیں، بہترے کو کھوجتی تھی کہ ایک ہی وار میں اپنے دل کی ساری پیاس بجھا ڈالے۔

اس رات پونم کا چاند آسمان پر چمک رہا تھا۔ گاؤں کی فضا میں
تو یوں بھی صاف ستھری، دھلی دھلی سی ہوتی ہیں۔ اس دن تو چاند تھا
پونم کا اور رات تھی بہار کی۔ تارے چم چم چمک رہے تھے۔ ہوائیں جو
چل رہی تھیں تو جیسے شہد میں گھلی گھلی۔ ندی پار سے گاتی، جھومتی ہوائیں
اپنے ساتھ پکی فصلوں کی خوشبو بھی اڑا لائی تھیں۔ شاداں کھیتوں میں،
درختوں کی آڑ میں، جھونپڑوں کی اوٹوں میں، ادھر ادھر، یہاں وہاں
کھوجتی پھر رہی تھی کہ کہیں تو مینرا ملے گا۔ آج کی رات تو وہ رات تھی کہ بس
پیا ملن کے لئے ہی بنی تھی۔ آج تو ہر راز عریاں ہو جانے کی سی رات تھی۔
شاداں پیڑ کی آڑ لئے تھکی تھکی کھڑی تھی نیم نیچے سے دو بالیاں
باتیں کرتی گزر رہی تھیں۔

"مینرا نہیں آیا۔؟"

ہنسی، شرم اور محبت سے ملی جلی۔ "اس کے باپ نے شہر
بھیج رکھا تھا۔ آج ہی تو لوٹا ہے۔"

"ہوں۔ تبھی گالوں پر پھول چمک رہے ہیں۔ نا۔؟"

پھر وہی ہنسی۔

"اچھا رابعہ، کبھی وہ نہیں آیا تو۔؟ تو تو کیا کرے گی۔؟"

"کیا کروں گی۔؟ ساری رات کھڑی رہ کر انتظار کروں گی۔ جب
چمکتا چاند ادھر سے ادھر ہو جائے گا تب تو وہ آئے گا۔ اس انتظار میں
بھی کتنا مزہ آتا ہے کہ بالم کی راہ دیکھی اور وہ نہ آیا۔ اور جب تڑپا رلا کر
آیا تو سینے سے سر ٹکا دیا، سارے گلے ڈھل گئے۔ ہائے وہ ضرور آئے گا۔"

اترائی میں املی کا گھنا پیڑ اپنے پتے سنسنا رہا تھا۔

چھنتے ہوئے اندھیرے اجالے سے شاداں سر جھکائے گزر رہی تھی۔ کہ سامنے ہی سوکھے پتے چرچرائے اور کوئی سایہ آگے بڑھا شاداں کا دل اچھل پڑا۔

"شیرا۔!"

وہ بلی کی پھرتائی سے لپکی اور اس کے راستہ میں آگئی۔ "تو نے ہی میری کوکھ اجاڑی ہے نا۔؟"

شیرے کا رنگ فق ہو گیا۔ اتنی بڑی حقیقت کو وہ کیسے جھٹلا سکتا تھا۔ اس کے ہاتھ پیر سن پڑ گئے۔ شاداں نے چمکدار چھرا نکالا اور زور سے سر کے اوپر گھما کر نیچے لا ہی رہی تھی کہ اکدم اس کی نگاہ ٹھٹک گئی۔ شیرے کی جیب سے سہرے کے پھولوں کی کلیاں جھانک رہی تھیں۔

اکدم شاداں جوان ہو گئی، سفید بال سیاہ ہو گئے، چہرے کی جھریاں مٹ گئیں، بازو صحت مند اور قد تن گیا۔ آنکھوں میں جگ مگ جگ مگ چراغ جلنے لگے۔ وہ نیم کے نیچے کھڑی شیرے کا انتظار دیکھ رہی تھی۔ بڑی راہ دکھا کر شیرا آیا تو وہ بلکتی ہوئی اس سے لپٹ گئی۔

"نردئی کہیں کے! میرے دل کا بھی کوئی خیال ہے کہ نہیں ؟"

چھرا اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر زمین پر گر پڑا۔

⁂

تہہ خانہ

گورے گورے ہاتھ بڑی پھرتی سے چل رہے تھے۔
بڑے سے تھال میں گیہوں کا آٹا بھگوئے ذکیہ بی بی لگا رہی تھیں۔
ہاتھوں کی حرکت کے ساتھ ان کا ہلکا پھلکا بدن جھٹکے کھا رہا تھا۔
کھڑے گلے کے کرتے میں سے گلا بیاں انڈی پڑ رہی تھیں۔ راشد میاں
کو شرارت سوجھی، ایک کنکر اٹھا کر پھینکا جو سیدھا ان کے گلے میں سے ہوتا
ہوا کسی نشیب میں جا بیٹھا۔
"اے واہ، ذرا سی لاج بھی نہیں آتی۔!"
میاں اشارے سے بولے۔ "لاج کیسی۔؟"
"ادھر اماں جان بیٹھی ہیں۔ نظر نہیں آتیں کیا۔؟" انہوں نے
اشارے میں جواب دیا۔
ایک دم راشد میاں زور سے بولے، ہنسی منہ پر بکھری ہوئی۔
"کیوں جی اگر نہیں۔"
ابھی ان کی بات منہ میں ہی تھی کہ پچھواڑے کے دروازے سے
دھڑ دھڑ کرتے تینوں بچے داخل ہوئے۔ خوشی سے ان کے منہ تمتما رہے تھے

منّا وہیں سے چلا کر بولا۔
"اجی اماں جی۔! اجی ابا جی! بلی نے بچے دیئے ہیں۔"
شانو نے آواز میں آواز ملائی۔ "ہاں ابا ہم نے خود دیکھے ہیں۔ بہت خوبصورت ہیں۔"
بے بی بھلا کسی سے پیچھے کیوں رہتی۔ "ہاں ابا چھب کے چھب گلابی گلابی ناک کے ہیں۔"
"سچ۔؟" راشد میاں بھی بچوں میں بچہ بن گئے۔
"ہاں، ہاں۔" تینوں نے ان کا ہاتھ پکڑ کر گھسٹینا شروع کیا۔
"آپ خود چل کر دیکھیئے ابا۔ اتنے پیارے ہیں۔ ہم نے دور ہی سے دیکھا ہے، ورنہ بلی تو نوچ ڈالے گی۔"
راشد میاں کے چہرے پر بھی بچوں کی سی خوشی کھیل رہی تھی۔
"اچھا اچھا چلتے ہیں بھئی۔ مگر جو بلی مار بیٹھے۔؟" بچوں کو خوش کرنے کے لئے وہ خواہ مخواہ بزدلی دکھا رہے تھے۔
"وہ نہیں مارے گی ابا۔ ہم کوئی چھیڑتے تھوڑا ہی ہیں۔"
"ہم تو ایک دھاری والا لیں گے۔ وہ جو پیلا پیلا ہے۔" شانو نے سب سے پہلے قبضہ جما لیا۔
"اور ہم وہ کالے دھبوں والا۔ ہاں۔" منے نے بھی حق جتا دیا۔
"اور پھر ہم کیا لیں گے۔؟"
"بلی جو تمہاری ہے۔" راشد میاں نے فیصلہ کرنا چاہا۔
"ہنہ۔" پھر وہ غصہ سے بولی۔ "اتی بڑی بلی ہم نہیں لیتے۔"
آپس میں تو تو میں میں ہونے لگی۔ راشد میاں ہنس کر بولے۔

"ارے بھئی ابھی سے تو نہ اٹھو۔ ابھی انہیں ذرا بڑے تو ہونے دو۔" ہنستے بولتے سب کے سب دروازے سے نکل گئے۔

ذکیہ بی کے ہاتھوں میں اب تک آٹا الجھا ہوا تھا۔

"ہونہہ! کیسے مزے مزے کی باتیں ہو رہی تھیں۔ کم بخت بلی کو بھی اسی وقت بچے جننا رہ گیا تھا۔ اور یہ بھی کیسے ہیں کہ بچوں میں بچے بنا جھٹ اٹھ کر چل دے۔" ذکیہ بی کا جی جل کر رہ گیا۔

ساس نے ادھر سے برچھی چبھوئی۔ "اے بہو کیوں اب روٹی پکے گی یا یونہی آٹا ملتی رہوگی۔ روٹی کی بجائے سوئیاں اتارنے کا تو ارادہ نہیں ہے۔؟"

ذکیہ بی نے تلملا کر ساس کو دیکھا: "کبھی آپ لوگ بھوکے رہے ہوں تو کہئے نا۔ آپ کو تو وقت پر کھانا مل جائے گا۔"

میاں گودام سے ... تو بچے آگے پیچھے جھول رہے تھے۔ بے بی مارے اترا ہٹ کے کندھے پر چڑھ بیٹھی تھی اور ہنس ہنس کر باپ کے ساتھ باتیں ہو رہی تھیں۔

"اور ابا جی نے اسے پکارا تو بلی تک نہیں بیٹھے تو موتی بولتے ہی کھا گئی تھی۔"

"اور ہاں ابا۔" نسا تو بولا، "آپ نے پرچ پرچ کیا مگر وہ تو ویسی ہی بیٹھی رہی جیسے اللہ جانے کون بلا تا ہو۔ کتنی بری ہے سالی۔!"

"ارے ارے! یوں گالیاں نہیں دیا کرتے ننھے بچے۔" باپ نے پچکار کر کہا۔

"تو پھر وہ آئی کیوں نہیں۔؟"

"بھئی اب وہ ماں بن گئی ہے نا۔ اب اسے ہم سے زیادہ اپنے بچوں کا خیال ہوگا۔ اب وہ کیا ہماری بات سننے لگی بھلا۔؟"

میاں اپنے تو بچوں سے سرراہ یہ بات کہہ دی مگر یہ تیر سیدھا ذکیہ بی کے دل میں جاکر اٹک گیا۔ پار نکل جاتا تو اتنی کلپ نہ ہوتی، مگر وہ تو وہیں چھدا رہ گیا۔ دھوئیں کے بہانے انہوں نے آنکھوں میں بھرے آنسوؤں کو پونچھا تو ساس نے دیکھ لیا۔

"دولہن اپنی کوکھ تو بھرتی نہیں، موئے نا اصلی بلی کتوں کا بھی حسد نہیں چھوٹتا۔"

بہو نے تڑپ کر ساس کو دیکھا، مگر وہ اپنی کرتی کی تُرپائی کرنے میں مشغول ہو گئی تھیں۔

دوسرے دن صبح ہوتے ہی سب کے سب پھر گودام کی طرف بھاگے۔ اور تو اور اب کے راشد میاں نے ذکیہ بی کو بھی گھسیٹ لیا۔

"ذرا دیکھنا تو کتنے پیارے بلونگڑے ہیں۔"

ادھر سے اماں چلائیں۔ "دولہن کیا کام کے موئے! اٹھا پھینکو۔"

"ارے واہ! اماں بی یہ خوب سنائی آپ نے۔" وہ ہنسنے لگے۔

"بھلا اتنے اتنے، ذرا ذرا سے بلونگڑے مر نہ جائیں گے۔؟"

"اے! تو کیا گلے میں باندھ کر لٹکاؤ گے۔ ابھی چار دن کو بڑے ہوں گے تو جگہ جگہ کو موت کر کے پھریں گے۔ خواہ مخواہ گندگی ہوگی۔"

صاحبزادہ بول اٹھا۔ "واہ! بلی گندگی کہاں کرتی ہے۔؟ بیچاری پہلے تو گڑھا کھودتی ہے اور پھر اس میں....."

دادی نے پوتے کی بات کاٹ دی۔ "اے بٹیا! تو پھر بستروں میں

سلاؤ، پکارا کیا جاتا ہے۔"

"یہ اماں تو بس یونہی کہتی رہتی ہیں۔ چلو ذکا۔" بیچے تو بچے تھے، میاں بلونگڑوں کو دیکھ کر یوں اچھل رہے تھے جیسے سب کے سب بچے ہی ہوں۔

بلونگڑے چپ چپ دودھ پی رہے تھے نیم آنکھوں سے ٹٹول ٹٹول کر ماں کا گرم گود ڈھونڈھے جا رہے تھے۔ بی بی یوں مطمئن تھی جیسے اب دنیا کی کسی چیز کی حسرت باقی نہ رہ گئی ہو۔

"ارے بلی کے لئے دودھ لائیں ہم؟ بھوکی ہو گی۔" اور کسی کے جواب کا انتظار کئے بغیر منا اندر دوڑ گیا۔ طشتری میں دودھ لے آیا اور بلی کے سامنے آہستگی سے رکھ کر بولا۔

"لے، پوسی پوسی، پوسی، لے پی لے۔"

بلی نے پچ پچ سن کر ایک لمحے کو آنکھیں کھولیں اور دوسرے ہی لمحے پھر بند کر لیں۔

"شاید گرم چائے پر دل جا رہا ہو گا اس کا۔" اب کے شانو میاں دوڑ گئے جینی کی طشتری میں چائے لا کر اس کے سامنے رکھی اور بڑے پیار سے پچکار کر بولے۔

"لے موتی، یہ چائے پی لے۔"

موتی نے پچھائی آنکھیں کھولیں اور پھر بند کر لیں۔

"ہشش۔ وہ تو پراٹھا کھائے گی۔" یہ بی امید دوڑ گئی اور میٹھی میں نرم نرم سا پراٹھا دبائے سہاگی آئی اور بالکل اس کی ناک میں پراٹھا گھسیڑ دیا۔

پوسی نے حد درجہ ناگواری سے بلی کو دیکھا۔ کوئی طریقہ ہے کھلانے کا،
بچوں پر ذرا مایوسی چھاگئی۔
"یہ تو کچھ بھی نہیں کھاتی جی ابا۔"
ابا نے ہنستے ہوئے جواب دیا۔ "وہ ماں بنکر ہر چیز سے بے نیاز ہو گئی ہے بیٹے۔ اولاد کی محبت ہی ایسی ہوتی ہے۔" بلی نے آنکھ کھول کر سب کو دیکھا، اپنی جگہ سے ذرا ہلی اور بچوں کو اپنے نیچے کر لیا۔ پہلے بلونگڑے کی ذراسی کمر نظر آرہی تھی۔ پوسی بڑی محبت سے اس کی کمر کو اپنی زبان سے چاٹنے لگی۔
بچے بد دل ہو گئے۔ پھر سے وہی سوال دہرانے لگے۔
"یہ کچھ کھاتی کیوں نہیں ابا۔؟"
"بھوک نہ لگی ہوگی۔" راشد میاں کو خود کوئی معقول جواب نہ سوجھ رہا تھا۔
"ارے واہ! بھوک کیسے نہ لگی ہوگی۔ روز تو جب پوسی پوسی کرکے بلاتے تو بھاگی چلی آتی تھی۔ آج کیا ہو گیا۔ روز تو جب تب دسترخوان پر دھنکاری جاتی تھی اور آج تو کھانے کو سونگھتی بھی نہیں۔"
"ارے اسے گوشت کھلانا چاہیئے۔" منا پھر دوڑا اور ہاتھ میں کچے گوشت کا ایک بڑا سا پارچہ اٹھائے آیا۔
"اب تو کھائے گی سالی۔!" اس نے جوش میں آکر کہا۔
"پھر وہی گالی۔!" راشد میاں کبھی تربیت سے غافل نہ رہتے مگر منے نے اپنی گرم جوشی میں ان کی تربیت کا کوئی نوٹس نہ لیا اور عین بلی کی بند آنکھوں کے سامنے گوشت لٹکایا کہ ناک سے چھونے لگا۔

بلانے ہلکی سی کسمساہٹ کی، اپنی جگہ سے اٹھی اور دوسری کروٹ پر بیٹھ گئی۔ دونوں بلونگڑے دوسری طرف سے دودھ ڈھونڈنے لگے۔

"آج تو وہ کچھ نہ کھائے گی۔" راشد میاں ہنس کر بولے۔ "اب ایسے بچوں کے سامنے کوئی چیز نہیں سہاتی۔"

ذکیہ بی کو اپنا دل پہلو میں گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ آنکھوں میں امنڈتے ہوئے آنسوؤں کو انہوں نے بڑی مشکل سے ضبط کیا اور بغیر منہ سے ایک لفظ نکالے گودام سے نکل گئیں۔

گھر کی ہنستی بولتی فضا میں جیسے رکاوٹ آگئی، مگر صرف ذکیہ بی کی حد تک۔ دل اندر ہی اندر جیسے کٹا جاتا اور گھر بھر تو جب دیکھو تب پوسی اور بلونگڑے موضوع بنے ہوئے ہیں۔ میاں باہر سے آتے تو بچے یا خود بچے کر سیدھے گودام میں دوڑ جاتے۔ بچے اسکول سے لوٹتے تو بستے بغل میں لٹکے ہی ہوتے اور بلی کا طواف شروع ہو جاتا۔ ذکیہ بی کے دل میں جیسے گرہ پڑ گئی۔

"بچہ بھی دنیا میں کیا نعمت ہے۔ چاہے انسان کا ہو، جانور کا ہو سب اسی کو گھیرے رہتے ہیں۔" اپنی خالی کوکھ کا خیال آتا تو اللہ میاں پر غصہ آنے لگتا۔

"محلے میں جس کو دیکھو کمر پر کالا پیلا بچہ چڑھائے پھرتی ہے۔ گھر بھرے پڑے ہیں اور کھانے کو دانہ دنکا تک نہیں۔ خود میاں کو تین گھٹتی ہیں۔ میری بھی گود بھر دیتا تو کیا جاتا خدا کا۔۔؟"

راشد میاں بڑے دل والے، بڑی محبت والے میاں تھے۔ ذکیہ بی کی خالی گود پر انہیں کبھی اعتراض نہ ہوا۔ ہوتا کیوں۔۔؟ اللہ نے انہیں

تو آل اولاد سے خوش ہی خوش رکھا تھا۔ سونے آنگن کو تینوں بچوں کی چیخ و پکار خاصا آباد کر دیتی ہے، مگر اس کا کیا علاج کہ عورت ہونے کے ناطے خود بی ذکیہ ہی ایک ننھے منے وجود کے لئے ترستی تھیں۔ شادی کو چھ سات سال تو ہو ہی چکے تھے۔ کیسے کیسے ارمان جی کو لگے ہوئے تھے۔ مگر سب جی کے جی میں ہی گھٹ گھٹ کر رہ گئے۔ سوتن کے تینوں تینوں بچے تھے۔ مگر انہیں دیکھ کر تو بجائے پیار کے ان کے آگ لگی سی تھی۔ اپنے ہوتے تو کلیجے سے لگائے پھرتیں۔ مگر اب تو ان کی ہنسی، ان کی چیخ پکار جیسے کانوں میں چھید ڈالتی۔ بات بے بات دھتکارا کرتیں، خواہ مخواہ ڈانٹ ڈپٹ کرتیں۔ غصے کی بات پر بھی غصہ اور پیار کی بات پر بھی غصہ۔

پہلے پہل شادی ہوئی تو بچے چھوٹے چھوٹے تھے سمجھے کہ ہماری ہی ماں ہو گی۔ مگر پہلی ماں ایسی تھی کہ بھول سے بھی پھٹکار نہ کرتی غصہ کی حرکت پر بھی پیار کرتی اور پیار کی حرکت پر بھی پیار ہی کئے جاتی۔ بھول سے کبھی پھول کی چھڑی بھی نہ چھوائی۔ ایڑیاں گھس گھس کر جو ضد کی پوری کر دی۔ وہی اماں اب کیسی ہو گئی تھی کہ دیکھتے ہی آنکھوں میں خون اتار لیتیں۔ کہاں تو وہ پیار دلار اور کہاں یہ روز روز کی کوٹ پھٹکار۔ بچے ہی تو تھے، تھوڑے ہی دنوں میں یہ حال ہو گیا کہ ماں سے کٹے کٹے رہنے لگے۔ دن بھر میں دو چار باتیں کر لیتے تو کر لیتے۔ ورنہ تینوں آپ ہی آپ روٹھتے بھی منتے بھی۔ بہت ہوا تو شام کو باپ کے سامنے شکایت کر دی۔ نہیں تو دادی کی جان پر ستم توڑنے لگے۔

ساس بہوؤں کی آپس میں کبھی نہیں پٹتی۔ یہ ہمیشہ سے ہوتا چلا آیا ہے اور ہوتا رہے گا۔ اب یوں دیکھو تو پوتے بھی تھے اور پوتی بھی

اب کون ارمان سہلا ان کے جی کو لگا رہ گیا تھا۔ مگر گھونگھٹ بھی نہ اٹھا ہوگا کہ ساس نے بات پیچھے طعنہ دینا شروع کر دیا۔

نہ کبھی ذکیہ بیگم کے دن چڑھے نہ ساس کی زبان رکی۔ مہینے پیچھے ہر بار ذکیہ بیگم کو آس بندھتی کہ ممکن ہے اب کے سے حمل رہ گیا ہو۔ مگر وہ اسی پابندی سے نماز ناغہ کرتی رہیں اور ساس اسی لگن سے طعنوں کے تیر برسانی رہیں۔ اور ادھر ہر لمحہ ذکیہ بیگم کی آنکھوں میں منا، شانو اور بے بی کھٹکنے لگے۔

کہنے والوں نے جھوٹ نہیں کہا ہے کہ خدا کے ہاں دیر ہے مگر اندھیر نہیں۔ ایک بار یونہی ذکیہ بی کے متلی اٹھی، نفے ہوئی اور چکر پہ چکر آنے لگے۔ ہاتھوں پیروں کا دم ہی جیسے جاتا رہا۔ پلنگڑی سے لگ گئیں۔ متلی چکر میں دنوں کا حساب بھی بھول گئیں اور مہینہ چڑھ گیا۔ دوسرے مہینے پلنگ چھوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ کام کاج میں چلنے، پھرنے لگیں تو ساس نے دیدے گھما گھما کے دیکھنا شروع کیا۔ متلی چکر تو تھے ہی، چہرے کا رنگ بھی پیلا پڑ گیا تھا۔ اور چال میں بہ ہبکا ہبکا پن۔ یا دن گزرے جا رہے ہیں اور بہو ہیں کہ پابندی سے نماز پڑھے جاتی ہیں۔

ساس کو بڑا ارمان تھا کہ پانچ پوتوں کی دادی کہلاؤں۔ ذکیہ تو اپنے رب سے اتنی مایوس تھیں کہ اس قسم کی خوش نصیبی کا خود پر گمان بھی نہ سکتا تھا۔ مگر ہوا یہ کہ دو چار مہینے بعد پیٹ سامنے بڑھا چلا آنے لگا اور ہر اچھی بری چیز کے لئے طبیعت للچانے لگی۔ کبھی کھٹے بیر چاہئیں تو کبھی تیز تیز مونگ کے بڑے، کبھی جواری کی باسی روٹی کے ساتھ

ابھار پر طبیعت اُمڈ رہی ہے تو کبھی اودی اودی جامنوں پر۔
ذکیہ بی کو کیسی کیسی شرم آتی کہ میاں بھلا کیا سوچیں گے کہ یہ ایسی آل کھاؤ بی کیسے ہوگئی ہے کہ ہر ہر چیز پر ربھکوں کی طرح ٹوٹی پڑ رہی ہے۔ مگر ایک دن محلے کی دائی نے، جو یونہی اماں جان سے گپ لڑانے چلی آتی تھی۔ یہ انکشاف کر کے کہ بہو بیگم کو تو پانچواں بھر رہا ہے، ذکیہ بی کے دل کے آنگن میں سو سو گلاب کھلا دیئے۔ آنکھوں کی پتلیوں میں چاند چمکنے لگے دل کے کسی کونے سے آپ ہی آپ صدا آنے لگی۔

"سو جا رے میرے پیا لے سو جا رے میرے بالے

ذکیہ بی ان دنوں زمین پر نہیں آسمانوں پر چلتی تھیں اور ہواؤں میں اڑتی تھیں۔ ساری زچیری تندی، ساری بدمزاجی ہوا ہوگئی۔ وہی ساس کہ جن سے لڑتے جھگڑتے ادھر کا سورج ادھر ڈھل جاتا۔ اب ایسی پیاری ہوگئیں کہ اماں جان ہیں تو سب کچھ ہے۔
"اماں جان کے دانتوں میں زور ہی کہاں ہے کہ بیچاری کچھ سخت گرم چبا سکیں۔"
کبھی سنتریاں پک رہی ہیں تو کبھی نرم نرم گلتی، کبھی جاڑوں کے آنے کا حلوہ ہے تو کبھی بادام کا حریرہ۔ بچوں سے بھی آپ ہی آپ ملتی ہوگئیں۔ جو چیز آرہی ہے سب مل بانٹ کر کھا رہے ہیں۔ بچے بچے ہی ٹھیرے تکا دیں تری دیکھی تو ادھر ہی ڈھک پڑے۔ بچے ماں کے آس پاس منڈلا رہے ہیں۔ میاں سے تو تو میں میں کی بجائے پیار دلار کی باتیں ہو رہی ہیں چھیڑ چھاڑ ہو رہی ہے میاں تو بیچارے سدا ہی کے سیدھے سادے تھے۔ یہ آپ ہی اینٹھ جاتی تھیں۔ اب گھر پر خوشیوں کا دور دورہ تھا۔ کرنے

کرنے سے مسرت ٹپکی پڑتی تھی۔
چلہ نہا کر اٹھیں تو پھر گھر کے کام کاج گلے پڑ گئے۔ مگر اس میں بھی ایک لطف تھا۔ ادھر ادھر سے آکر بچے کا منہ چوم جاتیں، گود میں اٹھا لیتیں، سینے سے لگا لیتیں۔ پیشاب کر دیا ہوتا تو پوتڑا بدل دیتیں۔ روئے نہ روئے آپ ہی آپ بہلاتیں، مناتیں۔ اور جو کبھی رو ہی دے تو کس کی ہانڈی، کہاں کی روٹی۔ ہانڈی جلتی ہے تو سو بار جلتی رہے، روٹی کوئلہ بنتی ہے تو ہزار بار بنتی رہے، جیسے ایسا لال! لاکھوں روپے وار پھینکوں۔
محلے والیاں خواہ مخواہ ہی اتراتی پھرتی تھیں کہ دودھ نہیں اترتا، بچے کا پیٹ نہیں بھرتا۔ میوے کھا رہی ہیں، پھل چوس رہی ہیں۔ حریرے ڈھکوس رہی ہیں اور پھر بھی شکایت کہ دودھ سوکھتا جا رہا ہے۔ یہاں تو بی ذکیہ نے کبھی میوہ چکھا، پھل کی خوشبو ہی سونگھی۔ یہ تک نہ جانا کہ حریرہ کیا بلا ہے۔ بچہ پلانے کو بیٹھتیں تو لگتا کہ بس دو نہریں ہیں کہ امڈی چلی آ رہی ہیں۔ کیسا بہتوتی دودھ تھا کہ دن بھر میں بچے کو چار چھ بار پیٹ بھر بھر پلانے کے بعد بھی تین چار کرتے بدلنے پڑتے۔ جب تب گود میں لیتیں محبت کی ایسی لہریں اٹھتیں کہ بنا کھائے پیئے ہی دھاریں بہہ نکلتیں۔ بچے کو پا کر ہر چیز سے بے نیاز ہو گئیں۔ ساس کہہ کہہ کر مر جاتیں مگر حلق سے نوالا نہ اترتا۔
اچھا برا تو اوپر والا ہی کرتا ہے۔ کون جانے کس بات میں اس کی کیا مصلحت چھپی ہے۔ ہم لاچار بندے تو بس یہی کہہ کر دل کو تسلی دے سکتے ہیں کہ اللہ کا جو کام ہوتا ہے مصلحت سے ہی ہوتا ہے۔

گرمی کے دن تھے۔ بدن تھے کہ جھلسے جا رہے تھے۔ اترتی دھوپ میں بچے کو ٹھنڈے پانی سے نہلایا۔ گرمی دانوں کے مارے جسم پھر بیرا گیا تھا۔ موٹا تازہ، گدگدا بچہ پانی کے ٹب میں بیٹھا کو لگا چھپ چھپ پانی کے چھپاکے اڑانے۔

بچے کو خوش دیکھ کر ماں کا جی کیسا خوش ہوتا ہے۔ ذکیہ بی کے دل میں کوئی جھانک کے دیکھتا۔ گلزار کھلے جا رہے تھے۔

"اوئی دلہن غضب خدا کا! ایسی چٹکتی دھوپ میں آنگن میں بچے کو نہلائے جاتی ہو اور اتنی دیر سے پانی میں بٹھال رکھا ہے۔ دھوپ لگ جائے گی نا۔"

"اماں جان گرمی تو دیکھیے جھلسا جا رہا تھا۔ اب کیسا خوش ہو رہا ہے۔"

"خاک خوش ہو رہا ہے۔ نمونیہ ہو جائے گا، ہاں!"

ذکیہ بی کو ہنسی آگئی۔ "نمونیہ۔؟ اوئی اماں جان۔! بھلا دھولیوں کے دنوں میں نمونیہ ہو گا۔؟"

"تم کو بھلا کیا تجربہ ہے بی بی۔؟ تمہاری بڑی نند کی بچی یونہی جاتی رہی۔ اچھی خاصی کھیلتی مالتی۔ بس نہلانا ہی بہانہ ہو گیا۔ مگر تم لوگ کسی کی مانو بھی۔ اگلے زمانے والوں کو تو تم نئے لوگ یونہی چٹکیوں میں اڑاتے ہو۔"

ذکیہ بی نے ہنستے ہنستے سفید تولیہ میں لپیٹ بچے کو اٹھا لیا۔ اور راشد میاں نے روتے روتے سفید ململ میں لپیٹ قبر میں سلا دیا۔

دو ہی چار دنوں میں ذکیہ بیگم کا کیا حال ہو گیا۔ ذرا سا منہ نکل آیا۔ ہاتھ پاؤں سوکھ گئے، دل رہ رہ کے بس ہو۔ ہو کیے جاتا۔ اپنے دیدوں دیکھتے، اپنے ہاتھوں بہو کو نہلایا تھا۔؟ سفید ململ میں لپیٹ کر مو گرے

کے ڈھیر میں چھپا دیا تھا۔ مگر ممتا کا مارا بے کل جی چین پائے تو کیسے۔ ؟ کونے کھدروں میں جھانکتی پھرتیں۔ کبھی چولہے کے پاس دیکھتیں تو کبھی دالان میں۔ یہاں تو نہیں چھپ گیا۔ ؟ وہاں تو نہیں چھپ گیا۔ اماں جان آپ نے تو نہیں دیکھا۔ یہیں تو سویا تھا۔ ابھی کے ابھی میں کہاں چلا گیا۔ ؟ کہاں کھو گیا۔

روتے روتے آنکھوں میں گلابی گلابی دھبے تیر گئے۔ بو بو پکارتے پکارتے ہونٹ پپڑا گئے۔ مگر بو کو آنا تھا نہ آیا۔ عمر بھر کے لیے کلیجے کو پھانس لگا کر چلتا بنا۔ بو پھول تھا۔ ذکیہ بی چمن۔ پھول گیا تو کیا چمن اور کیا چمن میں بہار! وہی دن تھے اور وہی راتیں۔ بات بات پر الجھ پڑتیں، پاگلوں جیسی حرکتیں کرتیں، کاٹنے کو دوڑتیں۔ بعد میں پھر کبھی تو گود ہری نہ ہوئی۔ ان کی قسمت میں اوپر والے نے ایک ہی پھل رکھا تھا۔ وہ بھی ادھ پکا۔

باپ کو دیکھتے ہی بچے آگے پیچھے جھول گئے۔

"ابا!! ابا۔! بلونگڑوں نے آنکھیں کھول دی ہیں۔"

"اچھا۔ ؟" وہ ذرا بناوٹی حیرت سے بولے۔

"ہاں ابا۔! اور اب تو وہ ذرا دور تک گھوم پھر بھی لیتے ہیں۔"

بلی کا ٹھکانہ آج کل ذکیہ بی کے اپنے کمرے میں تھا۔ سات گھر گھمانے کے بعد اس نے چھپر کھٹ نیچے ہی اپنی ٹیک لگائی۔ ذکیہ بی کے چھپر کھٹ کے پاس راشد میاں کا بڑا سا پلنگ تھا۔ بچے باپ کے پلنگ پر چڑھ گئے اور سر نیچے جھکا کر رینگتے ہوئے بلونگڑوں کو دیکھنے لگے۔

راشد میاں نے بھی سر جھکا کر دیکھا۔ پوسی تھپے اطمینان سے دودھ پلا رہی تھی۔ چھوٹا بلونگڑا اس کی دم کے پاس پڑا پیاؤں پیاؤں کر رہا تھا

"ارے، اس کالے دھبوں والے کو کس نے ماں کے پاس سے ہٹا دیا۔؟" راشد میاں ذرا الجھ کر بولے۔

"بیں نے۔" شانو سہم کر بولا۔

"اور جو اس کی ماں اس کو ادھر اُدھر ڈھونڈتی پھرے گی۔؟"

"وہ وہیں تو چپکا ہے ابا۔ ذرا منہ موڑیگی تو آپی۔ دکھ جائیگا۔"

"خبردار! جو بلونگڑوں کو کبھی ماں سے الگ کیا۔ وہ سارے میں چلاتی پھریگی۔ ہاں سن لو۔" راشد میاں کے بگڑے تیور دیکھ کر تینوں بچے سہم گئے۔

ذکیہ بی، جو توے پر روٹی ڈال رہی تھیں، روٹی کے ساتھ ساتھ اپنا پنجہ بھی ڈال گئیں۔ "سی" کی آواز ان کے منہ سے نکلی۔ انگلیاں جل کر کوڑیا ہو گئی تھیں۔

"خبردار! جو بلونگڑوں کو ماں سے الگ کیا۔" ان کے کانوں میں بس یہی گونج باقی رہ گئی۔ "خبردار! خبردار! خبردار!"

رات کے کھانے پر آلو کا سالن تھا، جو میاں کا من بھاتا کھاجا تھا۔ مسور کی دال، چپاتیاں اور کھیر۔ آلو کے سالن میں غلطی سے مرچیں زیادہ پڑ گئی تھیں۔ سو سو کر کے کھائے جا رہے تھے۔ بی بی نے کھیر کا پیالہ سامنے بڑھایا۔

"ایسا بھی کیا بس کھائے جا رہے ہیں۔ ہٹایئے، رکابی سامنے سے ذرا سی کھیر تو لیجیے۔ ٹھنڈک پڑ جائے گی۔"

"ابا کھیر - !" راشد میاں خوشی سے بولے بیٹھوں میں کھیر پر دم دیتے تھے - پیالہ پکڑا جلدی جلدی چمچے چلانے لگے - زبان میں اس بری طرح جلن ہو رہی تھی کہ میٹھے سے بھی آگ بجھی نہیں - ابھی سو سو جاری ہی تھی کہ پیالہ پکڑا اٹھ کھڑے ہوئے -

"کہاں جا رہے ہیں - ؟" ذکیہ بی حیرت سے بولیں -
سہنس کر بولے - "ذرا پوسی کو کھلا دیں تھوڑی سی - "
ذکیہ بی ذرا برا مان کر بولیں - "خود آپ کے منہ کی آگ تو بجھی نہیں اور بلی کا چونچلا سوجھ رہا ہے - کھا لیجئے نا - آپ کا تو پسندیدہ میٹھا ہے "
"بلی بھی تو پسند کی ہے - ایسا بھی کیا ہے ، بے چاری نے دو دو بچے جنے ہیں - کچھ تر مال اسے بھی تو ملے - "
باپ کے ساتھ بچے بھی اٹھ کھڑے ہوئے - "ہاں ابا - ! ہم کھلائیں گے - ہم بھی کھلائیں گے - "
ذکیہ بی نے سامنے سے رکابی سرکا دی - "حلق سے اترے تب نا - ! لگتا تھا سارے گھر والوں کے دلوں پر بلی چھا کر رہ گئی ہے - اماں جان نے ریشمی کترنوں سے بلونگڑوں کے لئے گلوں میں ڈالنے کو پٹے بنے ، جن پر دو دو پیسے میں ملنے والے چھنکتے گھونگھرو بھی ٹانک دیئے - سردی کے دن تھے اس لئے راشد میاں نے ماں سے سفارش کی کہ بلی کے لئے چھوٹا موٹا ، پرانے دھرانے کپڑوں کا نہالچہ سی دیا جائے - پوسی سردی سے مر نہ جائے گی - ؟
بلی خالہ کے کیا ٹھاٹ تھے - مزے سے گدے پر لیٹی ہیں ادھر بیٹا بلونگڑا

گھوم گھام کر آتی ہیں، پھر پہلو میں بلونگڑے سے ہیں اور ان کی زبان۔ پتلی سی زبان سے اتنا چاٹتیں کہ بلونگڑے مونے گیلے گیلے ہو جاتے۔
باپ کی اجازت سے بچے بلونگڑوں کو اٹھا کر دالان میں لے آتے اور گھر بھرے کو تماشہ ہو جاتا۔ منا تو اپنا گیند پھینک دیتا اور بلونگڑے اس کے پیچھے لپک پڑتے۔ بستر بچھائے جاتے تو بلونگڑوں کو نئی شرارت سوجھ جاتی۔ چادروں، گدوں پر لوٹے پڑتے۔ دو چار گھروندے جب تک بچوں کے ہاتھوں پر نہ پڑ جاتے نہ یہ ملتے نہ وہ مانتے۔ میاں ہنس کر بتاتے۔
"دیکھا ذکا۔؟ بدمعاشوں نے میرے ہاتھ بھی لہولہان کر ڈالے۔"
ان کے لہجے میں پیار ہی پیار بھرا ہوتا۔
"سب بلی اور اس کے بچوں کے دیوانے ہیں۔ کسی کو فرصت نہیں کہ دو گھڑی کو میرا بھی حال پوچھ لے۔" ذکیہ بی نے بڑے کرب سے سوچا۔
سردیوں کی راتیں تھیں، ٹھنڈے کی سردی پڑ رہی تھی۔ محراب میں نیچی لو سے قندیل جل رہی تھی، سب رضائیوں میں سکڑے سمٹے پڑے تھے۔ بڑے سے پلنگ پر تینوں بچے آڑے سوئے تھے۔ اور خود چھپر کھٹ پر راشد میاں کے پہلو میں ذکیہ بی بی۔
ذکیہ بی نے منہ پر سے رضائی سرکائی اور بے چین نگاہوں سے کمرے کا جائزہ لیا۔ سبھی سو رہے تھے۔ رضائی کو دھیرے دھیرے کمر تک، اور پھر پیروں تک سرکا دیا۔ ہولے سے بستر پہ اٹھ کر بیٹھ گئیں میاں نے جو پلنگ ہلتا محسوس کیا تو مندی مندی آنکھوں سے بیوی کو

دیکھ کر بولے۔

"کیا کر رہی ہو۔؟"

"ایسے ہی، پیاس لگی ہے۔"

میاں پھر کروٹ لے کر سو رہے۔

ذکیہ بی چھپر کھٹ سے اتر کر کھڑی ہوگئیں۔ میاں کے منہ پر جھک کر اطمینان کر لیا کہ کہیں کچی نیند تو نہیں ہے۔

تھوڑی دیر یونہی کھڑی رہیں۔ میاں خرخر کر رہے تھے۔ ذکیہ بی نے اطمینان کی سانس لی۔ نیچے بیٹھ کر چھپر کھٹ کے نیچے جھانکا۔ بلی کہیں سیر کو گئی ہوئی تھی۔ دونوں بلونگڑے گادی پر خرخر کرتے پڑے تھے۔ ذکیہ بیگم کی سانس اوپر نیچے ہونے لگی۔ دل کو دبا کر انہوں نے گدی کا کونہ پکڑ کر ہولے سے اپنی طرف کھینچا۔

"پیاؤں، پیاؤں۔" دھکا کھا کر دونوں نے مری مری آواز میں چلانا شروع کر دیا۔ مدھم سی روشنی میں دونوں بلونگڑے بڑے پیارے لگ رہے تھے۔ دھکے سے ان کی نیند میں خلل آگیا تھا اس لئے بچ مچ آنکھیں کھول کر انہوں نے ناگواری سے ادھر ادھر دیکھنا شروع کر دیا۔

ذکیہ بی نے گدی اس انداز سے لپیٹی کہ دونوں بلونگڑے اس میں اچھی طرح لپٹ جائیں۔ پھر تہہ کی ہوئی گدی کو لے کر دھیرے دھیرے آگے بڑھتی، پیچھے دیکھتی وہ آنگن میں نکل آئیں۔

کمرے کی نیم گرم سی فضا سے نکل کر باہر ایک دم شدید سردی میں آکھڑی ہوئیں۔ مگر انہیں سردی کا کوئی احساس نہ ہوا۔

گیارہ بجے کا عمل تھا۔ مرزا صاحب کے گھر سے اب تک باتوں کی اور ہنسی کی آوازیں آرہی تھیں۔ بیگم مرزا کا بڑا اصرار تھا کہ تمہاری بلی کے بلونگڑے ہوں تو ہمیں دینا۔ پوسی تھی تو دیسی بلی، مگر یہ بڑے بڑے جھالردار بال۔ ؟ گدگدے، نرم نرم، موٹے موٹے پنجے۔ ؟ بھار بھرکم۔ بلونگڑے بھی ویسے ہی ہوئے۔ مجلے بھر سے ہیں بہت سوں کے دانت تھے۔

بیگم مرزا اس وقت ذکیہ بی کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ گئیں۔

"اس وقت۔ ؟ خیریت تو ہے۔ ؟" وہ بوکھلا کر بولیں۔

ذکیہ بی نے بازو کے نیچے سے لپٹی ہوئی گدڑی نکالتے ہوئے کہا۔

"کیا کہوں بہن۔ ؟ تمہارے کہے کا کس قدر پاس تھا مجھے۔ یا روز سوچتی تھی لا کر دونگی، مگر بچے اور ان کے باپ چھوڑیں تب نا۔ اب سو گئے ہیں تو لے آئی ہوں۔ اور اتفاق سے پوسی بھی کہیں باہر گئی ہوئی ہے۔ مگر بہن۔ ! انہیں کہیں اندر ہی چھپا کر رکھنا۔ ورنہ بلی تو پا ہی لے گی اور بچوں نے کہیں دیکھ لیا تو پھر واپس لے جائیں گے۔"

بیگم نے دیوانوں کے سے انداز سے بلونگڑے چھین لے۔

"ارے۔ ! دونوں ہی ! " ان کی آواز میں خوشی کے ساتھ ساتھ حیرت بھی تھی۔

"ہاں ! مجھے معلوم تھا۔ بہن تمہیں بلیوں سے بڑا پیار ہے اس لئے دونوں ہی کو لے آئی ہوں۔ ایک بلا ہے ایک بلی۔ اب نسل چلاتی رہو۔"

ذکیہ بی نے گھبرائی ہوئی ہنسی کے ساتھ کہا۔

بیگم نے اجالے میں ایک تیر چلایا۔

"ان کی ماں تو نامراد ہائے ہائے نہ مچائے گی۔؟"
بہت دیر تک تو ذکیہ بی کو جواب ہی نہ سوجھا، پھر اکھڑے اکھڑے لہجے میں بولیں۔
"بڑے بھی تو خاصے ہو گئے ہیں نا۔" بڑی مشکل سے وہ ہونٹوں تک ہنسی کو گھسیٹ کر لا سکیں۔
"اے بہن۔ اب بڑے چھوٹے کی نہ کہو، ہوتی آخر اولاد ہی ہے.....؟"
ذکیہ بی نے ان کی بات پوری ہونے سے قبل ہی کہنا شروع کر دیا۔
"تو بہن رکھ کہاں رہی ہو انہیں۔؟"
بیگم نے سامنے ہی دالان میں دھرے صندوق کی طرف اشارہ کیا۔ "اس میں ایک گدیلا بچھوا دو نگی، مزے سے رہیں گے۔ اور اس صندوق میں اتفاق سے ایک بڑا سا سوراخ بھی ہے، ہوا جاتی آتی رہیگی۔"
ذکیہ بی جب دسمبر کی کڑکڑا دینے والی سردی میں اپنے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئیں تو ان کے ماتھے اور گردن پر پسینے کے بڑے بڑے قطرے جگمگا رہے تھے۔ ڈگ مگ ڈگ مگ قدموں سے چلتی وہ اپنے پلنگ تک آئیں اور میاں کے بازو پر دھپاک سے گر پڑیں۔
صبح سارے گھر میں ہڑ بونگ مچی ہوئی تھی۔
بچے الگ بدحواس تھے، اماں جان الگ جھنکھاڑ رہی تھیں۔ اور راشد میاں تو ساکت ہی رہ گئے تھے۔ سب سے زیادہ قابل رحم حالت پوسی کی تھی۔ میاؤں میاؤں کر کے سارا گھر سر پر اٹھا لیا تھا۔
بلو نگوڑے آخر گئے تو کہاں گئے۔؟"
بس ایک ذکیہ بی تھیں کہ روز کی طرح ہر چیز سے بیگانہ خاگنہ

بھائی بھتیجی تھیں۔

"بے بی سے پوچھئے ابا۔ ایک دن یہ اپنی سہیلی زرینہ سے کہہ رہی تھی کہ بلونگڑا سے بڑے ہو جائیں گے تو ایک تم کو دیدیں گے۔" شانو بولا۔

"واہ وا۔ ! اچھے ہو جی تم۔" منا بے بی کی حمایت میں بولا۔

"وہ بے چاری تو خود اتنا پیار کرتی تھی، چپ رہنے کو کہہ دیا ہوگا"

"دیکھئے نا بھائی جان۔" بے بی نے اپنا ایک حمایتی پاکر خواہ مخواہ بسورنا شروع کر دیا۔ "ہمیں الزام دے رہے ہیں، خواہ مخواہ۔"

"دادی اماں سے پوچھئے۔ وہ ہمیشہ بولتی تھیں کہ بلونگڑا سے گندگی دیتی ہیں، انہوں نے تو کسی کو نہیں دے دیئے۔ ؟"

"خاموش رہو بے وقوف۔" راشد میاں نے منے کو ڈانٹ دیا۔

"بلی نہ کہیں اٹھا کر لے گئی ہو۔" راشد میاں تھوڑی دیر چپ رہ کر بولے۔

"اے واہ ! سات گھر تو اس نے پھرا دیئے، اب کہاں لے جاتی بھلا۔ ؟ رات میں نے خود چھپر کھوٹ کے نیچے دیکھے۔"

اور انہوں نے بے اعتباری کے انداز سے بہو کی طرف دیکھا۔

"اور میں کہوں اگر خود ہی اٹھا کر لے جاتی تو یوں کلپ کلپ کر میاؤں میاؤں کیوں کرتی۔ ؟"

بات تو واقعی دل کو لگتی ہوئی تھی مگر راشد میاں کی کسی صورت تسلی نہیں ہو پا رہی تھی۔ پھر شک و شبہ سے بولے۔

"کسی بلے دلے نے نہ کھا لئے ہوں۔"

"سردی کے مارے دروازہ تو سارے بند کر لیتے ہیں۔ پھر بلا

آئے تو کدھر سے ؟ روشن دان بھی کھلے نہیں رہتے ۔"

ہر بات کا واضح جواز موجود تھا۔ پھر ؟

"میاؤں ــــ میاؤں ۔ می آؤں۔"

بلی بری طرح چلا رہی تھی ۔ رہ رہ کر چھپر کھٹ کے نیچے جاتی۔ گودام کی طرف دوڑتی ، موری خانے کے چکر کاٹتی اور پھر جا کر گدی کو منہ سے کھینچنے لگتی جو ذکیہ بی نے جہاں کی تہاں پھینک دی تھی۔

"دکھیا کا صبر پڑے ، جس نے بھی اس کا کلیجہ کاٹا ہے ۔"

اماں جان نے کلپ کر کوسا دیا۔

ذکیہ بی بیٹھے ہی بیٹھے سر سے پاؤں تک تھرا گئیں ۔ بچے الگ رنگ کی بولی بول رہے تھے۔ راشد میاں ہر بار نئی بات سمجھا رہے تھے اور اماں جان کوسنوں کی بھرمار کر رہی تھیں ۔ ایک ذکیہ بی کی زبان بند تھی کہ ایک دم سا سں نے ان سے پوچھا۔

"دلہن بیگم ، تم نے کہیں دیکھے ہیں بلونگڑے ۔ ؟"

ذکیہ بی نے اپنی ساری طاقت سمیٹ کر منہ سے آواز نکالی ۔

"میں کسی کے لینے میں نہ دینے میں ، میں کیا جانوں ۔ ؟"

صبح سے اب تک یہ پہلی بات تھی جو ان کے منہ سے نکلی ، ورنہ وہ خاموش ہی تھیں ۔

بلی نے پورے گھر کے چکر لگا ڈالے مگر بلونگڑے ملنے تھے نہ ملے ۔ ہر چار، چھ چھ منٹ کو باہر سے آتی اور چھپر کھٹ کے نیچے گھس جاتی اور ایسی درد بھری آواز سے میاؤں میاؤں کرتی کہ ذکیہ بی کا دل تھرا تھرا اٹھتا ۔

"رانڈا دودھ کے مارے تو تھن بن گئی ہے۔ جانور ہو یا انسان ہو، میا محبت تو اللہ نے سب کو لگادی ہے۔" اماں جان، جو سدا بلونگڑوں کو خیرات کر دینے کے بارے میں لیکچر دیتی رہتی تھیں۔ آج ماتا کی پکار کے آگے سپر انداز ہو چکی تھیں۔

بچے اداس اداس اسکول سدھارے۔ راشد میاں منہ لٹکائے آفس چلے گئے۔ اور اماں جان کا دل اس دن سیون میں نہ لگ سکا۔

لاکھ جانور کے بچے تھے۔ مگر دن بھر اچھل بھاند جو تھی "تاگے کی گھنڈی"، دیکھ پاتے تو اس سے لپٹے پیچھے چلاتے کہ وہ کھیل کھلا کر الجھ الجھ جاتی۔ کترنوں کی دھول دھانی کرتے۔ اتنی چھینکم جھانک کرتے کہ سارے میں کترنوں اور تاگوں کا جال بچھ جاتا۔ اماں جان بھی منہ لپیٹ کر پڑ رہیں۔ پوسی کی پکار نے ان کا کلیجہ ہلا دیا تھا۔

دو بجے پوسی پھر آئی۔ پیشانی کے پاس سوکھا ہوا خون جما ہوا، ناک پر مار کے نشان، منہ ایک طرف سے پھول گیا تھا۔ ایک پاؤں سے لنگڑاتی ہوئی۔ اور گدی کے پاس بیٹھ کر مری مری آواز میں میاؤں میاؤں کرنے لگی۔ یوں جیسے روتی ہو۔

سب اپنی اپنی بولی بول چکے تھے۔ بس ذکیہ بی کی دل کی دل میں رہ گئی تھی۔ سب کی باتیں ٹک ٹک سنتی رہیں اور خاموش بیٹھی رہیں۔ اس خاموشی کا اتنا شدید ردِ عمل ہوا کہ دوپہری سے انہیں سنسنا کر بخار چڑھ آیا۔

ساس نے بہتا دیکھا تو انھیں اور دالان سے اٹھا کر کمرے میں جا لٹایا اور رضائی اڑھادی۔ ایک رضائی سے جاڑا نہ گیا تو دوسری

سی لا اڑھائی۔

بچے اسکول سے لوٹے تو گھر پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ دادی ہمیشہ کی طرح سیون نہیں کر رہی تھیں۔ اور اماں بھی چولہے کی بجائے پلنگ پر منہ لپیٹے پڑی تھیں۔

شانو بڑی اداسی سے بولا "بلونگڑے نہیں ہیں تو گھر کیسا لگ رہا ہے۔ بھائی جان۔!"

منا کچھ نہ بولا۔ دکھ سے سانس لیکر رہ گیا۔ جیسے جی پر بہت بوجھ ہو۔

"ہائے اللہ اپن نے تو نام بھی سوچ لئے تھے۔ تارا اور سورج۔ کیوں بھائی۔ ہاں، وہ پیلے دھبوں والے بلونگڑے کا نام سورج ہی سوچا تھا نا، جو بلا تھا۔؟"

دکھے دل سے منا بولا۔ "ہاں بے بی۔ سورج چلا گیا اور تارا بھی چلی گئی اور اب گھر کیسا اندھیارا اندھیارا سا لگتا ہے۔"

"بڑی عجیب بات ہے کہ چور کا پتہ نہیں چلتا۔" شانو حیرت اور پریشانی سے بولا۔

بے بی کا ننھا دل محبت اور غصے سے چور چور ہو رہا تھا۔ دانت کچکچا کر بولی۔

"اگر مل جائے نا تو کھال سے بندوقیں مار دوں۔"

منا غم سے بولا۔ "ہم تو چراغ کے مالک تھے۔ اس کی ماں کا حال تو سوچو ذرا۔ ایک دن کبھی ابا دیر سے گھر پہنچے ہیں تو دادی اماں کتنی پریشان ہو جاتی ہیں۔"

تینوں خاموش ہو گئے۔ مگر لگتا تھا کہ ان کے معصوم دلوں سے بلونگڑوں کی یاد کبھی نہ مٹے گی۔

"اماں کچھ پتہ چلا۔؟" راشد میاں نے گھر میں داخل ہوتے ہی ماں سے پہلا سوال کیا۔

اماں جان نے اٹکل سے تیر چلایا۔ "جس کے دل کو ماں کی ممتا کا درد ہوئے وہ ڈھونڈھیا کرے۔ ایسا بھی کیا مواکوراپن۔"

اماں کا شبہ آجا کر بہو پہ جا رہا تھا۔ "موئی نامراد زخموں سے چور چور تھی۔"

"کون چور چور تھی اماں۔؟" راشد میاں نے حیرت سے پوچھا۔

"اے وہی تمہاری بلی۔ جانے کدھر کدھر کھوجتی پھیر رہی ہے کہ سارا منہ سجا لائی۔ ناک الگ سوجی ہوئی، پیشانی الگ۔ زخموں زخم۔ خون بھی بہہ رہا تھا۔"

"ہوں۔" ایک بہت لمبی ٹھنڈی سی سانس آپ ہی آپ راشد میاں کے حلق سے نکل پڑی۔

جھٹ پٹے کا وقت تھا۔ گلی کی مسجد سے مغرب کی نماز کی اذان بلند ہوئی۔

شانو سرگوشی میں منے اور بے بی سے بولا۔

"بھائی جان۔! او بے بی۔! چلو مسجد میں چل کر دعا مانگیں کہ اللہ ہماری بلی کے بچے......"

دل برداشتہ بے بی بولی۔ "اللہ میاں ہماری دعا کاہے کو سننے لگے۔"

"سچ سچ۔" منّا گھبرا کر بولا۔ "ایسا نہیں کہتے، گناہ ہوتا ہے۔"
دھڑ دھڑاتے ہوئے وہ تینوں آگے پیچھے سجا گنے لگے۔
"اے ناماردو! یہ کون کھیلنے کا وقت ہے۔؟" پیچھے سے دادی اماں چلائیں۔
آنسوؤں میں تھرتی بے بی کی بے بس آواز آئی۔
"دادی اماں! ہم اللہ میاں سے دعا مانگنے جا رہے ہیں۔"
رات کے نو بجے سردی اپنے زور پر تھی۔ ادھر زکیہ بی کا بخار اپنے شباب پر تھا کہ وہ رضائی پھینک کر اٹھ کھڑی ہوئیں۔ آنکھیں سرخ ہاتھ پاؤں کانپتے ہوئے، بال الجھے الجھے۔
میاں نے ہڑبڑا کر پوچھا۔
"کیا کر رہی ہو۔؟"
"ایسے ہی جی گھبرا رہا ہے۔ ذرا باہر جاؤں گی۔"
"مگر اس وقت اتنی سردی ہے۔؟ تمہیں بخار ہو رہا ہے نا۔؟"
"تو کیا ہوا۔؟" وہ کانپتی آواز میں بولیں اور ملتجی دروازہ کھول کر باہر نکل گئیں۔
دروازے پر اتنی رات گئے انہیں کھڑا دیکھ کر بیگم مرزا حیرت سے بولیں۔
"تم؟ ارے، یہ کیا حال ہو گیا ہے تمہارا۔؟ کیا بات ہے بہن؟ خیریت تو ہے۔؟"
وہ ان کے سوال کو نظر انداز کر کے بولیں۔ "بلو نگوڑے کہاں ہیں۔؟"
"وہیں ہیں۔ کیوں۔؟" پھر ہنس کر بولیں۔ "وہ تمہاری پوسی

آئی تھی۔ شاید بچوں کی بو پا گئی کہ بار بار صندوق کے گرد گھیرے ڈالتی تھی، سر پٹختی تھی۔ میں نے بھگا بھگا دیا۔ بہت ستانے لگی تو غفور نے وہ ایک پتھر ایسے کس کے مارے کہ منہ الگ سوجا اور ٹانگ الگ لنگڑا گئی۔" وہ زور زور سے ہنسنے لگیں۔

"اور بلو نگوڑے۔؟" ذکیہ بی نے ڈوبتی آواز میں پوچھا۔

"وہ۔؟ موئے اداس اداس سے ہیں۔ دودھ دیا بھی مگر منہ تک نہیں لگا رہے ہیں۔ بری بری آواز دل سے رو رہے ہیں۔"

ذکیہ بی نے منت بھری آواز سے کہا۔ "کہاں ہیں وہ۔؟ ایک نظر دیکھ لوں۔؟"

"دو بی، یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہوئی۔؟ یہیں تو ہیں۔"

مرزا صاحب کی اماں دالان کے کونے میں رضائی میں سکڑی 'سو سو' سی سی، کرتی پڑی تھیں۔ دونوں کو صندوق کے پاس جاتا دیکھ کر بولیں۔

"بن ماں کے بچوں کی بھی کوئی زندگی ہے موئی! ماں کی گود کا مزہ ہی کچھ اور ہوتا ہے۔"

کئی سال ایک لمحے میں گزر گئے۔ اسی ایک لمحے میں ذکیہ بی دلہن بنیں، سوتیلے بچوں کی ماں بنیں۔ ڈائن، کوکھ جلی ماں بنیں۔ پھر بہو کی ماں بنیں، اور اب پھر ان کی گود خالی تھی۔

بیگم نے آہستہ سے ڈھکنا کھولا۔

"میاؤں۔ میاؤں۔ می آؤ۔ امی آؤ۔ امی آؤ۔"

پپو جب روتا تھا تو یونہی "امی آؤ،" کہتا تھا۔

بخار سے سنسناتا جسم کانپ اٹھا۔ انھوں نے لرزتے ہاتھوں سے بلونگڑوں کو اٹھالیا۔ چونک کر بولیں۔
"ارے دو ہی دن میں اتنے دبلے کیسے ہوگئے۔؟"
دالان کے پردے کے پیچھے سے مرزا صاحب کی اماں کی آواز آئی۔
"جانوروں کی بات ہے نہ انسانوں کی، سب محبت کا سوال ہے بیٹیا۔ ماؤں سے بچے چھٹیں یا بچوں سے مائیں۔"
ذکیہ بی کچھ نہیں سن رہی تھیں۔ بلونگڑوں کو اپنی چھاتی سے چپٹا کر بولیں۔
"بہن، میں انہیں لئے جارہی ہوں!"
بیگم مرزا کا مزاج جاتا رہا۔ "وہ کیوں بہن۔؟"
منہ سے کچھ کہے بغیر ذکیہ بی جلدی جلدی دروازے کی طرف لپکنے لگیں۔ ان کی خاموشی سے بیگم کا پارہ اور چڑھ گیا۔
"اے واہ! خود ہی دیے اور خود ہی لئے بھی جارہی ہیں۔ کیسی دوغلی زبان ہے بی تمہاری! کوئی یوں دو منہ کا سانپ پالتا ہے اپنی زبان میں۔؟"
دروازے سے نکلتے نکلتے، پیچھے مڑے بغیر تیز، مگر کانپتی ہوئی آواز سے بولیں۔
"تم نے کبھی بچے جنے ہیں۔؟"
وہ بے تابی سے گھر میں داخل ہوئیں۔ بلونگڑے ان کی چھاتی سے چپٹے ہوئے تھے۔
"منے، شانو، بے بی۔ دیکھو بیٹیو، دیکھو میرے بچو، یہ تمہارے کھلونے!"

"بو پاکر پوسی چوکس ہوگئی۔ گدی پر سے جھکولا لے کر اچکی اور بلونگڑوں پر لوٹ پڑی۔ دیوانہ وار چوم چاٹ کر انہیں گیلا کرنے لگی۔

تینوں بچے کسی اندرونی احساس سے متاثر ہو کر ایک دم جاگ پڑے۔ "آہا نارا۔ آہا جی سورج!" نیند بھری آنکھوں سے دیکھ دیکھ کر بری طرح چلانے لگے۔

"اماں جی! اباجی! یہ کہاں سے آئے۔ کہاں ملے۔ کہاں تھے۔" تینوں کے تینوں بلی اور بلونگڑوں کے آس پاس ناچ رہے تھے۔

ذکیہ بی کھڑی کانپتی جا رہی تھیں۔ دونوں ہاتھوں سے اپنا دل تھام رکھا تھا۔

راشد میاں نے اٹھ کر ان کے شانے پر پیار سے ہاتھ رکھ دیا۔

"میں جانتا ہوں ذکا دو دن سے تمہارے دل پر کتنا بوجھ تھا۔"

ذکیہ بی نے گھبرا کر میاں کو دیکھا۔ ان کی آنکھوں سے وحشت برس رہی تھی۔

"ہاں، جب تم بلونگڑوں کو لے کر جانے لگیں تب میں جاگ رہا تھا۔ مگر میں جان بوجھ کر چپکا بنا پڑا رہا۔ اگر میں تمہارا راز کھول دیتا تو میرے بچوں کے بچوں کو کبھی ماں نہ ملتی۔"

سہمے سہمے انداز سے ذکیہ بی راشد میاں کو دیکھ رہی تھیں۔

"میں جانتا تھا ذکا تم بہت دنوں یہ ظلم نہ کر سکو گی۔ میرا ایمان ہے ذکیہ کہ ہر عورت کے دل میں ایک تاریک تہ خانہ ضرور ہوتا ہے، مگر وقت پڑنے پر اس تاریکی میں مامتا کی مشعل ضرور جگمگا اٹھتی ہے!"

"میں ۔ م ۔ م میں ...." جذبات کی شدت کے مارے ذکیہ بی

کے منہ سے الفاظ نہیں نکل پا رہے تھے۔" جب میں پوسی کی پکار سنتی تھی تو مجھے خود اپنی تڑپ اور ماممتا یاد آتی تھی۔ جب میں نے سوکھے مارے بلونگڑوں کو روتے دیکھا تو ..... تو ..... میں نے سوچا کہ ماؤں اور بچوں کے لئے ایک دوسرے کے وجود کس قدر ضروری ہیں۔ میرا دل پھٹ جاتا۔ میں یقیناً مر جاتی اگر میں ....."

راشد میاں نے پیار سے ذکیہ بی کا سر تھپتھپایا۔

"تم جی بھر کر رو لو ذکا۔ آج تمہاری آنکھوں سے جتنے آنسو بہہ جائیں اچھا ہے۔"

"مگر مجھے رونا نہیں آرہا ہے۔" انہوں نے بے بسی سے کہا اور بچوں کی موجودگی کا خیال کیے بغیر راشد میاں کے سینے سے لپٹ کر پھپک پھپک کر رونے لگیں۔

٭

مرغا جو پر پھٹپھٹا کر اڑا تو سیدھا ڈپٹی صاحب کے کندھے پر جا بیٹھا۔ انہوں نے تلملا کر پیچھے دیکھا، نیلم اور پنکی دور کھڑے ہنس ہنس کر دیکھ رہے تھے۔

"کیوں بے نامعقولو، یہ مرغے کو کس نے اڑایا۔؟"

"جی میں نے۔" پنکی ذرا سا پیچھے کو ہٹ کر بولا۔

ڈپٹی صاحب کفن پھاڑ کر چیخے۔ "اور کم بخت بولتا بھی ہے کہ میں نے، ٹھہر تو سہی ذرا، خیر....."

منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے وہ پیچھے پیچھے اور بچے آگے آگے۔ دونوں بھلا کیا ان کے ہاتھ لگنے والے تھے۔؟ یہ بھناتے ہوئے بہو کے کمرے میں داخل ہوئے اور تیزی سے بولے۔

"بیگم صاحبہ سنتی ہو۔؟ تمہارے بچوں نے میرے انگ پر مرغے کو بٹھا دیا۔ جو کبھی گندگی کر دیتا۔؟"

ناہید بغیر بات کی اہمیت کو سمجھے سادگی سے بولی۔

"تو آپ نہا لیجئے۔"

"ہائیں! بس نہا لینا اور کچھ نہ کرتا۔؟"
"بھلا آپ کیا کر لیتے۔؟" وہ سادگی سے آنکھیں اٹھا کر بولی۔
"ارے گندگی جو کر دیتا تو اس نامرادنکی کا گلا دبوچ دیتا۔
"اچھا۔؟" ناہید نے بھولپن سے پوچھا۔
"ہاں اور کیا سمجھ رہی ہو تم۔؟ دیکھ لینا ایک نہ ایک دن میرے ہاتھوں کسی کا خون ہو کر رہے گا۔"
ناہید نے بے بسی سے سسرے کو دیکھا، پھر جھلا کر بولی۔
"پپا آپ سے کئی بار کہا ہے کہ اپنی طرف کا دروازہ بند رکھا کریں۔ آپ سے خود تو ہوتا نہیں، بچوں پہ تہمت دھرتے ہیں۔"
ڈپٹی صاحب نے دیدے گھما کر بہو کو گھورا، پھر چلائے۔
"مجھ سے کچھ ہوتا نہیں۔؟ مجھ سے کیا نہیں ہوتا، ذرا بتانا تو؟"
"اونہہ۔! ہوتا ہو گا بابا بہت کچھ۔ مگر اس وقت تو سراسر آپ کا قصور ہے۔"
"میرا — یعنی کہ میرا۔ یعنی کہ میں نے مرغے کو اپنے ہاتھ سے اپنے کندھے پر بٹھایا اور خود ہی تمہارے پاس شکایت لے دوڑا۔؟"
ناہید کو ہنسی آگئی۔
"اف پپا، آپ بھی غضب کرتے ہیں! میں بھلا یہ کہہ رہی تھی کہ آپ نے اپنے ہاتھ سے مرغے کو کندھے پر بٹھایا۔؟"
"پھر کیا کہہ رہی تھیں۔؟"
"اگر آپ دروازہ بند رکھا کریں تو یہ جھگڑے کھڑے ہی کیوں ہوا کریں۔؟"

"تو مطلب تمہارا یہ ہے کہ سارے جھگڑے محض دروازہ بند کر دینے سے ہی سلجھ جائیں گے۔؟"

"یقیناً۔" وہ سر جھٹک کر بولی۔

"اور جو تمہارے لاڈلے دروازہ دھکیلنا شروع کر دیتے ہیں۔؟"

"کون۔؟ پنکی اور نیلم۔؟" ناہید حیرت سے بولی۔ "ان کی بھلا یہ مجال کہ آپ کے دروازے پر جا کر شور مچائیں۔!"

"ہاں ہاں تو پھر مطلب تمہارا یہ ہے کہ میں خود ہی دروازہ دھب دھپاتا ہوں اور کہتا ہوں کہ بچے پیٹ رہے ہیں۔ کیا باتیں کرتی ہو تم بھی۔؟"

"اُف خداوند! چت بھی میری پٹ بھی میری۔ آپ نے تو پیا جینا دو بھر کر دیا ہے۔ بچوں سے یوں لڑتے ہیں جیسے ان کے دادا نہ ہوں بلکہ برابر کے بچے ہی ہوں۔"

"میں۔؟ میں لڑتا ہوں۔؟"

"پھر کون لڑتا ہے۔؟"

"دیکھو بیگم صاحب میرا منہ نہ کھلواؤ۔ پھر جب بولنے پر آتا ہوں تو کفن پھاڑ کے بولے ہی جاتا ہوں۔"

"آپ نے بولنے میں کمی ہی کیا کی ہے۔ وہ ہمیشہ ہی کفن پھاڑ کر بولتے ہیں۔ کوئی حد ہے۔!"

ابھی ڈپٹی صاحب گرما گرمی میں کچھ جواب دینے ہی والے تھے کہ پچھواڑے کے پیچھے کے باغیچے سے بنز بنز آواز آئی۔

"بولو مٹھو پیارے۔"

"بولو مٹھو میاں ۔"

ڈپٹی صاحب کے کان ادھر ہی لگ گئے۔ ناہید بھی گردن اونچی کر کے سننے کی کوشش کرنے لگی۔ غالباً پنکی کی آواز تھی ۔

"پپا فول ۔ پپا فول ۔"

تیزی سے ڈپٹی صاحب اچھلے اور سیدھے بیٹھ گئے ۔

"منو بیم صاحب ، منو ۔ یہ کم بخت مٹھو کو کیا بولنا سکھا رہے ہیں؟ 'پپا فول ، پپا فول'۔ یہ تمہاری تربیت ہے ۔؟ بڑوں کو یوں کہا کرتے ہیں۔"

ناہید گھبرا کر کھڑی ہو گئی ۔ "مائی گاڈ ۔! پپا میں نے ہرگز ایسی تربیت نہیں کی ۔ یہ تو آپی آپ ....."

"ہاں ہاں آپی آپ ۔ کہہ دو نا میں نے ہی سکھایا ہے ۔"

ناہید نے کچھ رک کر سسرے کو دیکھا ، پھر ملائمت سے بولی ۔

"ہو سکتا ہے آپ ہی نے سکھایا ہو ۔ آپ ہی تو دن رات ہر کس و ناکس کو فول فول کرتے رہتے ہیں ۔ بچوں نے سوچا ہو گا ۔ پپا فول کہتے ہیں ، چلو اپن بھی کہو ۔"

خوں فوں کرتے ہوئے ڈپٹی صاحب لپکے ۔

"ابھی انہیں مزہ چکھاتا ہوں ۔" ان کے پیچھے پیچھے ناہید ہائیں ہائیں کرتی لپکی ، مگر وہ تب تک چھلانگیں مارتے ہوئے صحن میں از چکے تھے ۔

بڑبڑ دھڑ دھڑ کی آواز سن کر ڈرائینگ روم سے سراج نکل آیا ۔ ناہید سیڑھیوں کے پاس کھڑی بے بسی سے ہاتھ مل رہی تھی ۔

"کیا ہوا ۔ ؟" وہ قریب آ کر بولا ۔

"ہوا کیا ۔ ؟ آپ کے پپا نے ناک میں دم کر دیا ہے ۔ کوئی بات بھی

بچوں سے بہاری والوں کا سا سلوک ہے۔"

"اوہو۔!" سراج زچ ہو کر بولا۔" یہ تو روز کی کہانی ہے۔ اس وقت مگر کیا ہو رہا تھا۔؟"

ناہید کو ذرا سی ہنسی آئی۔ "مجھے تو پتہ نہیں کیا ہوا۔ میں بیٹھی ایمبرائڈری کر رہی تھی۔ دندناتے ہوئے آئے اور بولنے لگے، میم صاحب تمہارے بچوں نے میرے انگ پر مرغا ہٹکا دیا۔' ابھی یہ بات نبٹی بھی نہ تھی کہ پچھواڑے سے نیلو اور نیکی کی آواز ان کے کان میں پڑ گئی اور ان کے مرچیں لگ گئیں۔"

"کیوں بچوں نے کیا کہا۔؟"

"مٹھو کو بولنا سکھا رہے ہیں۔' پپا فول، پپا فول۔"

ناہید نے ہنس کر میاں کو دیکھا۔

"کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ آخر پپا کب تک یہ دشمنی نبھائیں گے حد ہے کوئی۔"

"الگ گھر کیوں نہیں کر لیتے۔؟" ناہید تیزی سے بولی۔

"جانے کیسے پپا ہیں، حیران کر کے رکھ دیا ہے۔"

بات کیا ہوتی، سراج میاں ماں کے بعد باپ کے ہی ہاتھوں پلے۔ جب باپ نے بیک وقت ماں اور باپ بنکر پالا ہو تو محبت کا کیا پوچھنا۔ بالشت برابر کے کیڑے تھے، تب سے بہو کا ارمان تھا۔ پڑھایا، لکھایا۔ پالا پوسا اور بیٹے کو شیر جیسا بنا دیا۔ ڈپٹی تھے، رسوخ سے کام لیا، کچھ لیا کچھ دیا اور بیٹے کو پانچ سو کی سروس پر چڑھا دیا۔

باپ دورے پر تھے ۔ بیٹے اپنی سروس پر۔ آخر کو آدم تھے، حوا کی تلاش تو ہوئی ہی تھی ۔ آدم نے تڑپ تلک کر اپنی پسلی سے ایک حوا برآمد کر لی تھی، انہوں نے پسلی کو چیر نے پھاڑنے کی ضرورت نہ سمجھی، اوپر والے صاحب کی تیز طرار، کانونٹ کی پڑھی لکھی ۔ فارورڈ بٹیا ناہید سے چپکے چپکے شادی رچا ڈالی ۔

ہر بار باپ بیٹے سے ملنے آیا کرتے تو گھر میں وہی اکیلے مردوں کا سا سونا پن ہوا کرتا ۔ کمرے میں ادھر ادھر، یہاں وہاں سگرٹوں کے ٹوٹے، ماچس کی تیلیاں، راکھ ۔ پھٹے ہوئے کاغذ ۔ کھونٹیوں سے لٹکتے کپڑے، کچھ میلے ۔ کچھ اجلے ۔ ٹائیاں میز پر، جوتے کرسیوں پر اور وہ اس کے عادی ہو چکے تھے ۔ اب کے سے جو ملنے لوکا یا ہی کلپ دیکھی ۔ سب سے پہلے جو پھاٹک سے داخل ہوئے تو آنگن اور برآمدے کو ملانے والے دروازے میں ہرے رنگ کا پردہ اڑ رہا تھا جو نک کر دید سے جھپکا جھپکا کر دیکھا ۔ پھر نظر اٹھی تو سامنے بیٹے کا کمرہ پڑتا تھا داخل ہوئے تو سارا سامان سلیقے قرینے سے سجا سجایا ۔ اب وہ جوتے کہاں تھے جو کرسیوں پر دلتے ہرتے تھے ۔ میزوں پر پڑی رہنے والی ٹائیاں ہینگر میں لٹک رہی تھیں ۔ سگرٹوں کے ٹوٹے جمع کرنے کی جھلمل کرتی الیشٹرے میز کے بیچ رکھی ہوئی تھی ۔ اور الیشٹرے کے نیچے ہلکے کریم کلر کا ٹیبل کلاتھ ۔ جس پر بہترین اور نفیس امبرائڈری اور پھر تو نظر اٹھانے کی بھی کیا ضرورت رہ گئی ۔ وہ تو آپ ہی آپ، اپنے آپ اٹھتی ہی چلی گئی ۔ وہ کپڑے جو سدا یہاں وہاں جھولتے رہتے تھے ۔ اب اپنے جائز مقام پر پہنچ چکے تھے ۔ ناول رسالے، جو ادھر ادھر بکھرے رہتے

تھے، کولے بیں شیلف میں رکھے ہوتے تھے۔ وہ یوں حیران نگاہوں سے ماحول کا جائزہ لے رہے تھے کہ پردہ ہلا۔ پردہ ہٹا تو یہ دیکھنے بھی نہ مگر وہ سنہری چھلے، جن میں پردہ اٹکا ہوا تھا، کھن کھنائے اور انہیں تو چونک ہی جانا پڑا۔ اس جنت کی سیر پوری ہوئی بھی نہ تھی کہ ان کی نگاہیں اٹھیں اور جیسے جنت کی حور نکل آئی پردے کے پیچھے سے۔

"تو جنتی جنت کی تو سنتی ہی، حور کبھی آ ہی گئی۔" انہوں نے دل ہی دل میں سوچا۔ آتے ہی پٹ سے بولی۔

"ارے پپا آپ۔ ارے بیٹھئے نا۔ سراج نے مجھ سے آپ کا بار بار ذکر کیا ہے۔ آپ کی تصویریں بھی بنائی ہیں اور دیکھئے ہم نے آپ کی بڑی تصویر یہاں لگا بھی رکھی ہے نا۔"

اس کی انگلی کی گردش کے ساتھ ان کی آنکھ بھی گردش میں آئی اور دیوار پر دیکھا کہ وہ دو ہرا جان ہیں بیٹھے ہوئے! جھینپ کر انہوں نے خود کو دیکھا۔ بھلا وہ کب ہنس رہے تھے۔

"آپ بیٹھئے تو، میں اتنے میں آپ کے نہانے کا انتظام کر ڈالوں۔ ارے سراج میاں کدھر جا مرے ہیں۔ یہ تو آپ ہی آپ سب مرحلے لے کئے جا رہی تھی۔ ہونہہ پپا۔ میں کب اس کا باپ ہوں۔؟ اور یہ میرے گھر میں یوں راڈی کیوں گھوم رہی ہے۔؟ لاحول ولا قوۃ! آج کل کی لڑکیوں کو شرم حیا ہے کہ نہیں۔؟ آخر ہماری بھی مائیں بہنیں تعلیم گلشن پڑھی تھی، باہر کی دنیا بھی دیکھی تھی، مگر پہلے تیرا میرا گھر جا تھی ہوتی تھیں۔ آنے دو بچہ کو، ابھی خبر لاتی ہوں۔ ہونہہ، یہ سردیں ہو رہی ہے۔!"

ابھی یہ غلط ال پہچان ہی تھے کہ سر پر وہ چھن چھنایا اور وہ پری پیکر نمودار ہوئی۔

"ہائی گریشس!" سینے پر ہاتھ لے جاکر بولی، "آپ ابھی تک بیٹھے ہی نہیں۔؟ میں تو آپ کے لئے پانی بھی لگوا آئی۔ سراج آتے ہوں گے۔ بیٹے شیو کر رہے تھے، بھلا آپ کے سامنے یوں کیسے چلے آتے۔؟"

واہ، بے باکی سے ہنسنا تو دیکھو۔ اور سراج کا ذکر یوں کرتی ہے جیسے ساتھ کا کھیلا ہو۔ ارے بھئی کرنا دے عمر بھر شیو، تمہیں کیوں فکر ہوتی ہے۔؟

بیٹھے پیچ و تاب کھاتے رہے کہ ذرا کم بخت کو آ جانے تو وہ پھر دیکھتا ہوں۔ کم بخت آیا تو اس ہیبت کے ساتھ کہ نگاہ نیچے سے اوپر نہ ہوتی تھی، اور پہلے تو آنے کی خبر پاتے ہی لپکا چلا آتا تھا۔ سلام دعا تو دور رہی، دیکھتے ہی للکارے۔

"کیوں میاں کس کنکالہ کو پکڑ لائے۔؟"

"کنکالہ۔؟" بیٹے کے دیدے الٹے بیدھے گھومے، حلق کا تھوک بمشکل اندر گیا، کھنکارے اور بولے۔

"وہ — وہ تو جی۔ آپ کی بہو ہے۔"

"ہائیں۔! بہو۔؟"

بس یہی دو الفاظ ان کے منہ سے نکلے اور پھر جو چپکی لگی تو زبان کھلی ہی نہیں۔ دھاں پھوں۔ دھاں پھوں کرتے سارے میں پھرا کرتے۔ وہ تو کلو سے نے ساری رہ داد سنادی کہ کیسے میاں جی بٹیا کے "مسک" میں پھنسے۔ کیسے بڑے صاحب نے بٹیا کو "آجادی" دے رکھی

ہے کہ جو چاہے کرتی پھرے۔ رہا ڈپٹی صاحب کا معاملہ، تو دوسری بات تھی۔ بٹیا تو اچھی تھی ہی، مگر چراغ لے کر ڈھونڈنے تب بھی ایسا داماد نہ ملتا۔ اگر داماد مل بھی جاتا تو ایسا نہ ملتا جو بٹیا کو اتنی چاہت سے بیاہ لے جاتا۔ اکلوتی اولاد کو اکلوتے باپ کی ذرا تو یاد نہ آئی۔ اور سبھی بوڑھوں کا کیا ہے۔ صرف سہرا دیکھ لینے سے ایسا کون ارمان پورا ہو جاتا ہے۔ ؛ اصل چیز تو "گھر" زندگی ہے، سو کبھی نہ کبھی دیکھ ہی لیں گے۔ سو آج دیکھ رہے تھے۔!

کس کا بیٹا۔ ؛ کہاں کی بہو۔ ؛ جو حالات کا پتہ چلے۔ اور حالات بھی ایسے، تو کیا ہی ٹھیرے ؛ جیسے آئے تھے ویسے ہی چلے گئے۔ وہ تو ڈپٹی صاحب کا اتنا کا تھا، اپنے زمانے میں اچھے اچھوں کے تین پانچ کر دیئے۔ بیٹے کو کیا خاطر میں لاتے۔ ! مگر میرا ہوتا دیکھے گا، باپ بیٹے پھر آن ملے۔ اور اب تو لنڈ منڈ، گول گول پوتا بھی ساتھ آیا۔ جب ایک ہی شہر میں دونوں کی سروس چلے تو الگ گھر کیسے رہ سکتے ہیں۔ ؛ اور پھر باپ کی پنشن ہو گئی تو جاتے بھی کہاں۔ ؛ رہتے تو یہیں تھے، مگر سدا انگاروں پر چلا کرتے۔ اپنے وقتوں میں انہوں نے انگلش بگھاری تھی اور صاحب لوگوں کی دنیا دیکھی تھی۔ مگر وہ جو پرانے وقتوں کی خو بو تھی تو جاتی کیسے بہو بیٹے کا کیا حال تھا کہ بس توبہ۔!

اس طرف سسر کا کمرہ، اس طرف بہو بیٹے کا۔ دنیا نے کیا ترقی کی کہ ساری شرم حیا ہی جاتی رہی۔ بیٹے آفس کو جا رہے ہیں اور علی الاعلان میم صاحب سے کہہ رہے ہیں۔ "واہ صبح دا۔ آج تو الوداعی "کس" دیا ہی نہیں۔" اور پھر چٹاخ پٹاخ شروع ہو جاتی۔ "ارے نامعقول"

یوں پیار کرنے کو کون منع کرتا ہے۔ مگر ذرا یہ تو سوچ لو کہ دیوار آر ڈھا بڈھے باپ کا کرد ہے۔ لاحول ولا۔!"

ڈپٹی صاحب کا دل کبھی پھر بیٹے سے نہ مل سکا۔ پوتا تھا وہ الگ گنوں کا نورا۔ ایک آیا سدا اس کے ساتھ لگی رہتی، مگر وہ جب دیکھو تب دادا کے کمرے کو گھس آتا۔ ماں باپ پپا پپا پکارتے تھے۔ سو آپ بھی دادا کو پپا کہنے لگ گیا۔ ان کی نماز کی جگہ، قرآن شریف، جاء نماز، سب الگ تھلگ کونے میں ہوتی۔ یہ جاتا اور عین جگہ موت کر آجاتا۔ بھوسے تو باپ مارے گا پر تھا۔ نام تو کبھی لیا ہی نہیں، ترقی پسند گھرانے کی بٹیا کو سوائے میم صاحب کے اور کیا کہہ کر پکارا جاسکتا ہے۔ پھنسنے کی خطا پر پھر یاد آئی۔

"دیکھو میم صاحب تمہارے بچے نے جا نماز پر پیشاب کر دیا۔"

"پپا،" وہ بڑی منت آوازسے بولتی، "بیچارے نے سکھا تو نہ دیا ہوگا۔"

"اور کہاں میں نے سکھایا ہے۔؟" الٹ کر وہ ہر بار یوں ہی جواب دیا کرتے۔

بھوبیٹے تو جیسے تھے سو تھے۔ پوتے ... ان کا کیا حق چلا۔؟ مسلمانوں کا گھرانا اور نام دیکھو کیا الٹ پلٹ رکھ چھوڑے تھے۔ ایسا کیا اب سوائے پنکی کے دنیا بھر میں کوئی نام ہی نہ تھا۔

اور تو اور جب وہ کسی کی گڑیا جیسی بچی پیدا ہوئی تھی کلو کے ہاتھوں، کہلوایا کہ مریم نام رکھیں۔ نہیں صاحب وہاں تو وہی ہوگا جو جی میں آئے گا۔

"اے کلوے تو کیا جانے رے نام وام ؟ (یہ بیٹے صاحب فرماتے تھے) اس کی آنکھیں تو دیکھ کیسی نیلی نیلی ہیں ۔ بس اس کا نام تو نیلم ہی ہوگا ۔"

دادا نے مارے غصے کے کبھی نیلم پری سے ہٹ کر کچھ نہ کہا ۔ یوں بات ہی کیا کرتے ۔ ؟ جو کبھی شکایت کا موقع آتا تو بس نیلم پری ہی بول جاتے ۔

اپنے کام میں مگن رہتے ۔ دن بھی گزر جاتا پڑھنے لکھنے میں ، رات بھی ۔ اب جو پنشن ملی تو گویا مرنے کا پروانہ آگیا ۔ اب تو سارا سارا دن گھر ہی پڑے رہتے کبھی یہ کتاب الٹ رہے ہیں ، کبھی وہ رسالہ کبھی پرانے پرانے دوستوں کے خط نکال نکال کر پڑھتے تو کبھی طالب علمی کے زمانے کی تصاویر لے کر بیٹھ جاتے ۔ کلوا بار بار یاد کیا جاتا ۔

"ابے دیکھ ، یہ جب کی تصویر ہے کہ میں بیس سال کا تھا ۔"

"تو نے پہچانا یہ کون ہے ۔ ؟ ابے میں ہی تو ہوں ۔ ڈرامے میں میں بادشاہ بنا تھا ۔"

یوں ڈھیر سارا الم غلم آس پاس دکھائی پڑے تو بھلا بچوں کو چین کیسے آئے ۔ ؟ ادھر سے نیکی ، ادھر سے نیلم ، کبھی یہ اٹھائیں ، کبھی وہ پٹخ دیں ۔

"میم صاحب سے بولو اپنے بچوں کو بلوائیں ۔ میں الٹے ہاتھ کی جھاڑ دونگا ۔ ہاں ۔"

"میم صاحب سے کہہ دو ، رونے چلانے کی آواز آئے تو پھر دوڑتی نہ آئیں ، ہاں ۔"

اور کبھی ایسا ہو جاتا کہ دادا جی نے دانت پیس کر ایک آدھ جما ہی دی، ادھر سے سراج دوڑا آتا، ادھر سے ناہید بلبلاتی ہوئی نمودار ہوتی۔ سراج تو بگڑے تیور دیکھ یونہی ٹھٹک جاتا، ناہید ماں کا دل لئے لئے کانپ جاتی۔

"پپا، کوئی حد ہے۔ گال تو دیکھیے کس قدر لال ہو رہا ہے۔"

یہ ایسا طعنہ چھوڑتے۔ "باپ گورے، ماں گوری، اولاد کیوں ڈھینڈر کے ایسی آئے۔ وہ تو گال ہی خود بخود لال ہیں۔"

ناہید پاؤں پٹختی چلی جاتی تو یہ ہاتھ جھلا جھلا کر وارننگ سی دیتے۔

"بچو! جواب کے آئے تو یاد رکھنا، ہاں، خون نکل پڑے گا منہ سے۔"

چیلیں جوں گوشت پہ منڈلاتی ہیں یہ دادا پہ منڈلاتے۔ ادھر ان کا بھکی ٹپارہ کھلا کہ دونوں موجود۔ دادا کی جھڑکی گھرکی سن ہی رہے ہیں اور شرارتیں کر ہی رہے ہیں۔ اور بڑے میاں آجا کے "میم صاحب، میم صاحب" کرتے دوڑے جا رہے ہیں۔

"میم صاحب تمہیں اپنے کام دھام سے فرصت ہو تو ذرا دیکھ جاؤ کہ ان نامعقولوں نے میری داڑھی کی کیا گت بنا رکھی ہے۔"

دادا کو تو داڑھی رکھنی قیامت ہو گئی۔ آجا کے کم بخت داڑھی کی شامت۔ نیلم تو اسے چھوٹی موٹی جھاڑو ہی سمجھتی۔ کئی بار اصرار ہو چکا تھا کہ وہ سفید کالی جھاڑو ان کے استعمال کو دے دی جائے، مگر پپا سنتے کب تھے۔

"سنا میم صاحب تمہاری نیلم پری نے میری داڑھی مٹھی میں پکڑ لی۔

آخر تمہارے ہاں تہذیب۔ تربیت سکھائی جاتی تھی کہ نہیں۔ ؟"

"پپا۔ ؟ بائی گاڈ میں آپ کی تسکا پٹیں سنتے سنتے بور ہو چکی ہوں۔ دیکھ لیجیے گا ایک آدھ دن میں خودکشی کر لوں گی۔"

"تم سے پہلے میں کیوں نہ کر لوں۔ ؟" اور جب وہ تیز تیز قدموں سے صحن میں کھدے کنویں کو دوڑنے تو خیال آتا کہ پہلے اپنی کتابیں تو سمیٹ لوں۔ کون جانے میرے مرے بعد پوتا پوتی کیا حشر کر دیں ان کا۔ ؟ کتابیں سمیٹتے، رکھتے۔ قفل لگانے تک مرنے کا خیال اچھا خاصا دور ہو چکا ہوتا اور پھر ایسے شیطانوں کے پیچھے مرنا اور وہ بھی خودکشی کرنا، کس قدر ردیسی بات تھی۔ ان سے تو گن گن کر بدلے لینے کو کئی سو سال زندہ رہنا چاہیے۔ ہاں، یہ ہوئی نہ کوئی بات۔

دو چار مہینے میں ہی پتہ چل گیا کہ پوتا پوتی سے تو دل ملتا نہیں، اور وقت تو کاٹے سے کٹتا نہیں۔ بیٹے بہو سے تو آگے ہی دل میلا تھا۔ کم بخت پنشن بھی کیا موقعے سے ملی تھی۔ اس دن ٹہلتے ٹہلتے صدر گئے آتے آتے دائیں ہاتھ میں پنجرہ لٹکا لائے۔ پنجرے کے اندر میاں مٹھو براجمان ہرے ہرے پر، لال لال چونچ، بیچ میں لگی بیج پر ادھر سے ادھر۔ ادھر سے ادھر صحید کے چار رہے تھے۔ ابھی صحن تک کے اندر داخل ہوئے بھی نہ تھے کہ ٹیں ٹیں، ٹائیں ٹائیں کی آواز سارے میں بچ گئی۔ ناہید نے سویٹر بنتے بنتے سر اٹھا کر دیکھا۔ کمرے کی میں پر وہ جھول رہا تھا۔ اٹھ کر آئی۔ دیکھا تو سسرے مٹھو سنبھالے چلے آ رہے ہیں۔

"ہونہہ ! اب مٹھو سے دل بہلا ئیں گے۔" اس نے جل کر سوچا اور پھر سے آ کر صوفے میں دھنس گئی۔ نیلم پری اور نیکی کسی معرکے

کو سر کرنے میں جٹے ہوئے تھے۔ نئی نواڑی آواز جو سنی تو ادھر ہی لپکے آئے۔

"ارے پپا یہ کیا ہے۔؟"

"پپا اسے کیا بولتے ہیں۔؟"

"ارے پپا ـ ـ ـ ـ ۔"

"تمہارا سر۔!" وہ جل کر بولے۔

"ہمارا سر؟ پھر ہمارے سر کو کیا بولتے ہیں۔؟"

کلوا پگڑی سے ہاتھ پونچھتا برآمد ہوا۔

"ارے مالک یہ مٹھو کاہے خرید لائے۔؟"

(ہوں تو مٹھو نام ہے اس چڑیا کا۔؟)

دونوں آگے پیچھے ڈرائینگ روم کو دوڑ گئے۔

"ڈیڈی، ممی، پپا مٹھو لائے ہیں۔!"

"پپا مٹھو لائے ہیں۔!"

اب ڈپٹی صاحب خالی وقت میں مزے سے مٹھو کو باتیں کرنا سکھاتے رہتے۔

"مٹھو میاں کو روٹی چاہیئے۔"

"مٹھو میاں کو غصہ آ گیا۔"

"ڈپٹی صاحب، مٹھو کو پانی پلائیے۔"

بیچ بیچ میں نیکی اور نیلم گھس گھس کر اپنی ٹانگ اڑاتے۔

"نیلم بی بی مٹھو کو روٹی کھلاؤ۔"

"نیکی صاحب، مٹھو میاں کو غصہ نہ دلائیے۔"

"تا" ویں آکر ڈپٹی صاحب نے مٹھو کو سکھا دیا۔
"نِکی فول، نیلم پری نا معقول۔"
نِکی نے جوابی کارروائی شروع کر دی۔
"مٹھو پیارے بولو، پپا فول، پپا فول۔"
آدھی بات مٹھو کے منہ میں، آدھی بات نِکی کے منہ میں تھی کہ پپا اٹھے اور پوتے پر ایک تھپڑ پڑتے پڑتے بچا۔ ڈپٹی صاحب کا تھا۔ آگے آگے نِکی، پیچھے پیچھے پپا۔
دونوں بھاگتے سراج کے کمرے کے سامنے سے گزرے تو اسے قہقہہ لگاتے ہی بن پڑی۔ بیٹے کے ہنسنے پر ذرا اپنی پوزیشن کا خیال آیا تو دھیرے سے چھڑی کا رخ اپنے کمرے کو ہو لیے۔
"نامعقول کہیں کے۔" انہوں نے دروازہ اپنے پیچھے بند کرتے ہوئے دل کی بھڑاس نکالی۔
ایسے بیہودہ بچے تھے کہ مٹھو کو چین نہ لینے دیتے۔ اچھا یہ بات دیکھوں گا بچو جی۔ اِدھر آئے تو ٹانگ ہی توڑ ڈالوں گا۔"
کلوا ناشتے کے لئے انڈے خرید کر لایا تو ڈپٹی صاحب کی نیت میں فتور آ گیا۔ ایسے بڑے بڑے انڈے! واہ بھئی واہ، بچے نکلنے چاہئیں۔ ایسے انڈے تو بس لیگھارن مرغیاں ہی دے سکتی ہیں۔ یا پھر منارکا۔
"چلو انڈے بٹھاتے ہیں۔"
بیکار آدمی کا دماغ تو یوں ہی شیطان کی دوکان ہوتا ہے۔ انہیں کام تھا بھی کیا۔ آپ نہ پوچھو خود ہی انڈے خریدنے چلے۔

اکیس انڈے ، ان پر بٹھانے کو ایک کر دی مرغی۔ اب نکلیں گے بچے اور ترسیں گے وہ بے ہودے سراج زادے۔

مرغی کی وہ وہ خاطر ہوتیں کہ بس اپنی بیگم کی ہی کی ہوں گی جب کہ وہ خود بچہ دینے والی رہی ہوں گی۔ روزانہ انڈوں کی گنتی ہوتی ... ہونے، جاگنے، کھانے پینے کا خیال رہتا۔ جب تک یہ دانہ ... بیٹھے انڈوں کی رکھوالی کرتے کہ نیکی اور نیلم بری انڈوں کو خرد برد نہ کر دیں۔ کان لگا کر سننے کی کوشش کرتے رہتے کہ اندر چوں چوں تو نہیں ہو رہی ہے۔؟

اکیسویں دن تو سچ مچ ہی چوں چوں، چیں چیں کی آواز سنائی دینے لگی۔ بس خوشی کا عین بین وہی حال تھا کہ جیسے سراج میاں پیدا ہوئے ہوں۔ مرغی تو خود بھی اپنے بچوں کے حق میں شیرنی ہوتی ہے۔ مگر یہ کیا کم تھے۔ پیلی اٹھا کر نہ لے جائے، اس مارے آگے پیچھے ہی رہا کرتے۔ یہ چیل کے بہانے شکرا ہو کر رہ گئے۔

"اب جلیں کمبخت چوزے دیکھ دیکھ کر۔" وہ دانہ چگانے چگاتے مزے سے سوچتے۔ بچے کس کی ماننے والے تھے۔ ڈیڈی ممی ٹال مٹال کرتے ہی رہتے اور یہ دادا کی گود میں گھسے ہی جاتے کسی چوزے کی دم پکڑ کر اچھال دی، کسی کو اینٹ دے دی۔ دادا کو دق کرنے کسی کو پنجڑے سے باہر نکال کر دیا، کسی کو باغ کی راہ بتا دی کہ کھودتے رہو اور دادا جی کو جلاتے رہو۔

ایسی بے ہودی ماں تھی۔ یہ مرغی بھی۔ سارے بچوں کو لے کر باغ میں گھس جاتی اور پنجوں سے ساری زمین کھودنی شروع کر دیتی۔ ماں

کی قیادت میں بچے بھی کھود اکھاڑی شروع کر دیتے اور اور ڈیڈی صاحب کا ناک میں دم آجاتا، ہنکالتے ہنکالتے۔
مرغیوں کو بند کرتے تو اکھڑے اکھڑے پودے اور نچی بچائی گھاس دعوت دیتی کہ آ دمیاں ہمیں قرینہ دو۔ پائنچے کھولیں، آستینیں چڑھا یہ لوگ گارڈننگ پہ تل جاتے۔ بیچ بیچ میں پنکی اور نیلم پری اپنی خدمات پیش کیے جاتے۔
"پپا، لایئے گڑھا ہم کھود دیں۔"
"لایئے زمین کھرپ دیں۔"
باپ کی طرف سے ایسا غصہ دل میں بیٹھا تھا کہ کسی بات کا ٹھیک سے جواب نہ دیتے۔ رہ رہ کے ممی کو طعنے پڑتے اور خود بچوں پہ گالیاں مٹی میں سنے ہوئے ہاتھ جھاڑتے ہوئے اٹھتے تو پامسٹری کی کتابیں لے کر بیٹھ جاتے۔ اب بڑھاپے میں پامسٹ بننے کا شوق چرایا تھا۔
ایک دن کتابیں الٹتے پلٹتے بیٹھے تھے کہ دونوں جان پہ نازل ہو گئے۔
"پپا یہ آپ دن بھر کیا پڑھتے رہتے ہیں؟" پنکی بولا۔
"اور جھک جھک کر ہتھیلی میں کیا دیکھتے رہتے ہیں؟"
نیلم پری تو بس پنکی کے نقشِ قدم پر چلتی تھی۔
"تمہارا سر!" ان کا سدا ایک ہی جواب ہوتا۔
"واہ، آپ کی ہتھیلی میں ہمارے سر کہاں سے آئے بھلا؟"
پنکی حیرت سے بولا۔
"پپا جھوٹ بولتے ہیں۔" نیلم نفرت سے بولی۔
اور جیسے انہیں قائل کرنے کو پنکی بولا۔ "سعید انکل سے

آپ کہہ رہے تھے کہ شیں کر ہاتھ دیکھ کر آگے کا حال بتلاتے ہیں۔"
اس نے شرارت سے اپنی ہتھیلی بڑھا کر کہا۔ "پپا کل میں کیا کرونگا۔؟ بتایئے تو۔"
دادا نے گھور کر ہتھیلی کو دیکھا اور بولے۔ "ڈنڈے کھانے کی آ رہی ہے کیا۔؟"
نیکی ہتھیلی بڑھائے ہی تھا تو دانت آچکا کر بولے۔" کل تو آپ مٹھائی کھائیں گے جناب، امی ای۔"
دوسرے دن نیکی اور نیلم صبح ہی صبح اٹھ بیٹھے۔ دادا کی کہی بات تو پوری ہونی ہی تھی۔ دونوں ان کے کمرے میں گھس گئے۔ دادا جان ناشتے کے لئے اوولٹین، بسکٹ اور مسکہ سلائس لاکر رکھتے ہی تھے، دونوں نے انہیں بالکل سچا پامسٹ بنا دیا اور سچولی خبانے کو ان کے پاس پہنچ بھی گئے۔
"پپا آپ تو سچ مچ ہی سچا سچا حال بتاتے ہیں۔"
انہوں نے چشمے میں سے گھورا۔ نیلم نے بات کی وضاحت کر دی۔
"کل آپ نے کہا تھا نیکی کہ مٹھائی کھائیں گے۔؟ آج تو سچ مچ کھالی۔ وہ آپ کے کمرے میں کریم بسکٹ۔ جیلی اور مکھن تھا کہ نہیں۔"
پپا لپک کر اٹھے اور جا کر الماری کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ قسمت کا حال کتنا سچا بتایا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ ڈرائینگ روم کے دروازے میں سرخ سرخ آنکھیں لئے جنگھاڑ رہے تھے۔
"ہم صاحب تمہارے صاحب کی تنخواہ پورے ساڑھے سات سو ہے۔ اپنے لاڈلوں سے کہو اپنے باپ کا کھائیں۔ باپ کے باپ کا کیوں

کھا جاتے ہیں۔؟"

"کیا ہوا پپا۔؟" وہ پلو سنبھالتی ہوئی بولی۔

"تمہارا سر! ایک سرے سے سارا خانوادہ ہی اوندھا ہے۔ شوہر دیکھو تو اس رنگ کے۔ بیوی دیکھو تو اس رنگ کی، اور بچے دیکھو تو ایسے۔ آخر تم لوگ مجھے جینے دو گے کہ نہیں۔؟"

"ہم نے بھلا کیا منع کیا ہے آپ کو جینے سے۔؟"

"ہاں ہاں تو میں خود ہی گویا مرنا چاہتا ہوں نا۔" ان کی اس طرح کی الٹ پلٹ باتوں سے ناہید زچ آچکی تھی۔

"میری کسی چیز کو چین نہیں۔ کمرہ دیکھو تو کباڑخانہ۔؟ باغ دیکھو تو اگھل پچھل۔؟ مرغیاں دیکھو تو پرپچی۔؟ مٹھو دیکھو تو گالیاں سکھا رکھی ہیں بے ہودوں نے۔؟ بلی دیکھو تو لنگڑی۔ آخر یہ سب کیا ہے؟" وہ چیخ کر بولے۔

ناہید نے کچھ جواب نہ دیا تو جھلا کر بولے "یہ تعلیم یافتہ گھرانے کی ماں ہے۔ ہونہہ۔! بچوں سے یہ تک نہیں سکھایا کہ بڑوں سے کیسا سلوک کرتے ہیں۔ نا معقول کہیں کے۔"

سراج ان کے پیچھے ہنستا ہوا نکلا اور بیوی سے بولا۔

"کیوں برس رہے تھے پپا۔؟"

ناہید الجھ گئی۔ "خوب ہیں آپ کے پپا بھی۔ کوئی بات سی بات ہو۔ جانے کیوں گرم رہتے ہیں ہر دم۔؟"

"ارے ڈارلنگ میں نے ستر بار تم سے کہا ہے کہ بوڑھے آدمی ہیں۔ ان کی بات کا نوٹس نہ لیا کرو۔ دراصل میں نے تو میرج کر کے انہیں مستقل

ناراض کر دیا۔ ویسے برے آدمی نہیں ہیں۔ یقین کرو۔"

"بڑے اچھے آدمی ہیں۔ بیچ کھیلنے کر دیا ہے میرا تو۔" سراج ہنس دیا۔

"چپ اوپر سے تایا کو ایسا کرتے ہیں۔ بیچ بیچ تھوڑا ہی کرتے ہیں۔"

"ہاں آپ تو اپنے پیا کی سائیڈ لیں گے ہی۔ تایا کو کبھی کوئی اتنے سالوں تک غصہ تنا یا کرتا ہے۔ شادی ہو گئی، بچے ہو گئے۔ بچے باتیں کرنے لگ گئے اور جناب کا غصہ ہی نہیں اتر چکتا۔ ابھی تو جان ضبط میں ہے۔ آپ تو ٹھیرے باہر کے آدمی، دن بھر گھر میں وہ ہلہ مچا رہتا ہے ادھر مرغیاں کڑ کڑا رہی ہیں، ادھر سے مٹھو نے، مٹھو پیارے، کی رٹ لگا رکھی ہے۔ بلی میاؤں میاؤں کرتی لپک رہی ہے تو مرغے وقت بے وقت اذانیں دے رہے ہیں۔ اچھا خاصہ انیمل فارم کھول رکھا ہے آپ کے پیا نے تو۔"

سراج ہنستے ہنستے دوہرا ہو گیا۔ ادھر پچھواڑے سے ابھی تک ڈپٹی صاحب کے کڑ کڑانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

اب کبھی ہیکی اور نیلم بی بی ڈپٹی صاحب کو ستانے آ نکلتے تو وہ کبھی بہرے بن جاتے، مزے سے مگن رہتے۔ باجری اور جواری کی کونی مرغیوں کو چگاتے رہتے۔ دونوں پیچھے سے مرغیوں کو ایسے ہنکاتے کہ کبھی تو پیا کے کندھے پر کبھی سر پر۔ اس وحشت میں کوئی نہ کوئی مرغی بے خطا ہو جاتی اور پیا بے چارے گویں نہا جاتے۔ دیدے سرخ کر کے پیچھے لپکتے، تب تک دونوں اڑنچھو ہو جاتے۔ باغبانی کرنے کو کیاری میں پہنچتے تو جھارے سے جا بے جا پانی انڈیل دیتے۔ مٹھو کو باتیں کرنی سکھلاتے تو دونوں گالیاں سکھلانے تیار ہو جاتے۔ کتابیں لے کر

بیٹھتے تو پیچھے سے کرسی کو دھکے دیتے کہ بس کتابیں رکھتے ہی بن پڑتی۔ کبھی بلی کو پیار کرنے کا موڈ سوار ہوتا تو نامراد اس کی دم کھینچ کر ہنگامہ کھڑا کر دیتے۔ ڈپٹی صاحب کی جان زچ آ چکی تھی۔

اس دن سہ پہری کو نا ہید اپنے کمرے میں لیٹی ہوئی تھی۔ سراج آفس کا کوئی اہم کام کر رہا تھا۔ ڈپٹی صاحب حسب معمول اپنی اسٹیٹ میں جتے ہوئے تھے اور پنکی اور نیلم باغ میں روند ن مچا رہے تھے۔ ہوا یہ تھا کہ کوئی مرغی ان کی ممی کی کیاری کے گلاب کو بھی چگ گئی تھی۔ اس سے بدلہ لینا ضرور تھا۔ وہ جدھر جدھر جاتی دونوں بھی پیچھے پیچھے ہی جاتے۔ اس مقابلہ بازی میں باغ کی وہ گت بن گئی کہ بیا کا بھلا نا صا باغ کھنڈیرا بن گیا۔ ڈپٹی صاحب کی وہ حالت کہ بس انگاروں پر بیٹھے ہوں جیسے۔ تنک تنک چلتے ہوئے بہو کے کمرے پر دارد۔ دونوں کو دیکھ دیکھ ایک تو ان کے یوں ہی آگ لگا کرتی۔ بہو تھی تو تھی، بیٹا بھی اس کے رنگ میں رنگ گیا کم بخت۔ ! سیر سپاٹے کو جاتے وقت جب گھر سے باہر نکلتے تو ہاتھوں میں ہاتھ اور آنکھوں میں آنکھیں لاحول ولا۔ ! اور جو میاں کو پیار آتا تو وہ کافوری نیچہ اپنے منہ تک لے جاتا اور۔۔ کوئی بے شرمی سی بے شرمی ہے۔ ارے یوں محبت کرنے کا شوق ہی ہے تو شوق سے کرو۔ مگر یہ تو سوچو کہ گھر میں بڈھا باپ بھی ہے۔ ہر بیہودہ میں سوچ جانے۔ آخر ہمارا بھی شادی ہوئی تھی۔ ہم کبھی تو ہائی سوسائٹی میں موو (Move) کرتے تھے، مگر اس بے ڈھنگے پن سے کہ لیں ماں باپ کے کار بن نہتے یہ دو تو تو۔ ذرا جو کوئی کام بنا ڈھنگ ہو۔

"میم صاحب بیوی نے کہہ دیا۔ اپنے بچوں کو دیکھو، ورنہ ...."
ناہید سونے کے قریب تھی، یوں کفن پھاڑ کر وہ چلائے تو اس کی آنکھ چٹ سے کھل گئی۔ گھبرا کر بولی۔
"کیا ہے پپا۔؟"
"دونوں نے میرا سارا باغ روند ڈالا۔ کیا تمہارا یہ کام نہیں ہے کہ انہیں تنبیہ کرو۔"
"آپ ہی نے انہیں سر چڑھایا ہے تو میں بھی کیا کروں۔؟" وہ جھلا گئی۔
"میں نے؟" وہ چیخ کر بولے۔ "ارے میں نے یا تم نے اور تمہارے صاحب بہادر نے۔؟"
"آپ نے۔ آپ نے۔ آپ نے اگر پہلے سے ہی آپ یوں محبت نہ کرتے تو ان کی کیا مجال تھی کہ آپ کے منہ آتے۔؟"
"ڈپٹی صاحب کو بچھو کاٹ کھا گیا۔" محبت؟ ارے میں ان حرام زادوں سے محبت کرتا ہوں۔؟ تھو۔ لاحول ولا۔! یہ نکمے محبت کے قابل ہیں بھلا۔؟"
حرام زادے! کیا یہ حرامی پلے تھے۔؟ باقاعدہ شادی ہوئی تھی تب پیدا ہوئے تھے۔ پھر یہ پپا کیا کہہ رہے ہیں۔؟
ناہید کا چہرہ بھبھوک گیا۔
"پپا آپ کی ہر بری بھلی بات برداشت کرلی۔ مگر آپ بہ گالیاں بھی دینے لگے۔؟"
"ہاں ہاں دونگا۔ دونگا۔ دونگا۔" پھر وہ بالکل بچوں کے انداز میں چلائے۔" ای۔ ای۔ ای۔"

کوئی دوسرا موقع ہوتا تو نا ہید کو یوں بوڑھے سارے آدمی کو زبان چڑاتا دیکھ ہنسی کا دورہ پڑ جاتا، مگر اس سے "تودہ اودر" ہو رہی تھی۔ اس نے وہ ہتھیار استعمال کرنا شروع کر دیا جو نپولین کے پاس بھی نہ تھا۔ آنسو۔!

پہلے تو ڈپٹی صاحب نے دیدے پھاڑ کر دیکھا کہ یہ کیا ہو گیا، پھر خود کو ڈھیٹ بنا کر بولے۔" ہونہہ، آنسو۔!"

سراج فونٹین ہاتھ میں تھامے تھامے بیزاری سے باہر نکل آیا۔

"پپا، آخر آپ گھر میں سدا طوفان کیوں اٹھائے رہتے ہیں۔؟"

اس کے لہجے میں حد درجہ ناگواری اور بیزاری چھلک رہی تھی۔

کبھی کبھار جواب دینے سے بہتر یہ ہوتا ہے کہ صرف گھور ہی لیا جائے، سو ڈپٹی صاحب بھی محض گھور کر رہ گئے۔

سراج اتنا ہی کہہ گیا۔" اور حیرت اس بات پر ہے کہ بچوں سے آپ یوں کھینچے کھانے ہیں جیسے کوئی برابری والے ہوں۔"

"پھر کیا ہاتھ لمبے کر کر کے عورتوں کی طرح تمہاری میم صاحب سے لڑا کروں۔؟"

"کیوں، میم صاحب سے لڑنا ایسا کیا ضروری ہے۔؟" وہ تیکھا ہو گیا۔

"اس لئے کہ وہ مجھے پسند نہیں۔"

نا ہید نے میاں کو دیکھا، جیسے۔"اب کہئے نا۔؟"

سراج فونٹین گلے میں اٹکا کر، اکھاڑے میں اترنے کے سے انداز سے بولا۔

"بھلا یہ تو بتایئے کہ اس کی کون سی بات پسند نہیں۔ ؟ اس میں کیا کمی ہے۔ ؟"

"تم نے اتنی فارورڈ بیوی کر کے کوئی اچھا کام نہیں کیا۔" وہ بغیر جھجک کر بولے۔

"فارورڈ ہے اسی لئے ٹکی ہوئی بھی ہے۔ ورنہ آپ کی نکتہ فضیحتی سے تنگ آکر تو کبھی کی رفوچکر ہو گئی ہوتی۔"

"میں۔" وہ چیخے۔ "میں نکتہ فضیحتی کرتا ہوں۔ ؟"

"اور کون کرتا ہے پھر۔ ؟" سراج تیزی سے بولا۔ "میں آپ سے صرف اتنا پوچھنا چاہتا ہوں کہ آخر ناہید سے آپ کو کیا شکایت ہے۔ ؟ آپ کا کون کام پورا نہیں ہوتا۔ ؟ ناشتے میں دیر ہوتی ہے یا کھانا نہیں ملتا۔ یا نہانے کو گرم پانی نہیں میسر ؟ یا پھر اور کوئی شکایت ہے۔ ؟"

تھوڑی دیر بڑے میاں سوچتے رہے۔ پھر رسان سے بولے۔

"ایسی تو کوئی شکایت نہیں ۔"

"تو پھر برسوں سے یہ جھگڑے رگڑے کیوں چل رہے ہیں۔"

ڈپٹی صاحب تیزی سے پیچھے پلٹے اور صفائی دینے کے انداز سے بولے۔ ان مردودوں کی وجہ سے۔ ان دو کمینوں کی وجہ سے۔ اگر اکیلی میم صاحب کا واسطہ ہوتا تو شاید میرا غصہ اتر بھی چکا ہوتا مگر انہوں نے ۔ ان نامعقولوں نے میرا بھیجا آؤٹ کر رکھا ہے۔"

"کبھی ماں پر غصہ، کبھی بچوں پر۔ بات ایک ہی ہے۔ دراصل آپ چاہتے ہیں کہ ہم آپ کے گھر سے چلے جائیں۔" ناہید بہت دنوں سے یہ بات کہنی چاہتی تھی آج بول ہی گئی۔

"ہاں ہاں تمہارے باپ کا گھر نہیں میرا گھر ہے، چلی جاؤ۔ چلی جاؤ ابھی اسی وقت، کون روکتا ہے۔ شہر میں بہت سے فلیٹ خالی ہیں۔"

سراج نے ناہید کو دیکھا، ناہید نے سراج کو۔

تھوڑی دیر عجیب ہیبتناک خاموشی طاری رہی، پھر سراج رسان سے بولا۔

"تو یہ بات تھی پیا۔! ہمیں پہلے اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ ہم یوں آپ کی نگاہوں میں کھٹکتے ہیں، ورنہ آج سے سالوں پہلے گھر خالی کر چکے ہوتے۔" تھوڑی دیر رک کر وہ دھیرے سے بولا۔

"ہم کل یا پرسوں یہاں سے چلے جائیں گے۔!"

کئی سالوں بعد آج وہ دن طلوع ہوا کہ ڈپٹی صاحب کو سکون ملا۔ روزانہ تو صبح ہی سویرے دونوں پوتا پوتی طوفان بن کر آن موجود ہوتے تھے۔ آج ناہید کی دکھتی رگ پر ہاتھ پڑا تھا اس لئے اس نے دونوں کو کمرے میں بند کر رکھا تھا۔

"جو کمرے سے باہر قدم رکھا تو پیر کاٹ ڈالوں گی۔"

دونوں مرے مرے ہاتھوں سے سامان پیک کرنے لگے۔ ڈپٹی صاحب مزے سے حقہ پیتے اپنے کاموں میں مگن رہے۔ گردن اونچی کر کر کے فاتحانہ انداز سے دیکھے جاتے، جیسے۔

"دیکھا کیسے بھگایا کم بختوں کو۔!"

دوپہر کے کھانے کے لئے ممی نے دروازہ کھلوایا تو دونوں کو جیسے سی مل گئی۔ پھر دادا کے آگے پیچھے ہونے لگے نیچا تال پیٹ کر بولا۔

"ابا جی، ہم تو نئے گھر کو جا رہے ہیں۔"

"اور وہاں آپ تو ہوں گے بھی نہیں۔" نیلم نے لقمہ دیا۔

ڈپٹی صاحب کا پارہ چڑھ گیا۔ "میں کون مرا جاتا ہوں تمہاری قربت کو۔"

غصے غصے میں سراج فلیٹ ڈھونڈ آیا۔ نوکروں اور مالکن نے مل کر پیکنگ ختم کی۔ دن بھر سارا انجر پنجر اٹھانے میں ٹوٹ گیا۔ دونوں رو رو کر، مڑ مڑ کر دیکھتے کہ اب پاپا آئیں گے، تب پاپا آئیں گے اور ہاتھ پکڑ کر لے لیں گے۔

"ارے تم دونوں بھی بس بچے سے ہی نکلے۔ کیا یوں گھر چھوڑ دیا کرتے ہیں۔؟"

مگر وہ تو وہیں کرسی پر دھرنا دیئے بیٹھے رہے۔ بس نماز ادا کرنے کو اٹھے، پھر کرسی پر پیرا جمالیا۔ ایک ایک کر کے سارا سامان بندھ گیا مگر ڈپٹی صاحب ٹس سے مس نہ ہوئے۔

ٹرک میں سامان لد گیا۔ پھر اسکوٹر پھاٹک میں داخل ہوا تب بھی وہ وہیں جمے رہے۔ بٹیا دیدے گھما گھما کر دیکھتا رہا مگر وہ ہلے تک نہیں۔

سب مرحلے طے ہو گئے تو بچے، بٹیا، بہو ملنے کو آئے۔ دور ہی سے رکھائی سے بولے۔

"جاؤ اللہ خوش رکھے! اور خوش کیوں نہ رکھے گا۔؟"

اسکوٹر میں بیٹھتے بیٹھتے تو سچ مچ نا ہید کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

"بڑا گھر چھوڑتا کتنا برا لگ رہا ہے نا سجو۔" وہ دکھ سے بولی۔

"یہاں ہم نے کتنے خوشگوار دن گزارے۔"
سراج کی خود حالت غیر ہو رہی تھی۔ مگر وہ بھرم قائم رکھنے کو بولا۔
"کاہے کے خوشگوار دن تھے۔؟ دن رات تو کل کل میں گزرتے تھے۔"
مگر اس کی آنکھیں برسنے لگیں۔ "ہائے بے چارے پپا اکیلے کیسے رہیں گے۔؟ ان کے کھانے پینے کی کیا برابری ہو گی۔؟ جانے کیوں مجھ کم بخت کے منہ سے گھر چھوڑ دینے کی بات نکل گئی۔؟ سارا قصور میرا ہی تو ہے۔!" وہ پھپھک پڑی۔
سراج جھلا گیا۔ کیسی عورت ہے یہ۔؟ خواہ مخواہ اپنے سر قصور منڈھ رہی ہے۔ تیزی سے بولا۔
"یہ خیال تو انہیں آنا چاہیئے تھا۔ کمال کرتی ہو۔"
اسکوٹر پھاٹک سے نکلنے لگا تو اس نے جھک کر دیکھا۔ شاید پپا روک ہی لیں، شاید ان کے چہرے پر غم کی چھاپ ہو۔ مگر اسکوٹر زن سے باہر نکل گیا۔
دوسرا دن تو ڈیڈی صاحب کے لیئے عید بن کر آیا۔ صبح ہی صبح اٹھے مگر یہ کیا۔؟ پانچ منٹ، دس منٹ، بیس منٹ، آدھا چھوڑ پورا گھنٹہ گزر گیا مگر بیڈ ٹی اب آتی ہے نہ جب۔!
"ہونہہ! ہم کب کسی کی پروا کرتے ہیں۔" جھلا کر اٹھے اور باورچی خانے کو چلے۔ ماما کو پٹکا رنیاں۔ مگر وہ قطعی بے خبر تھی۔ یہ سارا کام دھام تو کلو کے ذمہ تھا۔ جو اچھا خاصہ صاحب لوگوں کا بیرا بن گیا تھا۔
دھوپ تیز ہوئی تو انگنائی میں نکل آئے۔ کتابیں ٹٹولنی شروع

کیں۔ ایک دو منٹ تو بڑی مستعدی سے پڑھتے رہے۔ پھر طبیعت بے چین سی محسوس کرنے لگی۔ آدھ گھنٹے میں کتاب شیلف پر پہنچ چکی تھی اور یہ خود چلا چلا کر ماما کو آواز دے رہے تھے کہ ناشتہ میں کیا دیر باقی ہے؟

"آج کس قدر سکون ہے۔" انہوں نے بشاشت سے سوچا۔ چلو ذرا مرغیوں کی خبر لے آئیں۔ باجرا، جواری کی کوٹھی لے کر ڈربے کے پاس پہنچے۔ بڑے سکون سے مرغیوں نے دانہ چگا۔ پھر مٹھو کی باری آئی۔ کٹوری کا پانی بدلا۔ ہری مرچیں کھلائیں۔ کچھ باتیں کیں۔ چلنے کو ہوئے تو وہ تیزی سے بولا۔

"پیا فول، پیا فول۔"

یہ جھنجھلا کر مڑے اور بری طرح چلائے۔ "ابے بول، پنکی فول، پنکی فول، یہ گالی اس کم بخت نے ہی سکھائی تھی نا۔؟ اور پھر نامراد نیلم بیوی۔!"

مٹھو اچھل اچھل کر بولنے لگا۔

"پنکی فول، پنکی فول۔"

پھر وہ بڑے اطمینان کے ساتھ باغ کو چل دیئے۔ جھارا اٹھا کر پانی دیا۔ پودوں کی کانٹ چھانٹ کی۔ پھر بلی کی خبر گیری پر جٹ گئے سارے مرحلوں سے نپٹ کر وہ مزے سے آرام کرسی پر دراز ہو کر یا مسٹری پڑھنا کھلے۔

دوسرا دن بھی وہی سکون اور اطمینان لے کر طلوع ہوا۔ باجرہ کھاتے میں کوئی مرغی گوبا پڑا کرنہ اچھلی، اور اچھل کر ان کے کندھوں پر نہ بیٹھی۔ باغ میں پانی دینے کا جھارا یونہی رکھا ہوا تھا۔ مٹھو سیدھے

سادے سجاؤ میں کہہ رہا تھا۔

"ڈپٹی صاحب منٹھو پیارے کو روٹی دیجیے۔"

کتابیں پیچھے سے دھکے دے دے کر گرائی جا رہی تھیں نہ اچھالی جا رہی تھیں۔ انہوں نے دو چار صفحے الٹ کر کتابیں واپس رکھ دیں اور بلی کو گود میں لے کر اس کی نرم نرم پشم پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

تیسرا دن تو اس سے بھی زیادہ پرسکون نکلا۔ مرغیاں خاموشی سے دانہ چگتی ہی رہیں تو انہیں تنگ کر غصہ آگیا۔ "بھلا ایسی صلاحیت بھی کس کام کی۔" مگر وہ کیا سنتیں۔ مزے سے چگتی رہیں۔ پودے اپنی جگہ جھومے جا رہے تھے، نہ نیچے ہوئے نہ پھول ٹوٹے ہوئے۔ منٹھو بھی ادھر ادھر اچک کر روایتی انداز سے 'منٹھو پیارے، منٹھو پیارے' کی رٹ لگائے جا رہا تھا۔ بلی لنگڑا کر چل رہی تھی نہ دادا کی کرسی پیچھے سے گھسیٹی جا رہی تھی۔ سارے میں ایسی خاموشی کہ سوئی گرے تو آواز سن لو۔ مرغیاں تھیں سو پرلی طرف، بلی سو رہی تھی۔ پودے خاموش، کتابیں سوئی سوئی، منٹھو۔ وہ الگ پروں میں سر دبائے اونگھ رہا تھا۔

اک دم ڈپٹی صاحب تیزی سے اٹھے۔ پہلے تو مرغیوں کے پیچھے خوب دوڑے یہاں تک کہ سانس الٹ گئی۔ پھر جھارے میں پانی بھر کر کیا ریاں بھگونے لگے۔ اپنے ہاتھوں پودوں کو کھسوٹا۔ پھر بلی کی شامت آگئی۔ اس کی دم پکڑ کر ایسے گھیٹے دیئے کہ وہ بلبلا گئی۔ شیلف سے کتابیں جان جان کر گرانی شروع کر دیں۔ سارا گھر درہم برہم ہو گیا۔ اک دم وہ لپک کر منٹھو کے پاس پہنچے اور پنجرے کو زور سے ہلا دیا۔ سہما سہما یا منٹھو بری طرح جاگ اٹھا اور ڈپٹی صاحب کی صورت دیکھ کر چیخنے لگا۔

"پنکی فول، نیلم فول۔"

دونوں ہاتھوں سے انہوں نے پنجرے کی سلاخیں تھام لیں اور مٹھو کے کان میں چیخے۔ "پول، پیا فول، پیا فول۔" مٹھو نے کنمنا کر انہیں دیکھا اور پھر دونوں مل کر زور زور سے چلانے لگے۔

"پیا فول، پیا فول۔"

اور ٹپ ٹپ موتی ان کی آنکھوں سے نکل نکل کر ڈاڑھی میں جذب ہونے لگے۔

☆

کانچ کا دِل

رانی دلہن پورے دنوں سے تھی۔

بی ساس کا کلیجہ ہاتھ بھر کا ہو گیا تھا۔ بڑے گھر میں یہ کوئی پہلا زچگی جاپا تو تھا نہیں جو یوں سیا بی پھول کی طرح کھلی پڑ رہیں، مگر یہ بھی تو قسمت کی خوبی ہی تھی نا کہ اوپر تلے کے چار بیٹوں میں سے کسی نے نواب بیگم کو پوتے کی دادی نہ بنایا۔ لے دے کے انگنائی، صحنائی اور گھر بھر میں لڑکیاں ہی لڑکیاں پھرا کرتیں۔ اماں تو رہ رہ کر سوچتیں۔ "ہے ہے، جس بہو کو دیکھو ٹپا ٹپ بیروں کی طرح بیٹیاں جنے جا رہی ہیں۔ آخر ان کا کیا ہوگا؟ اور خاندان کا نام کیسے چلے گا؟" مگر وہ صرف سوچ تو سکتی تھیں۔ لیکن لڑکیوں کو پیدا ہونے سے روک کہاں سکتی تھیں۔

دھنیا دائی محلہ چھوڑ پورے گاؤں میں مشہور تھی۔ جہاں کسی نئی نویلی پر اس کی نظر پڑی اس نے جھٹ وہیں بتا دیا۔

"میں کہوں بہو پوتا جنے گی۔"

اگر کسی کو بیٹی ہونے کی بات سنا دی تو کیا مجال جو بیٹا سر اٹھا کر چلے۔ وہ تو چال دیکھ کر بات پہچانتی تھی۔ خود اس کی اپنی بہو نے ایک کے بعد ایک، چھ بیٹے پیدا کر ڈالے تھے۔ میا کو بیٹا رانی کا وہ ارمان

تھا کہ نچلے والے بیٹے کو سدا رنگین کپڑے پہنا کر زیور سے لادے رکھا ہاتھوں میں سونے کی چوڑیاں، اور تو اور چھن چھن کرتی جھانجھیں بھی پیروں میں ڈال دیں۔ بڑی بوڑھیاں ٹوکتی بھی تھیں کہ اس کی تو عقل الٹ گئی ہے، بچپنے ہی سے اسے بیٹی کا سوانگ دے رکھا ہے، بھلا اس پہ کیا اثر پڑے گا۔ ؛ ساری عمر ماں کے کولھے سے لگا ہانڈیاں دھوتا اور روٹیاں بیلتا رہیگا۔ بہوؤں کے طعنے خوب سہتی تھی، مگر ماں ممتا کے مارے جی کو بھی سنی سی کلی کی للک تھی تو پوری بھی کیسے پڑتی ؛ مگر اگلے برس جب بہو کو حمل ٹھیرا اور وہ سہم سہم کر قدم اٹھانے لگی اور اپنی گیلی پھر پھر کر کچے بچے پر للچانے لگی تو ساس نے ایک دن اس کے چہرے کا رنگ دیکھ کر کہہ دیا۔

"بہو کہوں اب ننھے کے انگ پر سے ریشم اور زیور اُتار لے۔"

بہو نے چکرا کر ساس کو دیکھا تو ساس ہنسی اور بولی۔ "اور کیا یہ دیکھیو، رات کو نیند میں میں نے تیرے گلے سے گلسر اتاری اور تو کسمسائی تک نہیں۔ نیند ایسی ٹوٹ کر آئے تو بیٹی کو ساتھ لاتی ہے۔ اور پھر تیرا پیٹ تو دیکھ، ابھی سے پھیلا پھیلا سا ہے۔ بٹیا پیٹ میں رہے تو پیٹ اونچا رہتا ہے نا، اس لئے۔"

"اچھا۔؟" بہو ذرا خفگی اور ذرا شرارت سے بولی۔ "تو اس کا مطلب تو یہ ہوا ناکہ بیٹی ماں باپ کی ناک کٹاتی آتی ہے تو پیٹ بھی چپٹا چپٹا ہوتا ہے۔ یہی مطلب ہے نا تیرا۔؟"

ساس تو اپنے چھ پوتوں کی دادی کہلائے جانے پہ نازاں رہتی تھی۔ ہنس کر، برا منائے بغیر بولی۔

"اور نہیں تو سہی، کون بیٹی نے ماں باپ کا مان رکھا ہے۔ وہ آئی

سبھی ہے تو مہمان کے سمان۔ جاتے جاتے آنکھ میں آنسو اور دل میں درد ہی تو دے کر گئی ہے نا۔ بول جھوٹ کہتی ہوں۔؟"

بہو کچھ نہ بول پائی۔ مگر جب بچاپے کے دن قریب آئے تو اس کو ساس کی بات رہ رہ کر یاد آتی رہی۔ اور جب کچے پکے دردوں سے گزر کر اس نے سکون کا سانس لیا تو دادی ہنس ہنس کر محلے والوں سے کہہ رہی تھی۔

"اے میں کہوں چوڑی والی کو بلاؤ ری، گھر میں سہاگن براجی ہے"

مگر رانی دلہن کے حق میں تو دھنیا دائی کی پیش گوئی بھی الٹی ہی پڑی۔ پیٹ دیکھو تو آسمان سے باتیں کرتا تھا اور جنم دیا بیٹی کو۔ ایک بار نہیں، دو بار نہیں، تین بار یہی ہوا۔ گھر میں لڑکیوں کی فوج تیار ہو رہی تھیں۔ جٹھانیاں، دیورانیاں سبھی لڑکیوں والی تھیں۔ اس خاندان میں ہی بیٹوں کا کال تھا۔ ہاتھ کی بات تھی نہیں۔ پاسین درود پڑھ پڑھ کر بیٹوں کی پیدائش کی دعائیں مانگیں بھی، مگر اجڑے گھر میں کبھی تو دیا نہ جلا۔

اب کے پھر رانی دلہن پورے دنوں سے تھی اور ساس کا دل پھرا دپر نیچے ہو رہا تھا۔ دھنیا دائی کی بات پر یقین تھا نہ پیٹ کے ابھار نے انہیں امید بندھائی تھی۔ بس ان کا دل رہ رہ کر آپ ہی آپ کہتا تھا کہ کچھ بھی ہو اب کے پوتا ہوگا ہی۔ مگر رانی کے دل پر تو ایسے سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے کہ سورج کی کرن بھی انہیں چیر تی تو اجالا نہ ہو پاتا۔ اور اسے اطمینان یوں بھی تھا کہ کچھ وہی ایک تو بیٹیوں والی ماں نہ تھی، یہاں تو سارے سکے ایک ہی ٹکسال سے ڈھل

ڈھل کر چلے آرہے تھے۔ نہ ساس نے کبھی رانی سے اپنی امید اور دل کی بات بتائی، نہ رانی نے ہی سوچا۔ ہاں مگر یہ ضرور ہوا کہ جب ایک رات سوتے سوتے رانی جاگی تو گھبرا کر یہی کہنے لگی۔

"ہائے اماں یہ کیسا درد ہے۔؟ پیٹھ سے اٹھ اٹھ کر لہریں سارے جسم کو نچوڑے لے رہی ہیں۔ ایسا پہلے تو کبھی نہ ہوا۔"

"ایسا پہلے کبھی تو نہ ہوا۔" اماں کے سارے جسم نے کان بن کر بس اتنی ہی بات سنی اور وہ بستر پر کل کے کھلونے کی طرح پھرتی سے اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

کمرے میں اجوائن، عود اور دھونیوں کے غبار میں ملی جلی گرم گرم خون کی بو تھی اور رانی کی ڈوبتی ابھرتی سانسوں کی لہریں۔ دائی نے اندھیرے سے اٹھا کر ہاتھوں کو اونچا کیا اور جیسے آپ ہی آپ اس کی چیخ حلق سے یوں پھوٹی کہ رانی کا سارا جسم کانپ کانپ گیا۔

"اے دلہن بیں کہوں بٹیا ہے۔ پورا کا پورا جیتا جاگتا بٹیا۔"

اور پھر "میاں" "یا ہاں" "ہاؤں" "ہاؤں ہاں" کی خوشگوار آواز سچ مچ بیٹے کی آواز "میں آگیا ہوں۔ میں آگیا ہوں اجالے لے کر اور خوشیاں لے کر۔ ناک اونچی کرنے والا۔ خاندان کا نام چلانے والا۔

دائی پھر تائی سے باہر نکلی اور چیختی ہوئی اماں کے پاس پہنچی۔

"اری بی بی، سنا تم نے؟ بٹیا ہے بٹیا! چاندی کے کنگن پہنوں گی، ہاں۔"

"اری دھیرے بول نامراد۔ ساری عمر بچے جناتے گزر گئی، اتنا

نہیں معلوم زچہ زیادہ خوش ہوجائے تو دم چھوٹنے لگتا ہے۔ وہاں تو آگے ہی ندیاں بہہ گئی ہیں۔ اتنی خوشی کی خبر سنے گی تو جی کیا ہوگا۔ کتنے برسوں بعد تو آج اندھیرے میں چاند چمکا ہے۔"

اماں دھیرے دھیرے کمرے میں داخل ہوئیں۔ رانی شطرنجی پہ کروٹ لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے بال کھلے ہوئے تھے، ایک ہاتھ زمین پہ دوسرا کولہے پر رکھا ہوا تھا۔ اس کا منہ دیوار کی طرف تھا۔ شاید وہ سمجھ رہی تھی کہ اب کے سے پھر لڑکی ہوئی ہے۔" شرمندگی اور غم کے مارے اس نے منہ پھیر رکھا ہے۔ اب اسے میں پہلے تو یہ کھوننگی کر لڑکی ہوئی ہے۔ اور جب وہ رونے پہ آئے گی تو بتاؤں گی کہ وہ تو آج خاندان کی سب سے قابلِ عزت اور قابلِ احترام شخصیت بن چکی ہے بنا رانی تم نے۔؟ سنا۔!"

ساس نے، جو پہلے ایک ماں تھیں اور اب ایک پوتے کی دادی، دھیرے سے بہو کا شانہ ہلا کر اپنی طرف کھینچا۔ مگر رانی نے ساس کی طرف نہیں دیکھا۔ بیٹے کی طرف نہیں دیکھا، کسی کی طرف نہ دیکھا۔ اتنی ڈھیر ساری خوشی ملنے کے بعد وہ اور کچھ نہیں سوچ سکتی تھی۔ سوائے اس کے کہ خود ہی خدا کے حضور شکر یہ پیش کرنے چل دے!۔

رات کی سیاہی صبح سے بدلی، صبح کی روشنی پھر تاریکی میں روپوش ہوئی، مگر اماں اپنی جگہ سے نہ ہلیں۔ آنکھیں پھٹی ہوئیں اور سانس رکی ہوئی۔ وہ ساروں کی باتیں سن رہی تھیں، سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔ مگر یوں کہ کسی بات کی خبر نہ تھی۔ ایک ایک نے آ کر ہلایا۔ پکارا۔

پچھتاوے دلائے، مگر نہ ان کی آنکھ سے آنسو نکلا، نہ ہنکلی ٹوٹی۔
جس جگہ رانی نے صبح کا بھرپور اجالا بکھیر دیا تھا اب وہاں تاریکی
کے سوا کچھ نہ تھا۔ بچیاں ڈھائیں ڈھائیں پھر رہی تھیں اور بچہ
پالنے میں پڑا روئے جا رہا تھا۔ "ہیاں۔ ہیاں۔ می ہیاں۔ میں
یہاں ہوں۔ میں۔ میں یہاں ہوں۔ تم کہاں چلی گئیں؟ تم نے
میرے لئے دعائیں مانگیں، منتیں مانیں اور دعاؤں کا سہارا لیا۔
اور اب جب میں تم تک جھیل کر آیا تو تم مجھے چھوڑ کر چلی گئیں۔ اب میں
کس کے پاس رہوں گا؟ کون مجھے سنہیا رس پلائیگا؟ سب مجھ سے
دور دور بھاگ رہے ہیں۔ کسی نے میرے منہ میں کل سے دودھ کا قطرہ
بھی نہیں ٹپکایا ہے اسی۔ میں روتا ہوا آیا تھا کہ سنہیوں اور مسکراہٹوں
کی گود میں پلوں گا۔ مگر میرے آگے پیچھے، یہاں وہاں، ادھر ادھر، آس
پاس آنسو ہی آنسو ہیں، ہچکیاں ہیں، آہیں ہیں، بے نور آنکھیں ہیں اور
تاریکیاں ہیں۔ لوگ کہہ رہے ہیں میں منحوس ہوں۔ میں نے اپنی ماں
کو کھا لیا ہے، تائیاں، چچیاں مجھ سے دور دور بھاگ رہی ہیں۔
ایک دو دن کی بات تو نہیں، عمر بھر کا ساتھ ہے، کون دیگا؟ کون
مجھے پیار سے گلے لگائے گا۔ امی دادی اماں مجھ سے بات نہیں کرتیں
ابو مجھے صرف دیکھ سکتے ہیں، سنبھال نہیں سکتے۔ پھر میں کہاں جاؤں؟
کہاں جاؤں؟ ہیاں۔ ہیاں۔ می ہیاؤں۔"
رانی مسکرائی۔ دو ہاتھ، سوکھے مارے مگر محبت کی آگ سے
تپتے ہوئے ہاتھ، جن میں خون کی رمق بھی نہ تھی، جن میں چوڑیوں کی چھنک
نہ تھی۔ پالنے کی طرف بڑھے اور انہوں نے ایک ننھے منے گیلے وجود

کو اٹھا کر سینے سے لگا لیا۔

"مجھے تم سے یہی امید تھی منجھلی پھوپھی۔" رانی جیسے سرگوشی میں بولی۔

پھوپھی نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا۔ یہ کیسی آواز تھی۔؟ یہ کیسی سرگوشی تھی۔؟ یہ کون ان سے اس قدر قریب ہو کر گزرا تھا۔؟ انہوں نے کانپ کر بچے کو گلے سے لگا لیا۔

"میرے بچے! میرے بچے! میری جان!" ان کی آواز کانپ رہی تھی اور ہونٹ لرز رہے تھے۔

منجھلی پھوپھی اماں کی سب سے چھوٹی نند تھیں۔ جب اماں بیاہ کر آئی تھیں تب تو وہ پیدا بھی نہ ہوئی تھیں۔ عمر میں وہ اپنے بڑے بھتیجے سے بھی دو چار برس چھوٹی ہی تھیں۔ بھتیجوں کے بیچ وہ گڑیا سی بہن نظر آیا کرتیں۔ سمجھنے والے انہیں بھی اماں کی بیٹی ہی سمجھتے اماں تو نہ جانے کون سا خون، کون سا اثر لائی تھیں کہ چھ سات بیٹیوں کے ساتھ ساتھ چار بیٹیوں کی بھی ماں بن بیٹھیں، ورنہ یہاں تو نسل در نسل یہی ہو رہا تھا کہ ایک آدھ لڑکا ہو گیا جس سے خاندان چلتا رہا۔ جب اماں کی ساس مریں اس وقت تک سب اولادیں اپنے اپنے گھروں کی ہو چکی تھیں۔ بس ایک منجھلی نند ہی باقی رہی تھیں۔ ساس نے اسے جیسے بہو کی گود میں ڈال دیا تھا۔ کچھ یہ نہ سمجھا کہ وہ ان کی بیٹی ہے۔ وہ بھی سدا بھائی بھاوج ہی میں گھلی ملی رہی۔ دن بیتے اور اماں نے بیٹے بیٹیوں کے گھر بسانے شروع کیے تو منجھلی کو بھی ماں بن کر بیاہا۔ مگر نہ تو بھاوج کا ساتھ کچھ ایسا بھایا تھا کہ دور رہ ہی نہ سکی۔ چار دن

کی ایک رات اس کے میاں نہا کر پنکھے کی ہوا میں سوئے اور صبح اٹھے تو
سارا جوڑ جوڑ جکڑا ہوا تھا۔ تین چار دنوں میں رفو کیا سے کیا ہو گئی۔
بھاوج نے لال کپڑوں سے وداع کیا تھا اور بھائی جب لائے ہیں تو سر
سے پاؤں تک سفید، برف کی کلی بنی ہوئی تھی۔ جو کھول کر ہنسنا رفو کو
راس نہ آیا۔ اس کے ہونٹ سل گئے، ارمان گھٹ گئے اور وہ جلی شاخ
کی طرح جہاں کی تہاں رہ گئی۔ تاروں بھرا آسمان سر پر جگمگاتا اور
وہ دل میں اندھیرے لئے سسکتی رہی۔ جاڑے، گرمی، برساتیں، خزاں
بہار، سب اس کے لئے ایک جیسی بات تھی۔ اور جیسے جیسے دن بیتے وہ
بھتیجوں، بھتیجیوں کے بچوں کی دیکھ ریکھ کرنے کو جیتی گئی۔ کوئی
تصور نہ ہونے پر بھی ڈانٹ دیتا اور وہ خاموش اور معصوم آنکھوں
سے دیکھ کر گویا اپنے ناکردہ گناہ کا اعتراف کر لیتی۔ میاں اچھی خاصی
جائداد چھوڑ کر مرے تھے۔ سارا پیسہ اسی کے حصے میں آیا تھا۔ وہ چاہتی
تو اپنا ایک گھر بار کر سکتی اور مزے میں جی سکتی تھی۔ مگر وہ انہی لوگوں
میں جینے آئی تھیں، وہ ان سے ہٹ کر زندگی گزارنے کا تصور بھی نہ
کر سکتی تھیں۔ وہ تو بھری بہار میں اجڑ کر رہ گئی تھی۔ کون اسے دیکھنے
اور نہارنے والا بیٹھا تھا۔ ؟ پہنتی اوڑھتی بھی تو کس کے لئے ؟ سارا
پیسہ انہی بچوں پر اٹھا دیا کرتی۔ وہ مشین کی طرح ہر کام انجام دیا
کرتی لیکن۔ لیکن اتنے دنوں بعد اب پھر اس میں زندگی کے آثار پیدا
ہو رہے تھے۔

ننھا نسیم ابھی دو ہی چار دنوں کا تو تھا۔ بے چارے نے ماں کا
دودھ چکھا بھی نہ تھا۔ اس ننھی زندگی کا کیا بنے گا۔ ؟ کیا یہ پھول کھلا کر

رہ جائے گا۔" رفو نے بے بسی سے ان ماؤں کی طرف دیکھا جن کی چھاتیاں دودھ سے لبریز تھیں اور محض دو گھونٹ اس ننھی سی جان کی زندگی کا سامان مہیا کر سکتے تھے۔ مگر اپنے خون سے کسی دوسرے کے لگائے پودے کو سینچنے کا ظرف کتنی ماؤں میں ہوتا ہے۔"

منجھلی پھوپھی نے اپنے سینے کی طرف دیکھا۔ مامتا کے سوتے تو مدت ہوئی وہاں خشک ہو چکے تھے۔ پھر۔ پھر انہوں نے آسمان کی طرف نگاہ کی جس کا کوئی نہیں ہوتا اس کا خدا ہوتا ہے۔ انہوں نے روئی کی بتی بنائی اور گائے کے دودھ میں بھگو کر ننھے کے منہ میں ٹپکانے لگیں۔ زندگی کا یہ پہلا دور تھا جب وہ خوشی خوشی جینا سیکھ رہی تھیں۔ بچپن تو جیسا بیتا سو بیتا۔ بڑی ہوئیں تو ماں کا سایہ سر سے اٹھ گیا بیاہ کر میکے سے سسرال آئیں تو چند ہی دنوں میں ساری خوشیاں جل کر خاک ہو گئیں۔ نہ وہ کسی کے لئے جی سکیں، نہ کوئی ان کے لئے زندگی کا سامان کر سکا۔ اب ان کی زندگی ایک نئی، پربہار اور رنگین راہ پہ چل پڑی تھی۔ وہ جیتی تھیں ننھے کے لئے، مسکراتی تھیں ننھے کے لئے۔ اور پھر ننھا تو سبھی کی خوشیوں کا مرکز تھا۔ کئی دن گزرے بڑا ماں جی ہوش میں آئیں تو دیکھا کہ شمو نند کی گود میں رہ رہ کر ہمکتا تھا اور کوئی اسے لینے کو ہاتھ بڑھاتا تو وہ منہ پھیر کر اس کے سینے میں منہ چھپا لیتا۔ نیتوں پوتیاں تو اماں ہی کی نظر شفقت کی مرہون منت تھیں۔ پوتا تو پورا پورا ہی نند کا تھا۔ ایک اماں نے چار عورتوں میں بیٹھ کر کہا بھی۔

"اب رفو بیگم جانیں اور شمیم میاں۔ میں نے تو ان کی گود میں ڈال دیا۔ اب وہ ان کی ماں ہیں اور وہی اللہ کے بندے۔"

رنو پھوپھی کا دل جیسے اپنی جگہ چھوڑ کر کہیں آنکھوں سے نکل پلکوں پر کپکپانے لگا۔ "میرا بٹیا! میرا بچہ!"

شمیم میاں ڈھیر ساری بہنوں کے اکلوتے بھائی تھے۔ کوئی انہیں پوچھتا نہ پوچھتا، ماں اور دادی کی تو آنکھوں کے تارے تھے ہی تھے۔ بس کڑوا کریلا نیم چڑھ گیا۔ ابھی ایک برس کے بھی نہ ہونے ہوں گے، ضد کا وہ عالم تھا کہ کسی چیز کی پے جب پڑ جاتے تو مچل مچل کر زمین آسمان سر پہ اٹھا لیتے۔ بڑے ابا ایک بار کہیں شیشے کا ایک گلدان لائے تھے قیمتی اتنا نہ تھا جتنا خوب صورت تھا۔ اور پھر جب چیز پرانی ہو جائے اور وہ کسی بزرگ کے ہاتھ کی لائی ہوئی ہو تو وہاں قیمت کا سوال ہی نہیں جاتا، وہ ایک قابل احترام چیز بن جاتی ہے۔ ایک دن کہیں شمو میاں نے وہ گلدان دیکھ لیا۔ ڈیڑھ پونے دو برس کے ہو رہے تھے، کھڑے تو ہوتے ہی تھے، ذرا دور تک چل بھی لیتے تھے۔ گلدان سنگھار میز کے پرلی طرف رکھا ہوا تھا۔ پھدا پھدا تنے ہوئے گئے اور گلدان اٹھا لیا۔ قریب تھا کہ زمین پہ دے مارتے کہ تائی بی نے دیکھ لیا اور چلا کر دوڑیں۔

"تیرے بڑے ابا میاں کے ہاتھ کا لایا ہوا ہے۔"

ہاتھ سے گلدان جھپٹنا تھا کہ شمو نے چیخ چیخ کر حالت تباہ کر لی۔ "لاکھوں کھلونے دئیے جا رہے ہیں۔ لالچ دیا جا رہا ہے، مگر بہلائے نہیں بہلتے۔" منجھلی پھوپھی کہیں باورچی خانے میں ان کے دودھ دلیے کی برابری کر رہی تھیں۔ وہاں سے چیخ چانخ سن کر لپکی آئیں۔

"ہوا کیا ہے؟" وہ تیزی سے بولیں۔ "ذرا چھوڑ کر جاؤں تو جیسے سب اسی کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ آخر بن ماں کا ہے۔"

"تائی تنک کر بولیں۔ "بن ماں کا ہے تو جو چاہے کر لینے دیں۔ ؟
ابھی گلدان توڑ دیا ہوتا۔ کوئی ایسی ویسی چیز تو ہے نہیں۔"
پھوپھی کو دیکھ شمو اور زور زور سے رونے لگا۔ رفو بیگم نے
آگے بڑھ کر گلدان اس کے ہاتھ میں تھما دیا اور دوسرے ہی لمحے خوش
خوشی شمو نے تڑسے زمین پر دے مارا۔ معصوم مسرت کا سا
اسی تڑ میں پوشیدہ تھا۔
سب ایک دوسرے کو دیکھتے رہ گئے۔ یہ تو سر سے اونچی جا رہی
ہیں۔ ایسے تو بن ماں کے بچے کو ڈبڑھ کوڑی کا کر دیں گی۔ کیا بچے کی ضد
ایسے ہی پوری کی جاتی ہے۔ !
دادی اماں کے کانوں تک شکایت جانے سے پہلے ہی منجھلی پھوا
نے ایک نہ دو، چار گلدان منگوا کر میز پر سجوا دیئے۔
یہ پہلا وقت تھا جب منجھلی پھوپھی کا دل پوری طرح ایک ماں
کی طرح تڑپا تھا اور وہ اپنے جگر گوشے کے لئے سب سے لڑنے پر آمادہ
ہو گئی تھیں۔ یہ ایک ننھی، بالکل ہی ننھی سی بات تھی۔ مگر جیسے جیسے
شمو بڑا ہوتا جا رہا تھا پھوپھی کی محبت دیوانگی اختیار کرتی جا رہی
تھی۔ ان کی زندگی نے محبت کا لفظ سنا ہی نہ تھا۔ محبت کرنے،
چاہنے اور چاہے جانے کی اس لذت سے وہ یکسر محروم تھیں جو کبھی
تو بیوی بن کر ملتی ہے اور کبھی ماں بن کر۔
شمو اپنی بہنوں میں۔ گھر امنیٹھا تھا۔ چھوٹی سی جان، نہ کسی
بات کی سمجھ نہ اپنے پرائے کی تمیز۔ سب بچیاں کھیل رہی تھیں چھپا
چھپائی کا کھیل ہو رہا تھا۔ شمو لاٹھا لی بھی چیل رہی تھی۔ کسی نے سر پہ

ایک ڈھول بجائی۔ اس نے اِدھر اُدھر سر گھما کر دیکھا اور پھر بے بسی سے پکارا۔

"امی۔"

رقو پھوا والان میں کرسی پر سویٹر بنتی بیٹھی تھیں۔ اس کے اس طرح پکارنے پر پہلے تو وہ چونکیں، پھر ان کا پورا وجود تھرا گیا۔ امی۔ امی۔ امی۔!

آج ایک ننھے سے وجود نے اپنی زبان سے پہلی بار ایک لفظ ڈھالا تھا، اور وہ لفظ تھا امی۔! اور امی کون تھی۔؟ سویٹر پھینک کر وہ لپکیں اور قریب پہنچتے ہی رک کر بے تابی سے شمو کو اپنے سینے میں بھر لیا۔

"میں تیری ماں ہوں۔ ہاں تیری ماں ہوں۔ ایک بار پھر امی کہہ دے۔ کہہ دے میرے بچے! میرے بیٹے!" سینے سے ابال سا اٹھ رہا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی جاتی تھیں اور شمو کو اپنے سینے سے بھینچے جاتی تھیں۔ آج ایک معصوم وجود نے انہیں فرش سے اٹھا کر عرش پر بٹھا دیا تھا۔ آج تک وہ ایک عام عورت تھیں مگر اب ان کے قدموں تلے بھی ایک جنت تھی۔ ہاں وہ ایک ماں تھی۔

ایک ماں کا نازک اور موم دل لئے اب وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھانے لگیں کہ کہیں ان کے پیروں تلے کسی کا معصوم دل کچل کر نہ رہ جائے۔ ماں بننے کی پہلی پہلی لذت سے گزر کر اب وہ اس دور سے گزر رہی تھیں جب کہ ان کی اولاد نے انہیں ماں کہہ کر پکار بھی لیا تھا۔ اب ان کے سینے میں بجائے گوشت پوست کے دل کے 'کانچ کا دل' تھا

جو ہلکی سی ٹھیس سے بھی چور چور ہو جاتا۔

رفو بیچاری بے بس! اب ناممکن تھا کہ ایک لمحے کے لئے بھی اپنے وجود سے، اپنے دل سے، اپنی آنکھوں سے اپنے راج دلارے کو اوجھل کرتیں۔ ان کی سسرال سے ایک بار کسی عزیز کی شادی کا بلاوا آیا۔ انکار کرتیں تو کیسے۔ سسرال کا معاملہ تھا۔ اور شنو کو ساتھ لے جائیں تو کیسے؟ وہ تو انہیں امی کہتا تھا۔ اگر کوئی الٹی ــــ سیدھی بات منہ سے نکال دیتا تو چار لوگوں میں کیا عزت رہ جاتی۔ اکیلا پن کیسے برداشت کرتیں۔ مگر ٹال نہ سکیں اور اکیلے ہی جانا پڑا۔ گئیں تھیں کہ رات ہونے سے پہلے ہی آ جاؤں گی۔ مگر وہاں وداعی میں اتنی دیر ہو گئی کہ تارے کھل گئے چاند جھیک اٹھا۔ ان کے اپنے دل میں بھی چاند کا عکس تھا۔ اور آنکھوں میں تارے۔ لاکھ ٹال مٹول کی مگر رکنا ہی پڑا۔

صبح اٹھتے ہی سب سے پہلے چلنے کی سوچی۔ رات بھر نیند ہی کہاں لگی تھی جو اٹھنے نہ اٹھنے کا سوال پیدا ہوتا۔ وہ تو گھڑیاں گنتی بیٹھی تھیں۔ رت جاگے نے ان کی موٹی موٹی آنکھوں میں گلابی ڈورے ڈال دیئے تھے۔ نیند کا نشہ الگ، جاگی جاگی آنکھوں کی گلابیاں رہیں سو الگ۔ ان کی سوئی سوئی جوانی جیسے آج گہری نیند سے ہڑبڑا کر جاگ اٹھی تھی۔ انگ انگ چٹخا پڑ رہا تھا۔ اور جس وقت وہ چارپائی سے اتریں ہیں اور زمین پہ پاؤں رکھا ہے، ایک لمحے کو خود انہیں یہ محسوس ہوا جیسے کھٹ سے زمین ان کے وزن سے چٹ چٹ ٹوٹ جائے گی۔

ملگجی ساری کے آنچل سے سر کو ڈھانپے قاتل آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھتیں، نوکر کو کھوجتی پھرتی تھیں کہ سامنے سے اشرف آتا دکھائی

دیا۔ اس نے پہلے تو یونہی لاپروائی سے دیکھا مگر ایک نگاہ جو پڑ گئی تھی جیسے
چپک کے ہی رہ گئی۔ یہ رفو تھا بھی حقیقتیں۔ ؟ رفو بیگم۔ ؟ رفو دلہن۔ ؟ رفو بیوہ۔
کتنے برس بیوگی کو ہو رہے تھے۔ ؟ پرانے خیالات رکھنے والے لوگوں سے
یہ کہاں ممکن تھا کہ اس قسم کی بات کا تصور بھی کر سکتے کہ بیوہ بہو کو پھر۔
سے بیاہ لائیں۔ کیا ہوا اشرف اگر مرنے والے کا چچا زاد بھائی تھا۔ ؟ تھا
تو ہر لحاظ سے قابل ! اتنے دن گزر گئے مگر اشرف نے بھی کہیں شادی
نہ کی تھی۔ یہ تو نہ تھا کہ دل میں بس رفو کی یاد کا دیپ جلائے ہی بیٹھا ہو۔
مگر سوچتا ضرور تھا۔ اگر یہ چراغ اسی کی تاریک کٹیا میں جل اٹھتا تو ؟

ایک قدم ۔ دوسرا قدم ۔ تیسرا قدم ۔ رفو عمر کے اس دور
میں تھی جب پھل پک کے پن کی حدوں سے گزر کر ٹپکنے لگتا ہے۔ گدرایا گدرایا
سا۔ رس بھرا۔ اور پہلے سے کہیں میٹھا۔ آنکھیں ! آن یہ آنکھیں یا آتش۔
ایسی ہی قاتل آنکھوں پر شعر کہتے ہوں گے۔ آنگن میں پلنگ ہی پلنگ
بچھے ہوئے تھے۔ سارے میں سناٹا پڑا ہوا تھا۔ کوئی کروٹ لے رہا تھا۔
کوئی کسمسا رہا تھا۔ اشرف کو یہ موقع اچھا ہاتھ آیا۔ لپک کر آگے
بڑھا اور بے چینی سے یوں بولا جیسے برسوں سے یہی ایک بات کہنے کو
بے چین تھا۔

" رفو۔ اکیلی کب تک زندگی بسر کرو گی ؟ یہ سفر تو بہت ہی لمبا ہے
اور تمہارے ساتھ تو کوئی دوسرا ساتھی بھی نہیں۔ "

رفو ایک لمحے کو سر سے پاؤں تک تھرتھرا اٹھی۔ بیوگی کے اتنے
سارے بھیانک سال۔ رونے کاٹتے، آنسو بہاتے، سسکتے ہوئے لمبے
اور اکتا دینے والے سال۔ اس کی آنکھوں کے آگے سے ایک لمحے میں

گزر گئے۔ سہارا۔؟

قبول کر لوں۔؟ ساتھی۔ تنہا زندگی کتنی بھی تو نہیں۔ یہ ایک لمحے کی بات تھی۔ ادھر رونے سسکتے اتنے سارے سال اور محرومیاں تھیں، جوان زندگی اور بے خواب راتوں کے جان لیوا ستم تھے اور ادھر ایک ننھا منا چاند تھا۔ ہنستا مسکراتا۔ امی! امی۔!

وہ چونکیں، پھر تڑپ کر رسالہ۔ دیکھ کر دل میں بولیں۔

"آپ غلط سمجھ رہے ہیں اشتیاق بھائی۔ مجھے زندگی سے اب کوئی گلہ نہیں۔ میں نے نورانی کے بچے کو گود لے لیا ہے۔"

ایک پھول نے رفو پھوپھی سارے بکھرے ہوئے باغ کو۔ لہلہاتے باغ کو، ہنستے مسکراتے، لہکتے مہکتے باغ کو ٹھکرا آئیں۔ اب ان کا دباغ شمو کے علاوہ اور کسی کے متعلق سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ عورت محبت کرنے پہ آتی ہے تو اپنی ہستی کو مٹا دیتی ہے۔ چاہے وہ اولاد ہو یا شوہر، اپنا ہو یا پرایا۔ یہ دل کی بات ہے۔ عورت نے دنیا بھر شکست ہمیشہ اس محبت اور ممتا بھرے دل کے ہاتھوں ہی کھائی ہے۔

دن ایسے ہی مزے مزے سے گزر رہے تھے۔ اپنی جوانی اور حسن کی ساری رعنائیاں رفو پھوپھی نے جیسے شمو کو دے ڈالیں۔ ابھی ابھی وہ گھٹنوں چلتا تھا۔؟ ابھی ابھی وہ پلنگ کی پٹی کا سہارا لے کر کھڑا ہونے لگا تھا۔؟ ابھی ابھی اس نے اپنے گلابی اور نرم ہونٹوں سے رفو پھوپھی کو امی کہہ کر پکارا تھا۔ ابھی ابھی وہ اپنی تین پہیوں والی سائیکل پر بیٹھ کر مرغیوں کے پیچھے دوڑتا پھرتا تھا۔؟ ابھی ابھی اس نے اپنا بستہ اٹھایا تھا اور قاعدہ اٹھا کر الف بے اور اے بی سی، ڈی پڑھنے

تھا ۔ ابھی ابھی اس نے گلابی چہرے اور ہنستی آنکھوں کے ساتھ آکر
اپنی امی کو سنایا تھا۔ "امی، میں چھٹی کلاس میں فرسٹ آیا ہوں۔"
ابھی ابھی اس نے میٹرک میں فرسٹ کلاس فرسٹ آکر استادوں کو
حیرت زدہ کر دیا تھا۔ اور ابھی ابھی وہ کالج سے سائیکل پر واپس
لوٹا تھا اور بڑے پیار سے اپنی امی سے کہہ رہا تھا۔
" امی، آپ نہیں جانتیں، آپ کی وجہ سے مجھے کتنی فکر لگی رہتی
ہے۔ بھلا کوئی بات ہی ہے کہ میں اتنا بڑا ہو کر یوں آپ سے کام لوں۔
کیا میں ایک چائے کی پیالی بھی اپنے ہاتھوں نہیں بنا سکتا۔
رفو پھوپھی مسکرا دیں" بیٹے تو نہیں جانتا تیرا کام کرکے، تیری
ہنستی صورت دیکھ کر میرا دل کتنا بڑھ جاتا ہے۔ آخر ایک ماں
اور اپنے بچے کے لئے کر ہی کیا سکتی ہے۔"
ایک دم شمو ذرا رکا اور آہستگی سے بولا۔ "امی۔ آپ ہی میری امی
ہیں نا۔؟"

رفو پھوپھی نے مسکرا کر اسے دیکھا اور بولیں۔ "کیوں اس میں کچھ
کوئی شک ہے۔ [illegible] شاہینہ وغیرہ کچھ سنا رہی ہونگی نا؟"
"نہیں امی،" شمو ہنس کر بولا، "مجھے تو سب ہی کہتے رہتے
ہیں۔ آجکل تو نہیں بہت زمانے سے کہ آپ میری امی نہیں پھوپھی ہیں۔"
"تو اس میں کیا فرق پڑتا ہے بچے؟ بہرحال میں تیری ماں تو ہوں
نا۔ کیا اتنی بات تیرے لئے کافی نہیں ہے۔"
شمو کا چہرہ اتر سا گیا۔ روہانسا ہو کر بولا۔ "امی ایسی بات نہ
کیجئے۔ دادی اماں بتاتی رہتی ہیں کہ آپ نے میرے لئے کیا کیا کیا ہے۔

رات کو رات نہیں سمجھا، دن کو دن نہ سمجھا۔ اپنی زندگی کا ہر ایک لمحہ، ہر سانس کو میرے لئے صرف کر دیا۔ اور تو اور آپ نے اپنی ساری جائداد بھی میرے نام کر دی۔ سچ کبھی کبھی میں خود کو بے حد گنہگار محسوس کرنے لگتا ہوں۔ میری سمجھ میں نہیں آتا۔"

رقو پھوپھی نے ایکدم لپک کر اپنا سوکھا ہوا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔

"خدا کے لئے چپ رہ جا شمو۔ ایسی باتیں کرتے تجھے ذرا سی شرم نہیں آتی۔ آخر میرے دل کا احساس کرتا نہیں کیسے لئے جیا۔ اور کس کے لئے مر دل گی؟" اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں۔

شمو رکا اور بے بسی سے بولا "کہنے جیسی بات تو نہیں ہے امی، مگر واقعی آپ اپنی زندگی شمو انتہائی سختی سے تھیں۔ میرے وجود نے آپ کی زندگی کو جہنم بنا دیا۔"

رقو پھوپھی تڑپ اٹھیں "شمو! ایسی بات منہ سے نہیں نکالتے"

اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکیں۔ ان کا منہ بنا رہا تھا اور زندگی کا ہر ہر بیتا لمحہ جیسے ٹھٹک گیا تھا، رک کر، چپکا، چپکا رک کر کہہ رہا تھا۔ "سچ کہتا، کیا کبھی نہیں بیتے دنوں پر افسوس نہیں ہوتا۔ کیا اپنی پھولوں بھری جوانی کو لوں برباد کر کے تمہیں کوئی کڑھن نہیں ہوتی۔"

اس رات شمو نے جب جب بھی پڑھتے پڑھتے سر اٹھا کر امی کے پلنگ کی طرف دیکھا، پلنگ کو ننھی ننھی سسکیوں سے لرزتا پایا۔

شمیم میاں ایم۔ بی بی۔ ایس کے تھرڈ ایئر میں تھے کہ ان کی نسبت چھڑی۔ اڑتے اڑتے یہ بات رقو پھوپھی کے کانوں تک بھی آئی۔ رقو پھوپھی

کے دل کو کیا کیا ارمان لگے ہوئے تھے۔ انہوں نے تو طے کر رکھا تھا کہ کسی اچھے شریف خاندان کی بے حد پڑھی لکھی اور سگھڑ لڑکی کو اپنی بہو بنائیں گی۔ زندگی نے جو جو ستم ان کے ساتھ کئے تھے۔ گن گن کر ان ظلم و ستم کا بدلہ لیں گی اور بہو بیٹے اور پوتے پوتیوں سے بھرے پرے آنگن میں بیٹھ کر ہنستی ہنستی ہی اس دنیا سے دوسری دنیا کو جائیں گی۔ مگر لکھا تھا کہ ان کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکے گی، کیونکہ شمو میاں نے جس جگہ دل لگایا تھا وہاں کسی کی مرضی نہ تھی۔ پتہ نہیں اپنے کون سے پروفیسر کی لڑکی پر ریجھ گئے تھے۔ خاندان کی بات تو جانے ہی دو۔ بٹیا رانی ابھی میٹرک بھی نہ کر سکی تھیں اور مزے سے سائیکل پہ دوپٹہ اڑاتی اسکول آیا جایا کرتی تھیں۔

اگر صرف رفو پھوپھی کا واسطہ ہوتا تو شمو میاں کو اتنی فکر نگا بھی نہ ہوتی، مگر میاں تو پورے خاندان سے ٹکر لینے کا سوال تھا اور پھر ابھی تعلیم بھی ادھوری تھی اور نوکری کا کوئی ٹھاٹھ ڈھان ہی نہ تھا۔ یوں پیسہ تو اتنا تھا کہ چاہتے تو چار لوگوں کو کھلاتے تب بھی عمر بھر گھر بیٹھے کھا سکتے تھے۔ مگر گھر میں بیٹھا مرد بھی کہیں بھلا لگتا ہے۔

رفو پھوپھی لاکھ بے خبر تھیں۔ مگر چہرے کی آڑی ترچھی رنگت اور بہکی بہکی چال ڈھال سے بھانپ گئیں کہ شمو میاں نے ضرور کہیں جی اٹکا لیا ہے۔ ادھر ادھر سے پوچھ تاچھ کی۔ ان کا خیال غلط نہ تھا۔ اماں بیگم کی سرکار میں جب پیشی ہوئی تو وہ کفن پھاڑ کر چلا اٹھیں۔ اور الٹے جب رفو پھوپھی نے ہی بیٹے کی پشت پناہی کی تو وہ چلا گئیں۔

"حرام زادے کا جب جب بھی آگئے ہیں اس کے نام کر دیا ہے اور اوپر

سے بہو بھی وہ ، بیچاری نذر ان کی لا رہی ہے۔ ارے دیکھنا، مجھے دانے دانے کو ترسا دیں گے۔ توبہ ہے! اس کی عقل کو کیا ہو گیا ہے۔ بیچ اونچ سمجھتی ہی نہیں ہے۔ عمر بھی عمر ایسی ہی نا سمجھی میں گزار دی۔"

مگر نو سیپو بھی پہنا سے نہ بیٹھ سکیں۔ عشق تو شمو میاں نے کیا تھا۔ چہرے پر ان کے سے اثرات ان کی صورت سے ہویدا تھے۔ رنگ پیلا۔ الجھے سنجے بال، بولتا چہرہ کوئی دیکھتا تو یہی کہتا اب شب ہو رہی تھا۔ اس صدمہ میں ہی سال بھر نکل گیا، مگر شمو میاں کا جی اپنی جگہ سے نہ ہٹا۔ وہی ایک لگن تھی، وہی ایک رٹ۔ تھک ہار کے بڑے بوڑھے بھی چپ ہو رہے۔ تیز ہوا کے جھکڑ کے آگے گھاس پھوس ٹکتا بھی کب ہے ۔ ؟

ر تو پھوپھی نے اپنے جہیز اور چڑھاوے کے سارے جوڑے اور پورا زیور بیوی اٹھا کر رکھ دیا تھا۔ اب وہ بڑے جتن سے تمام چیزوں کا جائزہ لے رہی تھیں۔ گوٹے کناری پر نیا کپڑا لگوا رہی تھیں اور زیور کے فیشن بدل چکے تھے تو ڈیزائن بدلوانے پر مصر تھیں۔ رہی سہی ساری پونجی انہوں نے شادی کے ہنگاموں پر لگا دی۔ وہ بچے بچے کی ماں نہیں تھیں تو کیا ہوا۔ ! ان کے سینے میں ماں کا دل تو دھڑکتا تھا۔ ! یہ وہی تو تھیں نا جنہوں نے راتوں رات بھر جاگ کر، روئی کی بتی بنا بنا کر اپنے شمو کو دودھ پلایا تھا، اس کی دیکھ ریکھ کی تھی۔ نوکروں کی فوج ہونے کے باوجود ارمانوں کے ساتھ خود ہی تو موت کے بھرے پوتڑے، رالیاں دھولی تھیں۔ یہ وہی تو تھیں نا جنہوں نے شمو کی ہلکی سی بیماری پر اپنے آپ پر رات بھر کی نیند حرام کر لی تھی۔ یہ

وہی تو تھیں نا جنہوں نے اپنی زندگی کی ہر ہر خوشی، ہر ہر سکھ بھر بھر پیار بھرا لمحہ شمو پہ قربان کر دیا تھا۔ کیا ایک ماں اس وقت ماں ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے سینے سے ایک بچے کو دودھ پلا دے۔؟ کیا محض اپنے پیٹوں سے جنم دینے والی ہی ماں کہلا سکتی ہے۔؟ زندگی کی ساری خوشیاں نثار کر دینے والی دکھی روح کو پھر اور کیا نام دیا جا سکتا ہے۔؟ کیا سات آسمانوں کے اوپر رہنے والا اتنا نا انصاف تھا کہ وہ انہیں ماں پن کی لذت سے محروم کر دیتا۔؟

شادی کے دن رفو پھوپھی کی خوشی دیکھی نہ جاتی تھی۔ اپنے ہاتھوں انہوں نے ہر ہر کام نپٹایا تھا۔ مہمانوں، رشتہ داروں دوستوں، نوکروں سے گھر بھرا پڑا تھا مگر وہ ہر ہر چھوٹا بڑا کام اپنے ہاتھ سے، اپنی خوشی سے کرنا چاہتی تھیں۔ کیا ہوا جو شمو نے ان کی پسند سے شادی نہ کی، زندگی کسے گذارنی تھی۔ شمو کو یا انہیں۔؟ یہ تو اچھا ہی تھا نا کہ میاں بی بی نے ایک دوسرے کو دیکھ پہچان کر ہاتھ بڑھایا تھا، پھر وہ اپنے جگر گوشے کی خوشی پر کیسے نہ خوش ہوتیں۔

شادی پورے زور شور سے ہوئی۔ برات بینڈ باجے کے ساتھ دلہن دولہا کو لے کر گھر آئی۔ راستہ بھر آتش بازیاں چھوٹتی رہیں۔ اور رفو پھوپھی خود اپنے ہاتھوں پیسے لٹاتی رہیں۔ آج کوئی رفو پھوپھی کی خوشی دیکھتا۔ بڑھاپے کے باوجود ان کے چہرے پر جوانی کا رنگ چھایا ہوا تھا۔ وہ رہ رہ کر مسکراتیں۔ ان کے پژمردہ اور پیلے چہرے پر آج گلابیاں امڈ رہی تھیں۔

دلہن کا کمرہ بھی خود انہوں نے اپنے ہاتھوں سے سجایا تھا۔

پھولوں کی بہتات سے کمرے پر کسی خطۂ باغ کا گمان ہو رہا تھا۔ تفیش کے تاروں اور چاندی کے تپلے نیلے پھولوں سے مسہری جگ مگ جگ مگ کر رہی تھی۔ چھپر کھٹ پر دلہن سر نیہوڑائے بیٹھی تھی اور رفو پھوپھی آتے جاتے پر مسرت انداز سے اس کا جائزہ لے رہی تھیں کہ کب کب چاند چڑھے اور یہ کلی پھول بن کر مہکے۔

کھانے والے اور ریت رسموں سے فارغ ہونے پر جب دولہا کو اوپر لایا گیا تو اچانک رفو پھوپھی نے محسوس کیا کہ سہرے کی لڑیوں میں سے جھانکتا ہوا شمو کا چہرہ کچھ اداس اداس سا نظر آ رہا ہے۔ آج کا دن۔ مسرتوں، ارمانوں، آرزوؤں کا دن اور شمو کے چہرے پر پژمردگی! وہ بے کل بے کل سی، بولائی بولائی سی اِدھر اُدھر پھرنے لگیں کہ بھیڑ چھٹے اور موقع ملے تو وہ شمو سے کچھ بات کریں۔ مگر دلہن دولہا کے آس پاس وہ جھوڑ جھپا کا تھا کہ کم ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔

رات کے بارہ بجتے بجتے سب ماؤں نے اپنے اپنے بچوں کو سلایا۔ مہمان بیبیاں موقع پا پا کر اپنے جھروکوں میں گھسیں۔ باجے والوں نے شطرنجیوں اور ٹاٹوں میں لپیٹ لپیٹ کر باجے رکھ دیئے اور چھت خالی ہو گئی۔

شمو اکیلا کرسی پر بیٹھا رہ گیا تھا۔ دلہن اندر کمرے میں تھی۔ رفو پھوپھی بے تابی سے لپکی ہوئی آئیں اور چھوٹتے ہی بولیں۔

"میرے لال۔ کیا بات ہے۔؟ چہرہ یوں اترا اترا سا کیوں ہے۔؟" شمیم صاف ٹال گیا اور چہرہ نیچا کر کے بولا۔ "کوئی بات نہیں امی۔ آج تو میں حد سے سوا خوش ہوں۔ آپ جی نہ کرا کیجئے۔"

مگر رفو پھوپھی کا جی نہ مانا۔ وہ گلے کا ہار ہو گئیں اور قسمیں دے دے کر اس کی اداسی کا سبب پوچھنے لگیں۔ شمیم نے جیسے حلق میں پھنسا ہوا گولہ نیچے اتارا اور اٹک اٹک کر بولا۔

"نہیں میں بس یہی سوچ رہا تھا کہ اگر آج میری اماں ہوتیں تو کس قدر خوش ہوتیں۔"

"میری اماں۔!"

"میری اماں۔!"

"میری اماں۔!"

رفو پھوپھی کا سر گھومنے لگا۔ زمین، آسمان سب گھومنے لگے۔ تاروں بھرا آسمان چکر کھانے لگا پھولوں بھری زمین چکر کھانے لگی۔ انہوں نے بڑی مشکل سے خود کو سنبھالنا چاہا، مگر ہر لمحہ وہ بے سدھ ہوتی جا رہی تھیں۔ جیٹ سے ان کو اپنے سینے میں کوئی چیز ٹوٹتی محسوس ہوئی۔ انہوں نے دونوں ہاتھوں سے دل کو پکڑنا چاہا، مگر اسی لمحے ان کے ہاتھوں کا سارا زور ختم ہو گیا اور وہ تیورا کر زمین پر گر پڑیں۔

☆

ختم شد